بھارت میں انسانی حقوق کا تحفظ

کیوں اور کیسے؟

بچوں، عورتوں، بزرگوں، پس ماندہ برادریوں اور محروم طبقات
کے حقوق کے باب میں ایک تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ اور اس
کے تحفظ کا جامع روڈ میپ

ڈاکٹر سید ابوذر کمال الدین

بلیسنگ ہاؤس پبلی کیشنز

ISBN - 81-88869-49-X

نام کتاب	:	عصرِ حاضر میں انسانی حقوق کا مسئلہ اسلام اور ہندوستان کا مسلم سماج
مصنف	:	ڈاکٹر سید ابوذر کمال الدین
سن اشاعت	:	2021
قیمت	:	500/- روپے
کمپوزنگ	:	خالد فیصل، 9899383815
مطبع	:	چمن آفسیٹ پریس، دہلی

ملنے کا پتہ: **گلوبل میڈیا پبلی کیشنز**، نئی دہلی، 9818327757
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، 1652 2698 011
کتاب والا، پہاڑی بھوجلہ، دہلی-6

ناشر

بلیسنگ ہاؤس پبلی کیشنز

Blessing House Publications

Blessing Kamal Lane, Azad Road, Chandwada
Muzaffarpur, Bihar - 842001
Tel.: 91 - 9934700848
E-mail: dr.abuzarkamaluddin@gmail.com
Website: www.dr.abuzarkamaluddin.in

انتساب

اپنی اہلیہ محترمہ راشدہ ناہید

ایم.اے(.انگلش)، بی.ایڈ (بی.ایچ.یو)

کے نام

جن کی پرسکون اور پرمسرت رفاقت نے مجھے علمی کاموں کا موقع عنایت کیا اور جن کی خدمت، محبت اور انسانی قدروں کی پاسداری نے انسانی حقوق کے اہتمام کی چلتی پھرتی مثال پیش کی۔

بقول شخصے:

''ایک اونس عمل ایک ٹن باتوں پر بھاری ہوتا ہے۔''

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہو!

انسانی حقوق جس کو عرفِ عام میں بنیادی اور فطری حقوق کہا جاتا ہے وہ کسی انسان کا پیدائشی اور ازلی حق ہے جس کے استفہام، تحفظ اور ایماندارانہ نفاذ سے ہی انسانی نسل کا تحفظ، اس کی صحت مند ارتقاء اور تہذیب کی آبیاری ہوتی ہے۔ جیسے ہی ماں کے پیٹ میں حمل کا استقرار ہوتا ہے اس کے حقوق کا باب کھل جاتا ہے اس کا پہلا بنیادی حق ہے کہ اس کی جان کی حفاظت کی جائے اور اسے صحت و سلامتی کے ساتھ دنیا میں آنے کی اجازت دی جائے، جس کے لیے محفوظ پیدائش ضروری ہے۔ جب وہ دنیا میں آجائے تو اسے محفوظ اور صحت مند ماحول فراہم کیا جائے تاکہ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اس کا زندہ رہنا اور پروان چڑھنا ممکن ہوسکے۔ اس کو جملہ موذی اور جان لیوا امراض سے بچانے کے لیے ٹیکے کا اہتمام کیا جائے اور موڈرن سائنس نے صحت کے میدان میں جو ترقیاں کی ہیں اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے۔ والدین اگر اس کی کفالت کے اہل نہ ہوں تو پھر سماج اور ریاست پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کا مناسب انتظام کرے۔ ہر انسانی جان قیمتی ہے اور اس کا تحفظ فرض ہے۔

بچہ کی سلامتی کے لیے زچہ کی سلامتی ضروری ہے۔ لہٰذا بچے کا حق ماں کے حق سے اور ماں کا حق بچے کے حق سے پوری طرح مربوط ہوتا ہے لہٰذا ان دونوں کو لازم و

ملزوم مان کر دیکھنا چاہیے۔

بنیادی حقوق میں سب سے پہلا حق مناسب غذا اور دوا کے علاوہ صاف ہوا، صاف پانی اور صاف ستھرا اور آرام دہ رہائش کا حق ہے۔ بچہ جب پالنے سے نکل کر پاؤں کے بل چلنا اور پھر بولنا سیکھنے لگتا ہے تب اس کی تعلیم اور تربیت کا حق بنیادی حقوق کے باب میں جڑ جاتا ہے۔

بچے کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ عمر کے ساتھ اس کی غذائی ضرورتوں کا خاص خیال رکھا جائے تا کہ اس کا وزن صحیح ہو اس کا قد ٹھیک ڈھنگ سے بڑھ سکے اور اس کی ذہنی اور جسمانی ارتقاء صحیح ڈھنگ سے ہو سکے۔

تعلیم کسی بچے کا بنیادی حق ہے۔ تعلیم کے بغیر اس کی شخصیت نہ تو صحت مند خطوط پر پروان چڑھ سکتی ہے اور نہ اس کو شعور ذات حاصل ہوسکتا ہے اور اس کے اندر قدرت نے جو صلاحیتیں اور قوت دے رکھی ہے اس کا اظہار ہوسکتا ہے۔ شعورِ ذات عزت نفس کی لازمی شرط ہے۔

جب ایک بچہ طفولیت اور لڑکپن سے باہر نکل کر بلوغ کی منزل میں داخل ہوتا ہے تو اس کی ضرورتوں میں دو اور بنیادی ضرورتوں کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ ایک ہے معاش کا حق اور دوسرا ہے جنس کی طلب۔ یہاں سے ایک نئے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے اور حقوق کے باب میں دو اور حقوق ایک آزادانہ پروقار اور خود کفیل معاش کا حق جو چاہے نوکری سے حاصل ہو، یا تجارت سے یا زراعت یا مختلف خدمات کے ذریعہ۔ اسی طرح پاکیزہ جنسی رشتوں کے لیے شادی کے ادارے کی تشکیل سماج کی لازمی ضرورت بن جاتی ہے جہاں مرد و عورت دو آزاد خود مختار وجود ایک پاکیزہ معاہدے کے ذریعے جائز جنسی رشتہ استوار کرتے ہیں اور نسل انسانی کی افزائش اور تہذیب انسانی کی نشوونما میں اپنا مثبت کردار ادا کرنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔

عورت اور مرد کا رشتہ اور اس کے حقوق انسانی تاریخ میں ہمیشہ سے بحث ونزاع

کا موضوع رہے ہیں۔ اتنی لمبی بحث وتمحیص کے باوجود ابھی تک دنیا اس نقطۂ اعتدال سے نا آشنا ہے جس نے نہ صرف ماضی میں بلکہ عہدِ حاضر میں بہت سے فتنوں کو جنم دیا ہے۔ مذاہب عالم کے ساتھ ساتھ ماہر عمرانیات، ماہر سماجیات، فلاسفہ، ماہر نفسیات، ماہر قانون اور انسانی تاریخ وتہذیب کا مطالعہ کرنے والے حکماء ابھی تک حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ یہ بحث جاری ہے۔ پدرشاہی، مدرشاہی سے نکل کر لوگ انفرادی آزادی کی بات کرنے لگے ہیں اور میرا جسم میرا حق کا نعرہ لگا رہے ہیں جس نے تمام مسلمہ اخلاقی حدود کو توڑ کر پوری انسانی دنیا کو ایک نئے تہذیبی بحران میں مبتلا کر دیا ہے۔

بہرحال اس افراط وتفریط نے خاندانی نظام کے پورے تانے بانے کو بکھیر کر رکھ دیا ہے، جس میں بن باپ کے بچے، غیر شادی شدہ مائیں، شادی سے پہلے اور اس کے بعد آزادانہ جنسی تعلق اور پھر نہ جانے اور کیا کیا۔

اس کا اثر بچوں، عورتوں اور مردوں پر تو پڑتا ہی ہے، سماج کی پاکیزگی متاثر ہوتی ہے۔ عریانی، فحاشی، جنسی بے راہ روی اور اباحیت وقت کا کلچر بن گئی ہے جس نے انسانی حقوق کے باب میں بے شمار مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ تنہائی اور لاوارث پن انسان کا مقدر بن گئی ہیں جس نے لوگوں کو دائمی مایوسی میں دھکیل دیا ہے جس کی وجہ سے جرائم اور خودکشی میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے۔ پروقار زندگی ہی نہیں پروقار موت بھی انسان کا بنیادی حق ہے جہاں عزت واحترام کے ساتھ اس کی تجہیز وتکفین ہو سکے۔ اس ماحول اور معاشرے میں سب سے برا حال بزرگوں کا ہے بالخصوص ان کا جو بڑھاپے کی بہت سی نا قابلِ علاج بیماریوں کے شکار ہیں اور جن کی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ اس کا خرچ برداشت کر سکیں ُخاندان کے ٹوٹنے اور معاشرتی کفالت کے نظام کے بکھرنے سے حالات پیچیدہ اور بد سے بدتر ہو گئے ہیں۔

مغرب میں حکومتوں نے اور وہاں کے غیر سرکاری اداروں نے کچھ کامیاب پہل ضرور کی ہے مگر وہ بزرگوں کو نفسیاتی اور جذباتی تحفظ دینے میں کامیاب نہیں ہیں۔ یہ ایک

بڑا میدان ہے جس پر ابھی بھرپور توجہ نہیں دی گئی ہے۔ یہ سب تو وہ نارمل تفصیلات ہیں جو توجہ طلب ہیں۔

اسے فطری عمل کہیے یا غیر فطری عمل یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی سماج Haves اور Haves not میں بٹا ہوا ہے۔ لہٰذا جو غریب ہیں، پس ماندہ ہیں، اقلیت میں ہیں وہ ہمیشہ سے Disadvantageous Position میں رہتے ہیں اور ظلم واستحصال ان کا مقدر ہے۔ یہ بات کل جتنی سچ اور صحیح تھی آج بھی اتنی ہی سچ اور صحیح ہے۔

اکثریت اور خاص طور سے جارح اکثریت جو کسی اقلیت سے تاریخی اور تمدنی وجوہات سے پرخاش رکھتی ہے وہ ایک دستوری جمہوری اور سیکولر ملک میں بھی ہر وقت اقلیتوں کے لیے عرصہ حیات تنگ کرنے پر آمادہ رہتی ہے جس کا صاف مطلب ہے اس کے انسانی حقوق کی پامالی۔ معاملہ اس وقت پیچیدہ اور سنگین ہوجاتا ہے جب پورے جمہوری تام جھام کے ساتھ محض ایوان میں اپنی عددی برتری کے بل پر وہ ایسا اقدام کرتی ہے اور اقلیت حیرت زدہ ہوکر محض دیکھتی رہ جاتی ہے۔ پریس اور عدالت جو کسی مظلوم کی آخری جائے پناہ ہوتی ہے وہ بھی ہوا کا رخ دیکھ کر اپنا چہرہ پھیر لیتی ہے اور اندر پرست کی بھری سبھا میں دروپدی کا چیر ہرن ہوتا رہتا ہے اور تمام بااثر اور عزت دار لوگ اپنی مریادا اور مردانگی اور شرافت نفس اور انسانی حقوق کے احساس کو بھول کر یا تو خاموش رہتے ہیں یا پھر تالیاں بجانے والوں میں شامل ہوجاتے ہیں۔

جہاں تک حقوق کی پامالی کا سوال ہے تو صرف ایسا نہیں ہے کہ اکثریت او رحکومت ہی انسانی حقوق پر شب خوف مارتی ہے بلکہ خود اقلیتیں اپنے اندر انصاف اور شرافت کا مظاہرہ کرنے میں ناکام ہوتی ہیں اس طرح خود اپنی کرتوتوں سے اپنا موقف کمزور کرلیتی ہیں۔

اسلام نے انسانی حقوق کی جس طرح تعلیم دی ہے وہ قصہ پارینہ ہو چکا ہے۔ دنیا کے مسلمان ملک اور معاشرے میں انسانی حقوق کی پامالی جس بڑے پیمانے پر ہورہی

ہے وہ نہ صرف افسوسناک ہے بلکہ انتہائی شرمناک ہے جس نے پوری دنیا میں اسلام کو بدنام اور مسلمانوں کو ذلیل کررکھا ہے۔

ہندوستان کا مسلم سماج بھی پوری طرح پراگندہ سماج ہے جہاں خود اپنے گھر اور معاشرے میں جس طرح انسانی حقوق کی پامالی ہورہی ہے اس کے بعد ان کے پاس کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے کہ وہ دوسروں پر انگلی اٹھائیں۔ وقت آگیا ہے کہ ہم اس جانب توجہ دیں اور اپنے رویہ میں ایمانداری پیدا کرکے انسانی حقوق کے باب میں ضروری اصلاحی قدم اٹھانے کی کوشش کریں۔ ورنہ باہر کے دباؤ اور اندر کی کمزوری سے پورے معاشرے کے بکھر جانے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا انسانی حقوق کا مسئلہ محض ایک علمی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک عملی مسئلہ ہے جس سے ہمارا مستقبل اور اس کا استحکام وابستہ ہے۔

میں نے اس کتاب میں انسانی حقوق کے مسئلہ کو ایک بڑے کینوس میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے اور صرف مسائل کی نوعیت اور سنگینی کی ہی نشاندہی نہیں کی ہے بلکہ اس کا روڈ میپ بھی پیش کیا ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ایک آدمی اس پوری بحث کا اگر سنجیدگی سے مطالعہ کرے تو نہ صرف انسانی حقوق کے باب میں اس کی سمجھ بہتر ہوگی بلکہ اس کے تحفظ اور فروغ کی جانب بھی وہ عملی قدم اٹھانے پر آمادہ ہوگا۔ انسانی حقوق کے تحفظ کے باب میں پہلی چیز اس کی سمجھ ہے اور پھر اس کے سلسلے میں حساس ہونے کی ضرورت ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں یہ پہلو خاص طور سے سامنے رکھا گیا ہے۔

ایک عام تاثر یہ ہے کہ انسانی حقوق کا عدم احترام اور اس کی پامالی اگلے وقتوں کی باتیں ہیں جب ہم تاریک صدیوں میں رہتے تھے اور ان تصورات سے ناواقف تھے۔ اب جبکہ ہم ایک روشن اور تابناک عہد (Enlightend Age) میں رہ رہے ہیں جہاں نہ صرف سائنسی ایجادات اور تمدنی اور سماجی ترقیات نے تمام سابقہ تصورات کو ڈھاکر ایک نئی دنیا تعمیر کی ہے جس میں فرد کی آزادی اور اس کے احترام کو بنیادی حق تسلیم کرلیا ہے اور مساوات اور بھائی چارہ کا نعرہ اس زور سے لگایا جارہاہے جہاں فرق و امتیاز کے تمام بت

منہ کے بل گر پڑے ہیں۔ نظری طور پر انسانی حقوق کی پامالی ممکن نہیں ہے۔ نہ صرف دنیا کے تمام تر دستور وقوانین میں انسانی حقوق کی گارنٹی دی گئی ہے بلکہ اس کے تحفظ اور نفاذ کے لیے بہت سے ادارے قائم کیے گئے ہیں۔ سول ایڈمنسٹریشن، پولیس، عدالت اور پریس کو اس کا محافظ اور پہرہ دار بنا کر کھڑا کردیا گیا ہے۔ دنیا میں بہت سے عالمی ادارے اس مقصد سے قائم کیے گئے ہیں اور مختلف ملکوں کے باہمی اور عالمی معاہدات میں یہ ایک اہم شق ہے۔

مگر یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ دوپہر کی دھوپ میں بھی کمزور ملکوں، پس ماندہ قوموں، مظلوم گروہوں، غریب آبادیوں، اقلیتوں، عورتوں، بچوں اور کمزور طبقات کے انسانی حقوق پر کالی اندھیری رات کا سایہ پوری طرح قائم ہے۔ آج انسانی حقوق کی پامالی جس بڑے پیمانے پر ہورہی ہے شاید تاریخ میں اتنا کبھی نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا عصرِ حاضر میں انسانی حقوق کا مسئلہ جتنا پیچیدہ اور سنگین ہے، دنیا میں کبھی نہیں تھا۔

انسانی حقوق کے باب میں دو چیزیں اچھی طرح سمجھ لینے کی ہیں۔ اول انسانی حقوق کا مسئلہ استقرارِ حمل سے لے کر وضع حمل تک اور پھر اس کے بعد مہد سے لحد تک محیط ہے اور یہ فرد، گروہ، طبقات اور اقوام سب کو اپنے دائرے میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یعنی یہ Micro Concept اور Macro Concept دونوں ہے اور پورا کرۂ ارض اور پورا ماحول اس تصور کے ارد گرد اپنا خیمہ گاڑ کر کھڑا ہے۔ اس لیے حیات انسانی کا کوئی پہلو اس کی جامعیت اور ہمہ گیری سے باہر نہیں ہے۔

دوم انسانی حقوق کی پاسداری براہِ راست انسانی شرف اور تصور مساوات سے جڑا ہے۔ اس بات کا جتنا واضح اور گہرا شعور ہوگا اور ایک انسان علم وشعور کے جس مقام پر فائز ہوگا اور اس کی تہذیبی حس جتنی بلند و بالیدہ ہوگی اور اس کا احساس وشعور جتنا بالیدہ اور وسیع ہوگا وہ انسان حقوق کے باب میں اتنا ہی حساس اور بیدار ہوگا اور اس کی پامالی کے معاملے میں چوکنا اور مستعد ہوگا۔ اس طرح انسانی حقوق کا مسئلہ تہذیب واحساس کے اس پیمانے کا

مظہر ہے جس سے پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ کوئی قوم کتنا مہذب اور انسانیت نواز ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ شعور وتہذیب سے وابستہ ہے جس کی مسلسل تفہیم اور تشہیر کرنے کی ضرورت ہے تا کہ ہر فرد و قوم اس کی اہمیت سے واقف ہوجائے اور اس کی پاسداری کے لیے مستعد اور کمر بستہ رہے اور جب بھی اور جہاں بھی اس کی پامالی ہورہی ہو یا اس کا امکان ہوتو فوراً انفرادی اور اجتماعی پہل کے ذریعے اس کو روکنے کی کوشش کرتے تا کہ عصرِ حاضر کے انسان اور جدید تہذیب کو بحران و تباہی سے بچایا جاسکے۔

اس کتاب میں ہمارا مین فوکس انسانی حقوق کے باب میں تاریخی، نظری اور اصولی بحث کے علاوہ بھارت میں انسانی حقوق کی صورتحال ہے۔ ہم نے محض نظری بحث اور تنقید وتبصرہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ بھارت کے مسلمانوں کو خود احتسابی کی دعوت دی ہے اور بھارت کے مسلمان معاشرے میں جس انداز سے اور جن جن دائروں میں انسانی حقوق کی حق تلفی ہورہی ہے اور اس کی وجہ سے بھارت کا مسلمان سماج اندر سے کھوکھلا ہوتا جارہا ہے اور اپنا اخلاقی وزن کھوتا جارہا ہے اس کے اصلاح کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ غالبًا اپنی نوعیت کا پہلا مطالعہ ہے جس سے امید کی جاتی ہے کہ نہ صرف انسانی حقوق کے باب میں لوگوں کی سمجھ بڑھے گی بلکہ وہ ان مسائل کے حل کے لیے آمادہ پیکار ہوں گے جو اس کتاب کی تالیف کا بنیادی مقصد ہے۔

جیسا میں نے اوپر ذکر کیا ہے انسانی حقوق کی پامالی یہ اگلے دنوں کی باتیں نہیں ہیں بلکہ عہدِ حاضر میں بھی یہ مسئلہ کافی سنگین اور پیچیدہ ہے جس نے پوری انسانیت کو بحرانی حالات سے دوچار کررکھا ہے۔

دنیا کی دوتہائی آبادی بالخصوص ایفروایشیائی ممالک، لیٹن امریکن اور کئی یوروپی ممالک بدترین آمریت کی زد میں ہے، جہاں انسانی حقوق کی پامالی ایک عام سی بات ہے۔ ان ملکوں میں صرف وہاں کی اقلیتیں ہی نہیں بلکہ وہاں کی اکثریت بھی بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف تک جب دنیا میں سامراجیت اور فاشیت کا

خاتمہ ہوگیا تو انسانیت نے چین کی سانس لی کہ ظلم و جور کا دور ختم ہوگیا اور آزادی وجمہوریت کا نیا دور شروع ہوگیا۔ مگر جلد ہی یہ بھرم ٹوٹ گیا کیونکہ بیشتر نو آزادممالک نے جمہوریت اور جمہوری قدروں کو خیر باد کہہ کر آمریت کا جامہ زیب تن کرلیا اور وہاں کے کمزور پس ماندہ لوگ بالخصوص اقلیتیں اسی طرح ظلم و جور کی چکی میں پس رہے ہیں جیسے پہلے تھے اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہے۔ کہنے کے لیے آزاد پریس ہے، آزاد عدلیہ ہے اور مضبوط سول سوسائٹی بھی ہے اور بقول شخصے عالمی رائے عامہ بھی ہے مگر یہ سب دور کے ڈھول ہیں جن کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔

بھارت 15اگست 1947 کو آزاد ہوا۔ کم وبیش تین سال کی محنت کے بعد بھارت کا دستور مرتب ہوا جو اپنے حجم اور دیگر خصوصیات کے اعتبار سے دنیا کا بہترین دستور شمار کیا جاتا ہے۔ اس دستور میں دنیا بھر کے دستوروں کی تمام اچھی باتوں کو جمع کیا گیا ہے اور تمام عالمی صالح روایات کو جگہ دی گئی ہے۔ مگر دستور کا صرف اچھا ہونا کافی نہیں ہے اگر اس کو نافذ کرنے والے ہاتھ اچھے نہ ہوں۔ تو دستور پرشکوہ الفاظ کا مقبرہ بن جاتا ہے۔ اس دستور کی موجودگی میں اندرا گاندھی نے ایمرجنسی نافذ کردی اور تمام بنیادی حقوق سلب کرلیے اور اسی دستور کی موجودگی میں موجودہ مودی حکومت لوگوں کو ان کے بنیادی حق اور آزادی سے محروم کررہی ہے اور یہاں کی اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے عرصہ حیات تنگ کررہی ہے۔ میڈیا حکومت کی ڈھنڈورچی ہے، عدلیہ اس کی ہم نوا اور سول سوسائٹی اس کی حمایتی۔ ملک بدترین فسطائیت کی طرف گامزن ہے۔ اکثریت کی تانا شاہی نے انسانی حقوق کے مسئلہ کو بے حد پیچیدہ بنادیا ہے۔ نجی کرن، لبرلائزیشن اور گلوبلائزیشن کے اس دور میں انسانی حقوق کی پامالی ترقی کا لازمہ بن گیا ہے۔

اقلیتیں، پس ماندہ طبقات، دلت اور آدی باسی اس وقت استحصال کی ایسی چکی میں پس رہے ہیں جہاں سے نکلنے کی ساری راہیں مسدود نظر آتی ہیں۔ جب ایک جمہوری ملک میں پورے تام جھام کے ساتھ انسانی حقوق اس طرح پامال کیے جاسکتے ہیں تو روس

اور چین جہاں بدترین ڈکٹیٹرشپ ہے وہاں کے لوگوں کے انسانی حقوق کی پامالی کا تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے پڑوس میں میںمار اور سری لنکا ہے، تھوڑی دور پر نارتھ کوریا اور ویت نام ہے جہاں کے ظلم و جور کے قصے ہم اکثر سنتے رہتے ہیں۔

سب سے افسوسناک صورتحال مسلم ممالک کی ہے۔ اس وقت دنیا میں کم وبیش 52 مسلم ممالک ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اسلام کے تصور آدمیت کے معیار پر پورا اترتا ہے، مسلم ممالک میں وہاں کے عوام کی حالت بھیر بکریوں سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ حکمراں نہ صرف مطلق العنان ہیں بلکہ تمام تر انسانی اور اخلاقی قدروں سے عاری ہیں۔ لہٰذا ان ملکوں میں ظلم و جور عام ہے۔ حکمرانوں کی ان کرتوتوں کی وجہ سے ساری دنیا میں اسلام اور مسلمان کی جگہ ہنسائی ہورہی ہے۔ ایک طرف اسلام کا تصور مساوات، حریت اور حرمت آدمیت ہے اور دوسری طرف ان ملکوں میں پایا جانے والا تفرق و امتیاز جس کی وجہ سے عالمی برادری میں جہاں سب سے زیادہ انسانی حقوق کی نفی کی جاتی ہے اور بے دریغ اس کی پامالی ہوتی ہے وہ مسلمان ممالک ہیں۔ وہ نسلاً اور قوم کے اعتبار سے مسلمان ضرور ہیں لیکن اسلامی اقدار سے کوسوں دور ہیں، اس لیے ان ملکوں کو مسلم ممالک تو کہا جاسکتا ہے لیکن اسلامی ممالک کہنا اصلاً اور اصولاً غلط ہوگا۔

ان حالات میں انسانی حقوق کی تفہیم و تشریح کتنا ضروری اور اہم ہے اس کو سمجھا جاسکتا ہے۔ میں نے اس کتاب میں صرف انسانی حقوق کے نظری پہلوؤں سے بحث نہیں کی ہے بلکہ جو ہمارے زمینی مسائل ہیں ان کو سامنے رکھ کر خود احتسابی کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ جہاں اس میں اسلام کے تصور انسانی حقوق کی تفصیل سے وضاحت کی گئی ہے، وہیں بھارت کے مسلم سماج میں جو انسانی حقوق کی حق تلفی ہورہی ہے اس کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس کے اصلاح کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک دستوری اور سماجی دستاویز ہے جس کا مقصد انسانی حقوق کی تفہیم و تشریح کے ساتھ ساتھ اس کے پامالی کو روکنے کے لیے ایک واضح روڈ میپ کی نشاندہی بھی ہے۔ میں

سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف لوگوں میں انسانی حقوق کی سمجھ پیدا ہوگی بلکہ اس کے دفاع، تحفظ اور بحالی کا جذبہ بھی پیدا ہوگا جو اس کتاب کی تالیف کا بنیادی مقصد ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول میں انسانی حقوق کی تعریف و تاریخ، دستورِ ہند میں انسانی حقوق اور اسلام میں بنیادی حقوق، مسلمان ملکوں میں انسانی حقوق کا مسئلہ اور ہندوستان میں موجودہ صورتحال پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دوم میں ہندوستان کے موجودہ مسلم سماج میں انسانی حقوق کی صورتحال، مسلم سماج میں بچوں کے حقوق، مسلمان معاشرے میں پس ماندہ برادریوں کے حقوق، ہندوستان کے مسلمان معاشرے میں عورتوں کے حقوق پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور تمام متنازعہ امور پر وضاحت سے گفتگو کی گئی ہے۔ یہ باب کتاب کا سب سے اہم باب ہے جس کو توجہ سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔

باب سوم میں مسلمان معاشرے میں بزرگوں کے حقوق پر ایک وسیع تناظر میں گفتگو کی گئی ہے اور اس معاملے میں اسلام کا نقطہ نظر واضح کیا گیا ہے۔

باب چہارم میں معاشرے میں کمزور طبقات کے حقوق و معاملات اور زمینی صورتحال کا جائزہ لیا گیا ہے اور کافی گہرائی سے تمام طبقات کے حالات و مسائل کا محاکمہ کیا گیا ہے تا کہ ان کے حقوق کے باب میں عام بیداری پیدا کی جا سکے۔

باب پنجم میں پس ماندہ طبقات اور غیر مسلموں کے حقوق سے بحث کرتے ہوئے ان طبقات کے انسانی حقوق کی بحالی کے لیے نہ صرف صحیح اسلامی موقف کی وضاحت کی گئی ہے بلکہ اس کا روڈ میپ بھی پیش کیا گیا ہے۔

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عام لوگوں میں بالعموم اور مسلمانوں میں بالخصوص انسانی حقوق کے باب میں نہ صرف صحیح سمجھ پیدا ہو بلکہ ان کے اندر احساس و

بیداری پیدا ہو تا کہ ہم جدید اور مہذب سماج میں اپنی باوقار حیثیت کی یافت کے ساتھ ساتھ انسانی سماج میں مثبت کردار ادا کرنے کے اہل ہوسکیں اور اسلام جن قدروں کا امین ہے اس کے مطابق اپنے سماج کی تشکیل نو کرکے عالمی برادری میں اپنا کھویا ہوا مقام واپس لاسکیں۔ دنیا کسی قوم کو اس کے فکر و کردار سے ہی پہچانتی ہے۔ لہٰذا ہم اگر اپنوں اور دوسروں کے ساتھ انصاف کی روش پر قائم رہیں گے تو دنیا ہمیں اسی حیثیت سے تسلیم کرے گی اور عالمی برادری میں ہمارا وقار بلند ہوگا۔ بھارت کا موجودہ سماج ایک ایسے مسلم معاشرے کی راہ دیکھ رہا ہے جو اپنے اور پرائے میں فرق کے بغیر سب کی خیرخواہی کا مدعی ہو اور ہر کسی کے انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو۔

کسی کتاب کی تالیف کبھی ایک شخص کا کارنامہ نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک ٹیم ورک ہے جس میں بہت سے لوگوں کی مدد ہوتی ہے۔ کوئی کتاب برسوں کے غور و مطالعہ کے بعد معرضِ وجود میں آتی ہے جن میں سیکڑوں مصنّفین اور مفکرین سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں بھی متعدد مصنّفین اور مفکرین کی آرا سے استفادہ کیا گیا ہے جن کے حوالے جابہ جا اس کتاب میں ملیں گے۔ میں ان تمام مصنّفین اور مفکرین کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ساتھ ہی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، ایڈیٹنگ اور پبلشنگ کے مراحل میں جن جن لوگوں نے معاونت کی ہے ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں اپنی اہلیہ اور بچوں کا بھی شکرگزار ہوں جن کے تعاون کے بغیر کوئی سنجیدہ کام کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ لوگ اس کتاب کا کھلے دل سے استقبال کریں گے۔ اردو میں ایسے موضوعات پر معیاری اور معروضی کتابیں بہت کم ملتی ہیں۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہوگی جو اردو میں انسانی حقوق کے موضوع پر ایک مثبت اضافہ مانی جائے گی۔

ابوذر کمال الدین

8.1.2022

باب اول

انسانی حقوق کی تاریخ وتشریح
عالمی دساتیر اور اسلام کی روشنی میں

عہدِ حاضر میں انسانی حقوق کا مسئلہ
اسلام اور ہندوستان کا مسلم سماج

عہدِ حاضر اپنی جلو میں گونا گوں خصوصیات رکھتا ہے۔ یہ علم و سائنس کی صدی ہے۔ تحقیق و ایجاد نے بالکل ایک نئی دنیا بنائی ہے جس کا ماضی کی صدیوں میں کوئی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک طرف علم و آگہی کے فروغ اور دوسری طرف سائنس اور ٹکنالوجی کی محیر العقول ترقی نے زمان ومکان کے تمام تر سابقہ تصورات کو بدل کر رکھ دیا ہے اور ہم ایک ایسی دنیا میں آگئے ہیں جہاں ہر طرف انسانی حقوق کا غلغلہ ہے۔ اس وقت جہاں ایک طرف قومی اور طبقاتی کشمکش جاری ہے، وہیں دوسری طرف تہذیبوں کے درمیان تصادم بھی ہورہا ہے۔ تیسری طرف ملک کے اندر اور باہر مقامی، علاقائی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر غربت، جہالت، بیماری، بے گھری، بے روزگاری، سماجی اور معاشی عدم مساوات، ظلم و استحصال، جبر و عدم رواداری کے خلاف جنگ جاری ہے۔ جب سے جمہوریت اور جمہوری قدروں کو فروغ ہوا ہے، عوام کے ذریعہ منتخب حکمرانی کا دور شروع ہوا ہے۔ جمہوری اداروں کا قیام عمل میں آیا ہے، پریس کی آزادی متحقق ہوئی ہے اور قانون کی حکمرانی اور عدلیہ کی برتری تسلیم کی جانے لگی ہے۔ عورتوں، کمزوروں اور اقلیتوں کے حقوق کے باب میں نئی وسعت و بیداری آئی ہے اور ایک انسانیت نواز، پرامن اور باہمی احترام پر مبنی سماج، سیاست اور معیشت کا نظام قائم کرنے کی جدوجہد جاری ہے۔ اس مرحلے اور ماحول میں انسانی حقوق کا مسئلہ زیادہ ابھر کر سامنے آیا ہے اور کہاں کہاں اور کتنی زیادتیاں

ہورہی ہیں اس پر نہ صرف نظر رکھی جارہی ہے بلکہ اس کے خلاف زوردار مہم بھی جاری ہے۔ دنیا کے ہر ملک اور سماج میں ہیومن رائٹس گروپ کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے جو اپنے سماج اور ملک میں اور بین الاقوامی سطح پر انسانی حقوق کی پامالی کا پتہ لگاتے ہیں اور ان کا سخت نوٹس لیتے ہیں نیز ان کے خلاف تمام تر قانونی اور جمہوری طریقے سے جدوجہد کررہے ہیں۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں انسانی حقوق کو دستوری ضمانتیں مل رہی ہیں، نئے نئے قوانین اور اداروں کا قیام عمل میں آرہا ہے اور مروجہ نظام سیاست ومعیشت اور دیگر اداروں میں جو نا انصافیاں ہیں ان کے خلاف آواز اٹھائی جارہی ہے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں انسانی حقوق کے باب میں نئی بیداری آئی ہے اور اب گاؤں اور شہروں کے غریب اور ان پڑھ لوگ اور حاشیہ پر رہنے والی آبادیاں بھی اکٹھی ہورہی ہیں اور اپنے خلاف ہونے والے ظلم و استحصال کے خلاف آواز اٹھا رہی ہیں۔ عدلیہ کی عملیت (Activism) نے ان کوششوں کو مہمیز دیا ہے اور دھیرے دھیرے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا نیا تانا بانا ابھر کر سامنے آرہا ہے۔

لیکن ان تمام تر کوششوں کے باوجود ابھی بھی انسانی حقوق کا مسئلہ بہت سنگین اور پیچیدہ بنا ہوا ہے اور دنیا کی دو تہائی آبادی اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہے۔ ہندوستان میں جہاں ایک دستوری جمہوریت قائم ہے اور جہاں شخصی آزادی، پریس کی آزادی اور عدلیہ کی آزادی اور برتری تسلیم کی گئی ہے، انسانی حقوق کی پامالی ان سب کی نفی کرتی نظر آتی ہے۔ ہندوستان کے غریب اور ان پڑھ عوام بنیادی انسانی حقوق کی برکات سے اپنی فطری کمزوریوں کی وجہ سے یا تو محروم ہیں یا محروم رکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح اس ملک کے آدی باسی، دلت، دیگر پسماندہ طبقات، اقلیتیں بالخصوص مسلمان اقلیت، عورتیں، بچے، معذور اور بیمار لوگ تمام تر بلند بانگ دعوؤں اور اسکیموں کے باوجود ظلم و استحصال کے شکار ہیں جنھیں قدم قدم پر نظر انداز کیا جاتا ہے اور ان کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ہندوستان کے سماج میں جو ذات پات کا نظام ہے۔ جو دیومالائی تصورات قائم ہیں۔ اکثریت اور اقلیت کے

درمیان جو تعصّبات ہیں اس کی وجہ سے تمام تر دستوری اور قانونی ضمانتوں کے باوجود انصاف اور مساوات عنقا ہے۔ نہ صرف سیاسی پارٹیاں اور دیگر سماجی ادارے اپنے تعصّبات اور تحفظات سے اوپر اٹھ کر معاملہ کرنے میں ناکام ہیں بلکہ پریس اور عدالتوں کا رول بھی جانب دارانہ ہے۔ اس صورتحال میں انسانی حقوق کا سوال نہایت پیچیدہ اور سنگین ہوجاتا ہے۔ یواین او کے سابق سکریٹری جنرل کوفی عنان نے انسانی حقوق کے باب میں بہت خوبصورت بات کہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اگر Human Wrongs کو سمجھ لیں تو Human Rights کو سمجھنا اور اس کی حفاظت کرنا آسان ہوگا۔

بہرحال ایک طرف علم و سائنس کے فروغ ، جمہوریت اور جمہوری اداروں کے استحکام اور عالمی سماج میں جو قانونی ارتقا ہوا ہے اس کے نتیجے میں ہیومن رائٹس کے بارے میں بیداری آئی ہے اور ہم ایک بہتر کل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ تاہم انسانی سماج میں پائی جانے والی تفاوت و تعصّبات کی وجہ سے بڑے پیمانے پر خاص طور پر کمزور اور پسماندہ طبقات کے حقوق پر روز شب خون مارا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ہماری بڑی آبادی اپنے واجبی حقوق حاصل کرنے سے محروم ہے۔ ایک اچھی بات یہ ہے کہ ہر طبقہ میں جو بیداری اور اجتماعیت پیدا ہوئی ہے اس کی وجہ سے ہیومن رائٹس کے حصول کی کشمکش تیز ہوگئی ہے۔ لہٰذا ایک طبقہ چاہے کتنی ہی عددی قوت رکھتا ہو اور کتنا ہی طاقت ور ہو وہ کمزوروں اور اقلیتوں کے حقوق کو زیادہ دنوں تک دبا کر نہیں رکھ سکتا ہے۔

ہمیں اس پس منظر میں انسانی حقوق کی تاریخ و ارتقا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے، اسلام میں انسانی حقوق اور ہندوستان کے مسلم معاشرے میں اس مسئلہ کا جائزہ لینا ہے تاکہ ایک واضح لائحۂ عمل بنانے میں مدد ملے اور ہم اپنی اندرونی کمزوریوں پر قابو پاتے ہوئے خارجی مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو نظر انداز کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔

■❖■

انسانی حقوق کی تعریف اور تاریخ

انسانی تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں رہا ہے جس میں انسانی حقوق کی بات نہ کی گئی ہو۔ مذہب اور ریاست کا وجود ہی اسی تصور پر قائم ہے۔ کمزوروں اور مظلوموں کی حفاظت، ان کی داد رسی اور ان کو انصاف دلانا یہ اخلاق، مذہب اور ریاست کی وہ خصوصیت ہے جس نے انسانی سماج میں ان کو لازم وملزوم بنادیا ہے۔ لہٰذا عہدِ قدیم سے آج تک لوگ انسانی قدروں کے تحفظ واستحکام پر زور دیتے رہے ہیں اور انہی قدروں کی بنیاد پر انھوں نے کسی سماج، ریاست اور عہد کو اچھا یا برا ہونے کی سند دی ہے۔ لہٰذا انسانی حقوق کی پاسداری اور اس کے تذکرے سے کوئی عہد اور سماج خالی نہیں رہا ہے۔ تاہم آج جس وسعت اور جامعیت کے ساتھ انسانی حقوق کا ذکر ہوتا ہے وہ ایک نئی اصطلاح ہے، جس کے دروبست کو سمجھنا اور جاننا ضروری ہے۔

اس وقت دنیا کی فکری، علمی اور عملی رہنمائی مغرب کے ہاتھوں میں ہے۔ لہٰذا تمام اصطلاحات، ادارے، ضوابط، تکنیک اور تمدنی ضابطے مغرب سے ہی مستعار لیے جاتے ہیں اور انھیں کے ائمہ فکر کو بطور سند تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس کی تفہیم میں اور اس کو وسعت دینے میں نیز اس کو عملی شکل دینے میں پوری جانکاہی اور محنت سے کام کیا ہے اور اپنے آپ کو اس مقام پر پہنچایا ہے، جس سے لوگ ان کو سند

مانیں۔ مشرق بالعموم خوشہ چیں رہا ہے اور مغرب کی قیادت میں چلنے پر راضی ہے۔ اس لیے ہر فکر اور میدان میں مغربی مفکرین کے ارشاد و آثار کو سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ انسانی حقوق کا مسئلہ بھی اس سے الگ نہیں ہے۔

انسانی حقوق کو کئی ناموں اور اصطلاحوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس کو فطری حقوق (Natural Rights) کہتے ہیں تو کچھ بنیادی حقوق (Fundamantal Rights) کے نام سے پکارتے ہیں، تو کچھ اسے بنیادی انسانی حقوق (Basic Human Rights) کا نام دیتے ہیں تو کچھ کے نزدیک یہ انسان کا پیدائشی حق (Birth Rights of Man) ہے تو کچھ اسے قانونی حقوق (Legal Rights) یا مثبت حقوق (Positive Rights) کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔

بنیادی حقوق اور دیگر حقوق میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ بعض حقوق و اختیارات حکومت یا ریاست لے بھی سکتی ہے یا وقتی طور پر اس سے منع بھی کرسکتی ہے مگر بنیادی حقوق کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ غیر منفک یعنی (Inalienable) ہے اور ناقابلِ تنسیخ یعنی (Irreversible) ہیں۔یعنی اس میں ترمیم، تحدید یا عارضی تعطل کا اختیار نہیں ہے الا یہ کہ خود مقتدرِ اعلیٰ یعنی عوام نے اسے دستور میں متعین حدود و شرائط کے ساتھ یہ اختیار بخشا ہو۔

دراصل ان کو بنیادی حقوق اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان حقوق کی ضمانت ملک کے عام قوانین کے بجائے (جو اسمبلی اور پارلیامنٹ کے ذریعے پاس کیے جاتے ہیں) سب سے بالاتر قانون یعنی ''دستور'' (Constitution) میں دی جاتی ہے۔ ملک میں جو بھی قانون کسی ریاستی اسمبلی اور پارلیامنٹ کے ذریعہ بنایا جائے گا اس کے صحیح (Valid) ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ قانون دستور کے چوکھٹے، اس کے مفاہیم اور روح سے میل کھاتا ہو، اسی لیے ملک کے کسی قانون کو جانچنے اور پرکھنے کا اختیار سپریم کورٹ کو دیا گیا ہے جو یہ طے کرے گی کہ کون سا قانون دستور کے مزاج اور روح کے مطابق ہے اور کون اس سے

متغائر۔ جو قانون دستور کے بنیادی خط وخال سے متصادم یا متغائر ہوگا عدالت اس کو کالعدم قرار دے گی۔ اس سے دستور اور عام قانون کا فرق سمجھا جاسکتا ہے۔ دراصل دستور کسی بھی قانون کا ریفرنس پوائنٹ ہوتا ہے اور اسی کے تحت ساری قانون سازی ہوتی ہے۔ اسی لیے دستور ہر چیز سے بالاتر ہے۔ بنیادی حقوق کی ضمانت دستور میں دی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ریاست یا ریاست کا کوئی بھی بازو(Organ) خواہ وہ انتظامی ہو (Executive or Administrative) ہو یا قانون ساز (Legislative) ان کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا ہے۔ یہ حقوق کسی انسان کو کسی ریاست کے شہری ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ محض انسان ہونے کی بنا پر حاصل ہوتے ہیں، اسی لیے اس کو فطری، پیدائشی اور بنیادی حقوق کہا جاتا ہے۔

بنیادی حقوق کی بے شمار تعریفوں میں ایک تعریف گائس ایز یجیوفور (Gaiues Ezejiofor) کی ہے جس کی اس نے اس کی اصل ہیئت کا ذکر کیا ہے۔ گائس کے الفاظ میں:

> ''انسانی یا بنیادی حقوق جدید نام ہے ان حقوق کا جنھیں روایتی طور پر فطری حقوق کہا جاتا ہے اور ان کی تعریف یوں ہوسکتی ہے کہ وہ اخلاقی حقوق جو ہر انسان کو ہر جگہ اور ہمہ وقت اس بنیاد پر حاصل رہتے ہیں کہ وہ دوسری تمام مخلوقات کے مقابلے اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ وہ ذی شعور و ذی اخلاق ہے۔ انصاف کو بری طرح پامال کیے بغیر کوئی بھی شخص ان حقوق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔'' (Protection of Human Rights Under the Law, Bulter Worth, London (1964) P.3)

اس تعریف کا اگر تجزیہ کریں تو مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

(1) انسانی یا بنیادی حقوق روایتی طور پر رائج فطری حقوق کا جدید نام ہے۔

(2) یہ وہ اخلاقی حق ہے جو ہر انسان کو ہر جگہ اور ہمہ وقت حاصل رہتے ہیں۔

(3) یہ حقوق انسان کو دوسری مخلوقات کے مقابلے ذی شعور اور ذی اخلاق ہونے کے ناطے حاصل ہیں کیونکہ وہ دوسری مخلوقات سے ان خصوصیات کے اعتبار سے بہتر

اور ممتاز ہے۔

(4) انصاف کو بری طرح پامال کیے بغیر کوئی بھی شخص ان حقوق سے محروم نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ان حقوق کی پامالی بدترین آمریت اور ڈکٹیٹرشپ میں، یا کسی جبری نظام، فسطائی اور ظالمانہ طرزِ حکمرانی میں ہوسکتا ہے یا جیسا کہ ہندوستان میں 1975 میں انٹرنل ایمرجنسی کے دوران ہوا جس میں دستور کی اس شق کو معطل کر دیا گیا تھا اور لاکھوں انسانوں کو بے قصور اور جھوٹے مقدمات میں ملوث کرکے جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس درمیان عدالتوں نے بھی انتظامیہ کی بالادستی تسلیم کرلی تھی جس کے سبب لاکھوں انسانوں کو بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔

جسٹس جیکسن (Justice Jackson) نے بنیادی حقوق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''کسی شخص کی زندگی، آزادی، ملکیت، آزادی تحریر وتقریر، آزادی عبادت و اجتماع اور اسی طرح کے بنیادی حقوق کسی رائے شماری کے لیے پیش نہیں کیے جاسکتے، ان کا انحصار انتخابات کے نتائج پر ہرگز نہیں ہے۔''

(Broli A.K.: Quotation in United Nations of Human Rights (1968), P.313)

اس سے واضح ہے کہ بنیادی حقوق کسی رائے شماری (Refrendum) یا انتخابات کے نتائج (Election) کی بنیاد پر متعین یا سلب نہیں کیے جاسکتے ہیں۔

دراصل بنیادی حقوق کے دو پہلو ہیں: ایک اخلاقی اور دوسرا قانونی۔ اخلاقی پہلو یہ ہے کہ انسان کو معاشرے میں ایک معزز اور باوقار مقام حاصل ہونا چاہیے اور اس کا احترام حکمرانوں پر بھی لازم ہے اور حکمرانوں کو اپنے تمام شہریوں کے ساتھ اس کی حیثیت عرفی اور عزت نفس کو محفوظ رکھتے ہوئے معاملہ کرنا چاہیے۔ اس لیے عوام کے منتخب نمائندہ

ہوں یا ان کے ذریعہ بحال افسران و کارندے عوام پر حاکم نہیں ہیں بلکہ ان کے خادم ہیں۔ لہٰذا ان کو از روئے قانون حاصل اختیارات کا استعمال عوام کے شہری حقوق اور عام انسانی حقوق کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے کرنا واجب ہے۔

دوسرا پہلو قانونی ہے جس کا مطلب ان حقوق کو قانونی طور پر تسلیم کرتے ہوئے ان کو پورا تحفظ دینا چاہیے جس کے تین واضح پہلو ہیں:

(1) قانون سازی میں اس کو رہنما اصول ماننا۔

(2) اس کے ذریعے ظلم و جبر سے تحفظ اور انتظامی اور عدالتی حکام کے امتیازی سلوک سے تحفظ۔

(3) عدلیہ کے ذریعہ اس کے نفاذ کو متحقق کرنا۔

ان دو وضاحتوں سے بنیادی حقوق کا مفہوم اور اس کے حدود اربعہ واضح ہوجاتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ یہ وہ حقوق ہیں جو پیدائشی اور لازمی طور پر تمام انسانوں کو محض انسان ہونے کی وجہ سے فطری اور دستوری طور پر حاصل ہوتے ہیں، جس کو کسی حال میں توڑا، چھوڑا، معطل اور کالعدم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حکومت اور انتظامیہ یا کوئی فرد اور گروہ اس کی پامالی کرتا ہے تو عدلیہ کے ذریعہ اس کو نافذ کرایا جائے گا اور عدلیہ بے باک اور آزاد ہوگی جس سے کسی جانب داری یا امتیازی سلوک کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔

اس وقت دستوری بنیادی حقوق اس لنگر کی طرح ہے جو ظلم و استحصال اور امتیازات اور بے اعتدالیوں کے سمندر میں ایک عام انسان کو ہر طرح کے طوفان سے بچا کر بخیر وعافیت ساحل سمندر تک لے جانے میں مددگار ہوتا ہے۔ لہٰذا بنیادی حقوق کا تحفظ انسان کے تحفظ کا ہم معنی ہے۔ اس تعریف کے بعد بنیادی حقوق کی تاریخ پر بھی ایک نظر ڈالنا بہتر ہوگا۔

ہیومین رائٹس جس کو اخلاق، انصاف، رحمدلی اور رواداری کے عنوان سے جانا جاتا ہے تمام مذاہب میں اس کی تعلیم و تائید ملتی ہے بلکہ مذاہب کا ایک بڑا وصف ان کی

اخلاقی اور انسانی تعلیمات ہیں جو جبر وظلم، فقر وفاقہ، استحصال و نا انصافی کے خلاف مذہبی تعلیمات کی خاص پہچان ہیں جن کو واضح الفاظ میں ان سے روکا گیا ہے۔ اس لیے انسانی حقوق کا تحفظ اور فروغ تمام مذہبی صحیفوں اور روایات کا حصہ رہی ہیں جس سے روشنی پا کر بعد کی مدنی سیاست اور فلسفہ نے اس میں اضافہ بھی کیا ہے اور اس کو ادارہ جاتی استحکام بھی عطا کیا ہے۔ اس اعتبار سے ہیومین رائٹس کی تاریخ انسانی تاریخ کی طرح پرانی ہے۔ میرے خیال میں دنیا میں کوئی سماج ایسا نہیں تھا جہاں کسی نہ کسی درجہ میں اس کا تصور نہ رہا ہے۔ تاہم جس منضبط اور ہمہ گیر شکل میں یہ اس وقت ہمارے سامنے ہے اس کی تاریخ چند صدیوں پر محیط ہے۔ بعض مورخین کی رائے ہیں عہدِ جدید میں اس کی تاریخ یورپ میں 1215 میں کنگ جان کے میگنا کارٹا سے شروع ہوتی ہے۔ یہ دراصل انسانی حقوق کا دستاویز نہیں تھا بلکہ بادشاہ اور نوبلس کے درمیان ایک مصالحتی دستاویز تھا جس میں بادشاہ کے اختیارات میں کچھ تخفیف کی گئی تھی جس کو والٹیر نے آزادی کا چارٹر قرار دیا جبکہ ہنری مارش نے اس کو بڑے زمینداروں کے حقوق اراضی کا چارٹر مانا ہے۔

اگر اختصار میں ذکر کیا جائے تو یہ اصطلاح بنیادی طور پر تین ساڑھے تین سو سال پہلے یورپ میں رائج ہوئی جو درحقیقت فطری حقوق کے اس قدیم نظریہ کا دوسرا نام ہے جسے سب سے پہلے یونانی مفکر زینو (Zeno) نے پیش کیا تھا اور روم کے مشہور مقنن سائیسیر و (Cicero) نے قانونی اور دستوری زبان میں واضح کیا۔ ڈبلو فریڈ مین نے انسانی حقوق کی ارتقائی تاریخ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ایک شہری کے متعین حقوق پر مبنی معاشرہ کا تصور نسبتاً جدید تصور ہے جو اولاً قرونِ وسطیٰ کے معاشرتی نظام کے خلاف اور ثانیاً سترہویں اور اٹھارہویں صدی کی جدید ریاست کی آمرانہ حکومت کے خلاف ردِ عمل سے ابھرا ہے۔ اس کا نمایاں اظہار جان لاک کے فلسفہ قانون فرانس کے اعلان انسانی حقوق اور امریکی دستور سے ہوا۔'' (Friedman W. Legal Theory,

Sterers Saw London, (1967) P.392

اس طرح گویا انقلاب فرانس اور امریکی اعلان آزادی کو عہد جدید میں انسانی حقوق کا نقطۂ آغاز مانا جاتا ہے۔ یہاں اس کی ارتقائی تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے چلنا نفس موضوع کو سمجھنے میں معاون ہوگا۔

1789ء میں انقلاب فرانس کو، انسانی حقوق کے باب میں بڑی کامیابی مانا جاتا ہے جس میں عام آدمی کو آزادی کا حق، قانون کی نظر میں برابری کا حق اور حق ملکیت جیسے حقوق دیے گئے۔

1791ء میں ٹوم پین(Tom Pane) کی کتاب انسان کے حقوق شائع ہوئی جس نے یوروپ میں اس نظریہ کو عام کیا۔

12/جون1776 کو جارج میسن(George Mason) کے ذریعہ تحریر کردہ، حقوق کا مسودہ(Charter of Rights) امریکی ریاست ورجینا میں جاری کیا گیا جس میں پریس کی آزادی، مذہب کی آزادی اور عدالتوں میں قانونی چارہ جوئی کی آزادی کی ضمانت دی گئی۔

12/جون1776 کو ہی امریکہ کی آزادی کا اعلامیہ جاری کیا گیا جس کے ابتدائیہ (Preamble) میں ملکی قانون کے حوالے سے یہ بات کہی گئی کہ ''تمام انسان مساوی پیدا کیے گئے ہیں اور خالق نے انھیں اپنی جان، آزادی اور حصولِ مسرت کی ناقابلِ تنسیخ حقوق عطا کیے ہیں۔''

1779ء میں امریکی کانگریس نے اس دستور میں دس ترمیمات کو منظوری دی جو قانون حقوق کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

1868ء میں امریکی دستور میں 14ویں ترمیم کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ امریکہ کی کوئی ریاست کسی شہری کے جان و مال اور آزادی کو بغیر قانونی چارہ جوئی اور اس کو مساوی قانونی مواقع فراہم کیے تلف نہیں کرسکتی ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی اور کئی یوروپی ممالک میں بنیادی حقوق کو دستور کا

حصہ بنایا گیا۔ 1940میں H.G. Wells نے 'New World Order' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے بنیادی حقوق کا وسیع خاکہ پیش کیا۔ 1941ء میں امریکی صدر روز ویلٹ نے انسانی حقوق کو وسعت دیتے ہوئے کانگریس سے چار اور حقوق کو شامل کرنے کی سفارش کی۔ اگست 1941 میں اٹلانٹک چارٹر پر دستخط کیے گئے چرچل کے مطابق اس کے دو مقاصد تھے ایک جنگ کا خاتمہ اور دوسرا انسانی حقوق کی حفاظت دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا بھر کے تحریری دساتیر میں انسانی حقوق کو فوقیت کے ساتھ شامل کیا گیا۔ فرانس نے 1789 کے انسانی حقوق کے اعلامیہ کو 1946 میں اپنے نئے دستور میں شامل کیا۔ اسی سال جاپان نے بھی اپنے دستور میں اس کو شامل کیا۔ 1947ء میں اٹلی نے اپنے دستور میں اس کی ضمانت دی۔ 1950ء میں بھارت کے دستور نے بھی اس کو اختیار کیا گیا۔

10/دسمبر 1948ء کو اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کے چارٹر کا اعلان کیا جس میں ان تمام ممکنہ حقوق کا ذکر ہے جو انسانی ذہن میں آسکتے ہیں، اس میں 30 دفعات ہیں جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہیں۔

اس طرح انسانی حقوق اس وقت عالمی طور پر تمام ممالک اور اقوام کے دساتیر، قوانین اور روایات کا لازمی حصہ ہیں اور اسے دستوری اور قانونی سند دی گئی ہے اور اس کو ناقابلِ تنسیخ مانا گیا ہے ساتھ میں اس کی خلاف ورزی قابلِ تعزیر جرم ہے۔

اس دستوری اور قانونی ضمانتوں کی وجہ سے دنیا میں انسانیت نوازی بڑھی ہے۔ ایک مہذب معاشرے کا قیام عمل میں آیا ہے۔ قانون کی حکمرانی کا راج شروع ہوا ہے اور دنیا تہذیب کے اعلیٰ اور اونچے مقام پر پہنچنے کی سعی کر رہی ہے۔

اس بحث سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ انسانی حقوق کی موجودہ رو جس کو قانونی اور دستوری شکل دی گئی ہے یہ پچھلی تین چار صدیوں میں ابھر کر سامنے آئے ہیں جس نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے نصف میں ایک تحریک کی شکل اختیار کی اور عالمی نظام کا حصہ بنا۔

مگر جدید مورخین ماہرین عمرانیات، سیاسیات اور قانون اپنی ناواقفیت اور تعصب کی وجہ سے اس باب میں اسلام کے رول اور کنٹری بیوشن کو بھول جاتے ہیں۔ اسلام وہ دین ہے جس نے سب سے پہلے انسان کو پیدائشی احساس جرم سے آزاد کرکے جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے اور پیدائشی عزت و ذلت جیسے ہندوؤں کا عقیدہ ہے انسان کو محض انسان ہونے کے ناطے خلافت کا جامہ پہنایا اور تمام اولادِ آدم کی تکریم کا اعلان کیا اور تمام انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دے کر اخوت اور مساوات کا سبق پڑھایا اور انسانی حقوق کے متعین اور جامع تصور سے آشنا کیا۔ یہ اسی فکر کی خوشہ چینی ہے جس کو مغرب نے سرقہ کرکے اپنے تہذیبی کمالات کے طور پر پیش کیا ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ ازمنہ وسطیٰ میں یوروپ عہد تاریک میں تھا۔ جب مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ یوروپ تک پہنچا تو اس سے یوروپ میں نئی روشنی آئی۔ یوروپ میں سائنس اور قانون کا علم اسپین کے ذریعے پہنچا جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ اس وقت قرطبہ جس کو Cordova کہا جاتا ہے اور غرناطہ جس کو Granades کہتے ہیں، علم و تحقیق کے بڑے مراکز تھے۔ جہاں یوروپ کے تمام ملکوں سے طالب علم قانون، فلسفہ اور سائنس کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہی طالب علم جب اپنی عالمانہ صلاحیتوں کے ساتھ یوروپ میں پھیلے وہاں سے انھوں نے بیداری اور اصلاح کی نئی روح پھونکی جس نے یوروپ میں نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کو جنم دیا، جس کے نتیجے میں یوروپ میں وہ تمام فکری، فنی، سائنسی اور سیاسی انقلابات ہوئے جس نے یوروپ کو ترقی اور سربلندی کے نئے دور میں داخل کردیا اور وہ ساری دنیا کے امام بن بیٹھے۔ آگے ہم اسلام میں انسانی حقوق کا قدرے تفصیل سے ذکر کریں گے۔

اس تاریخی پس منظر کے بعد چونکہ ہم بھارت کے شہری ہیں دستور ہند میں بنیادی حقوق کا قدرے تفصیل سے مطالعہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

■❖■

دستور ہند میں انسانی حقوق

ہندوستان کا دستور دنیا کا سب سے وقیع اور وسیع دستور ہے جو ہندوستان جیسے کثیر مذہبی، کثیر لسانی اور کثیر تہذیبی ملک کو متحد اور مضبوط رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس دستور میں جہاں ایک طرف شخصی آزادی اور شخصی حقوق کی بات کی گئی ہے وہیں تمام مذہبی گروہوں، لسانی اکائیوں اور تہذیبی گروپوں کو بھی ان کی مذہبی، لسانی اور تہذیبی خصوصیات کو پورا تحفظ دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان کا موجودہ دستور ملک کی سالمیت، اتحاد، داخلی امن اور تمام اشخاص اور گروہوں کی حصہ داری اور امپاورمنٹ کی ایک ایسی عملی دستاویز ہے جس کی اگر ایمانداری سے بجا آوری کی جائے تو ملک ہر طرح کے فتنہ اور بے اعتدالی سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ مگر اس وقت المیہ یہ ہے کہ دستور کی حلف وفاداری لے کر مقنّنہ اور انتظامیہ کے لوگ جن منصبوں پر فائز ہوتے ہیں وہ دستوری ضوابط اور اس کی اسپرٹ کا احترام نہیں کرتے بلکہ من مانے ڈھنگ سے کام کرتے ہیں جس کی وجہ سے سماج اور ملک میں بہت سی بے اعتدالیاں پیدا ہورہی ہیں اور لوگوں کے بنیادی حقوق پامال ہورہے ہیں۔ دستور کی غیر ایماندارانہ بجا آوری کی وجہ سے سماج کے کمزور طبقات بالخصوص اقلیتیں بہت دباؤ محسوس کررہی ہیں اور ان کے اندر خوف اور عدمِ اطمینان گھر کر گیا ہے۔ کچھ لوگ چور دروازوں سے اس دستور کو کالعدم اور معطل بھی کرنا چاہتے ہیں جس نے ہندوستانی سماج اور سیاست کے سامنے ایک بڑا مسئلہ کھڑا کردیا ہے۔ تاہم یہ اس وقت ہمارا

موضوع نہیں ہے، اس پر الگ سے بات کی جائے گی۔ ہم اس وقت ہندوستان کے دستور میں مندرج بنیادی حقوق کا جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ اس میں کن حقوق کو شامل کیا گیا۔ یہاں وضاحت کے طور پر بطور یاددہانی ایک بات کا ذکر ضروری ہے کہ بنیادی حقوق وہ لازمی حقوق ہیں جن کو کسی حال میں تلف نہیں کیا جاسکتا ہے اور اگر کوئی حکومت یا اس کا کوئی ادارہ بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کو تلف کرنا چاہیے تو عدالتی چارہ جوئی کے ذریعہ اس کو نہ صرف ایسا کرنے سے روکا جائے گا، بلکہ عدالت کے ذریعہ ان حقوق کی بازیابی اور نفاذ بھی ہوگا۔ اس طرح بنیادی حقوق کا باب دستور ہند کی روح ہے، جب تک یہ روح باقی ہے ہندوستان کا موجودہ ڈھانچہ باقی رہے گا۔ لہٰذا اس کی حفاظت ہندوستان کی حفاظت ہے۔

دستور ہند میں بنیادی حقوق یا اس کے پورے خط و خال کو سمجھنے کے لیے دستور ہند کا ابتدائیہ یعنی Preamble پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کیونکہ دستور کے تمام ابواب اور دفعات انہی ابتدائی نکات کی بازگشت اور تفصیل ہیں۔

اس دستور کے ابتدائیہ میں یہ اعلان ہے کہ

> ''ہم جو ہندوستان کے عوام میں ہندوستان کو ایک خودمختار سوشلسٹ، سیکولر عوامی جمہوری بنانے کا مقدس عزم کرتے ہیں اور اس کے ہر شہری کے لیے انصاف جس میں سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف شامل ہے، آزادی جس میں خیالات، اظہار، عقیدہ، مذہب اور عبادت کی آزادی شامل ہے اور برابری جس میں حیثیت اور مواقع کی برابری شامل ہے کو لوگوں کے درمیان بڑھائیں گے اور ان کے درمیان بھائی چارہ قائم کریں گے جس میں تمام افراد کی عزت کو یقینی بنایا جائے گا اور ملک کا اتحاد اور اس کی سالمیت قائم رکھی جائے گی۔''

ہم نے 26/نومبر 1949 کو یہ دستور خود کو دیا جس کو 26 جنوری 1950 کو نافذ العمل کیا گیا اور اس طرح ہندوستان دستوری طور پر عوامی جمہوریہ بنا جس کا جشن ہم ہر سال

مناتے ہیں۔ اب آپ اس ابتدائیہ کو غور سے دیکھیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ دستور ہم پر کسی نے تھوپا نہیں ہے بلکہ ہم نے اپنی آزادانہ مرضی سے اسے اپنے اوپر لاگو کیا ہے اور فیصلہ لیا ہے کہ ملک کا انتظام وانصرام اور نظم حکمرانی اسی دستور کی رو سے ہوگا۔ دوسرا یہ ہے کہ دستور کی رو سے ہمارا ملک ایک سوشلسٹ سیکولر جمہوری ملک ہے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ انصاف، آزادی، برابری اور بھائی چارہ دستور کے وہ ستون ہیں جو تمام شہریوں کو جوڑتے ہیں اور یہی ہمارے دستور کی روح ہے۔ کوئی چیز جو ان بنیادی اصولوں سے منحرف ہوگی وہ دستور کی روح سے متغائر مانی جائے گی اور اس کی بنیاد پر کوئی قانون بنا ہوگا تو عدالت عظمیٰ اس کو کالعدم کرسکتی ہے۔ انہی اصولوں اور بنیادی خطوط پر بنیادی حقوق کو متعین اور واضح کیا گیا ہے جس کی تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے۔

دستور کے پارٹ -III یعنی باب سوئم میں بنیادی حقوق کے عنوان سے دفعہ 12 سے دفعہ 30 تک بنیادی حقوق کا ذکر کیا گیا ہے۔

دفعہ 12 میں اسٹیٹ کی تعریف بیان کی گئی ہے جس کے تحت مرکزی اور ریاستی حکومتیں، پارلیامنٹ، اسمبلیاں، لوکل سلف گورنمنٹ اور تمام دوسرے ادارے جن کو کلی اور نیم کلی جوڈیشیل پاور حاصل ہیں ریاست کی تعریف میں آتی ہیں۔ **دفعہ**13 میں حکومت ان کی تمام ایجنسیاں اور ذیلی ادارے کوئی ایسا قانون یا ضابطہ نہیں بنائیں گے جو دستور سے متغائر ہو یا بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کرتی ہو۔ اگر ایسا کوئی قانون یا ضابطہ ہوگا تو وہ کالعدم قرار دیا جائے گا۔

دفعہ 14 میں قانون کے سامنے برابری کا حق دیا گیا ہے۔ جس کے تحت کہا گیا ہے کہ ریاست کسی شہری کو قانون کے سامنے برابری کے حق سے محروم نہیں کرسکتی ہے یا ہندوستان کے اندر تمام شہری کو یکساں تحفظ دے گی۔ اس دفعہ میں دو باتیں ہیں ایک برابر کا حق حاصل ہونا، کسی کو اس سے محروم نہ رکھنا اور دوسرے سبھی شہریوں کو یکساں قانونی تحفظ فراہم کرنا۔

دفعہ 15 میں مذہب، نسل، ذات، جنس اور مقام پیدائش کی بنیاد پر کسی شہری کے ساتھ امتیازی سلوک کی ممانعت کی گئی ہے۔ یعنی کسی شخص کے ساتھ خواہ وہ کسی مذہب، نسل، ذات، جنس کا فرد ہو اور وہ کہیں پیدا ہوا ہو اس بنیاد پر اس کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان امور میں تمام تر اختلافات کے باوجود تمام شہریوں کے ساتھ برابری کا معاملہ کیا جائے گا۔

دفعہ 16 میں سرکاری نوکری میں تمام شہریوں کو یکساں مواقع حاصل ہوں گے۔ یعنی دفعہ 15 میں جن اختلافات کا ذکر کیا گیا اس کی بنیاد پر ان کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔

دفعہ 17 میں چھوا چھوت کا خاتمہ کیا گیا اور اس کی مکمل ممانعت کی گئی ہے۔ اگر چھوا چھوت کی بنیاد پر کسی کو محروم رکھنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ قابل تعزیر جرم ہوگا۔

دفعہ 18 کے تحت تمام خطابات کو منسوخ کیا گیا ہے اور کوئی شخص کسی بھی بیرونی حکومت کا کوئی خطاب بغیر حکومت کی اجازت کے نہیں لے سکتا ہے۔

دفعہ 19 میں شہریوں کو اظہار کی آزادی دی گئی ہے۔ جس کے اندر بولنے اور اظہار رائے کی آزادی، بغیر ہتھیار کے پرامن اجتماع کی آزادی، تنظیم یا ادارے قائم کرنے کی آزادی، ملک کے کسی حصے میں آزادانہ آنے جانے کی آزادی اور ملک کے اندر کسی مقام پر رہنے بسنے کی آزادی شامل ہے۔

دفعہ 20 میں کسی آدمی کو اس وقت تک سزا نہیں دی جاسکتی جب تک کہ وہ قانونی طور پر ملزم نہ قرار دیا جائے اور سزا کی مقدار جرم کی نوعیت کے مطابق طے کی جائے گی۔

دفعہ 21 میں جان اور انفرادی آزادی کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے اور کسی انسان کو زندگی یا شخصی آزادی سے نافذ قانون کی عمل آوری کے بغیر محروم نہیں کیا جاسکتا ہے۔

دفعہ 22 کے تحت گرفتاری اور حبس بے جا کے خلاف تحفظ دیا گیا ہے۔

دفعہ 23 انسانوں کی اسمگلنگ اور جبری محنت کی ممانعت کی گئی ہے اور قانوناً ایسا کرنا جرم مانا گیا ہے۔

دفعہ 24 بچوں کو جن کی عمر چودہ سال سے کم ہے ایسی فیکٹریوں میں جو ان کی صحت کے لیے نقصان دہ ہیں ملازمت پر پابندی لگائی گئی ہے۔

دفعہ 25 کے تحت ہنر اور پیشے کی آزادی، اور مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔

دفعہ 26 میں مذہبی امور کی انجام دہی کی آزادی دی گئی ہے جس کے تحت مذہبی اور خیراتی ادارے کا قیام اس کا انتظام انصرام، منقولہ اور غیر منقولہ جائدادوں کا حصول اور ان جائدادوں کی نگہبانی و انتظام کا حق دیا گیا ہے۔

دفعہ 27 کے تحت کسی خاص مذہب کے فروغ کے لیے ٹیکس کی ادائیگی سے آزادی دی گئی ہے یعنی کسی خاص مذہب کے فروغ کے لیے کوئی ٹیکس نہیں لگایا جائے گا اور نہ ٹیکس کے پیسے سے اس کے فروغ کے لیے کوئی رقم خرچ کی جائے گی۔

دفعہ 28 کسی ادارے میں مذہبی تعلیم یا مذہبی امور کی بجا آوری سے آزادی، یعنی کوئی شخص اگر ان امور میں حصہ نہ لینا چاہے تو اسے اس کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ 29 میں اقلیتی مفادات کا تحفظ دیا گیا ہے جس کے تحت ہندوستان کے کسی حصہ میں رہنے والا شخص جس کی مخصوص زبان ہے اس کا رسم الخط ہے اور اس کا کلچر ہے اس کے تحفظ کی آزادی ہوگی اور سرکار کے ذریعے چلائے جانے والے یا تعاون حاصل کرنے والا کسی ادارے میں مذہب، نسل، ذات، جنس اور زبان کی بنیاد پر داخلے سے منع نہیں کر سکتا ہے۔

دفعہ 30 اقلیتوں کو اپنی پسند کے مذہبی لسانی اور تعلیمی ادارے کھولنے اور اس کو چلانے کی آزادی دی گئی ہے۔ اور ریاست ایسے اداروں کو جو زبان یا مذہب کی بنیاد پر قائم ہیں اور جو کسی مذہبی اقلیت کے ذریعے چلائے جا رہے ہیں ان تعلیمی اداروں کو مالی گرانٹ دینے میں کوئی امتیازی سلوک نہیں کرے گی۔

اس طرح یہ وہ متعین اور معلوم حقوق ہیں جن کو دستور ہند نے بنیادی حقوق کہا ہے۔ جو تمام شہریوں کا بنیادی حق ہے۔ جس کے حصول میں کوئی رکاوٹ یا تحدید اگر کسی کی

جانب سے ہوتی ہے تو عدالت کے ذریعے وہ نافذ العمل ہوگا۔

ان حقوق کا محاکمہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ دفعہ 14 سے دفعہ 30 تک مختلف حقوق کو بنیادی حقوق مان کر متعین اور مستقل ضمانت دی گئی ہے جس میں قانون کے سامنے برابری کا حق، مذہب، نسل، ذات، جنس اور مقام پیدائش کی بنا پر کسی امتیازی سلوک اور بھید بھاؤ کا انسداد، تمام سرکاری نوکریوں میں یکساں مواقع، چھوا چھوت کا خاتمہ، خطابات کا خاتمہ، بولنے کی آزادی، بغیر قانونی چارہ جوئی کی سزا دینے پر روک، زندگی اور انفرادی آزادی کا تحفظ، حبس بے جا سے تحفظ، انسانوں کی تجارت اور جبراً محنت کا انسداد، ضمیر کی آزادی، کوئی بھی پیشہ چننے کا حق، اور اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق، اپنے مذہبی معاملات کو انجام دینے کی آزادی، کسی خاص مذہب کی اشاعت کے لیے ٹیکس لگانے پر روک، اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ اور اقلیتوں کو اپنی پسند کے ادارے کھولنے اور چلانے کا حق دیا گیا ہے۔

یہ سب دستور ہند میں دئے گئے وہ بنیادی حقوق ہیں جو جدید ہندوستانی جمہوریت کی پہچان ہیں جس کی وجہ سے ہندوستان کو دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک مانا جاتا ہے۔ ہندوستانی جمہوریت کی ایک دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بھارت میں ایک مذہب اور نسل کے لوگ نہیں ہیں اور نہ ایک رنگ اور ایک زبان بولنے والے لوگ ہیں۔ یوروپ کے بیشتر ممالک میں مذہبی، نسلی اور لسانی یکسانیت پائی جاتی ہے اس لیے ان کی جمہوریت میں اندرونی تضاد کم ہے۔ وہاں اقلیت اور اکثریت کا کوئی سماجی تصور نہیں ہے بلکہ یہ ایک سیاسی اصطلاح ہے جس کا اطلاق ایوان میں حزب اختلاف اور حکمراں پارٹی کے درمیان ہوتا ہے۔ یعنی جس پارٹی کے ممبران کی تعداد ایوان میں نصف سے کم ہوتی ہے وہ اقلیتی پارٹی مانی جاتی ہے جو حزب اختلاف ہوتے ہیں اور جس پارٹی کے ممبران کی تعداد نصف سے زیادہ ہوتی ہے وہ حکمراں جماعت ہوتی ہے جس کو حکومت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ مگر بھارت میں اقلیت اور اکثریت کو سیاسی اصطلاح کے طور پر ہی نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس کا ایک سماجی مفہوم بھی ہے۔ سماج میں جس مذہب، نسل، طبقہ، ذات اور زبان کے

لوگ کم ہیں ان کو اقلیتی گروہ مانا جاتا ہے اور جس کی تعداد زیادہ ہے اس کو اکثریتی گروہ مانا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان میں اقلیتی گروہوں کے مفادات کا تحفظ ایک بڑا مسئلہ ہے کیونکہ گنتی میں جو گروہ کم ہوگا، فی فرد ایک ووٹ کا حق رکھنے کے باوجود مجموعی طور پر ایوان میں اس کی نمائندگی کم ہوگی۔ اس صورتحال میں اگر اکثریتی گروہ فراخ دلی، رواداری، انصاف، وسعت نظری اور عدل سے کام نہ لے تو تمام جمہوری اداروں، قوانین اور روایات کی موجودگی کے باوجود اقلیتوں کو ان کا واجبی حق کبھی نہیں مل سکتا ہے۔ اور تمام تر بنیادی حقوق کی ضمانتوں کے باوجود وہ اپنے حق سے محروم رہیں گی اور یہ سب کچھ خالص دستوری اور جمہوری عمل کے ذریعہ ہوگا۔ اس وقت ہندوستان میں ایسی کئی سیاسی پارٹیاں ہیں جو کھلم کھلا اقلیتوں کے وجود اور حقوق کی نفی کرتی ہیں اور ان کو ملنے والے حقوق کے خلاف رائے عامہ بنانے کی مہم میں جٹی ہیں۔ ان میں بعض جماعتوں کو حالیہ انتخابات میں بڑی کامیابی بھی مل رہی ہے اور وہ متعدد ریاستی حکومتوں بلکہ مرکز پر بھی قابض ہو رہی ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے ایجنڈے کے تحت اعلانیہ اور خفیہ طریقے سے کام کر رہی ہیں اور ملک کے سیکولر اور مبنی بر رواداری والے کردار کو بدل رہی ہیں۔ جس نے پورے ملک میں ایک بے چینی کی لہر پیدا کردی ہے۔ اس سے نہ صرف یہاں کی مذہبی اقلیتیں پریشان ہیں بلکہ انسانی حقوق کا کام کرنے والے ادارے اور افراد بھی سخت دباؤ میں ہیں۔ ایک دوسرا خطرناک رجحان یہ ہے کہ عدلیہ، پریس اور سول سوسائٹی ان امور کے معاملے میں نہ صرف غیر حساس (Immune) ہوگئی ہے بلکہ کہیں کہیں ان کی طرفدار نظر آتی ہے۔ اس سے ملک میں فسطائیت کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ زیر زمین دستور کو بدلنے کی بات چل رہی ہے اور بھارت کو ہندو راشٹریہ بنانے کا اعلانیہ اظہار کیا جا رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ملک کے عوام اس سازش کو ناکام کرتے ہیں یا دام ساحری میں گرفتار ہوکر دستور ہند کو پامال کرنے کا فیصلہ لیتے ہیں۔ بہرحال یہ موجودہ سیاست کا وہ چیلنج ہے جس کا ہمیں جواب ڈھونڈنا ہے۔

■❖■

اسلام میں بنیادی حقوق

اب آیئے اسلام نے ہمیں جو بنیادی حقوق و اختیارات فراہم کیے ہیں ان کا جائزہ لیں اور یہ موازنہ کر کے دیکھیں کہ UNO چارٹر اور دستور ہند میں جو حقوق دیے گئے ہیں ان سے وہ کس درجہ بہتر ہیں اور اس کی بجا آوری کیسے ہوسکتی ہے؟ اسلام کا اصل ماخذ قرآن وسنت (یعنی حضورؐ کے اقوال و اعمال جن کو حدیث کہتے ہیں) ہیں۔قرآن و حدیث معروف معنوں میں علم سماجیات، علم سیاسیات، علم تعلقات عامہ اور دستور و قانون کی کتاب نہیں ہیں جن میں کسی مسئلہ کو اصول و قاعدہ جس کو تھیوری کہتے ہیں کی شکل میں یا دستور و قانون کی کتابوں میں دفعہ وار طریقے سے بیان کی جاتی ہیں اس طرح بیان نہیں کی گئی ہیں بلکہ یہ تعلیمات مختلف قرآنی آیات اور حضورؐ کے فرمودات اور عملی مثالوں سے واضح ہوتی ہیں۔ نیز خلفائے اسلام، فقہائے عظام اور قضات و مفتیان کے فیصلوں اور نظیروں میں موجود ہیں جن کو آثار کہتے ہیں، ان سے مستنبط ہیں۔

اسلام کا اپنا ایک نظام عقیدہ ہے جس کے تحت وہ خدا کے وجود، اس کی صفات، خدا کا انسان سے تعلق، انسان کا خدا سے تعلق، اس کائنات میں انسان کی حیثیت، رسول کی حیثیت، کتاب کی حیثیت، انسانوں کے باہمی تعلقات، عورت مرد کے رشتے، رشتہ دار، پڑوسی، مسافر، دوست، دشمن، تجارت، معیشت، سیاست اور تعلقاتِ عامہ، دوستی دشمنی کے

آداب،صلح و جنگ کے اصول، دنیا اور آخرت،غرض وہ زندگی کے تمام معاملات، متعلقات، پہلوؤں اور مسائل پر واضح رہنمائی کرتا ہے۔ یہ ساری چیزیں ایک منضبط نظام (Well Knit System) کی طرح ہیں۔ جس کی ایک کڑی بھی ڈھیلی ہوجائے تو پورا نظام درہم برہم ہوجائے گا اور اس کے جوہر اصلی تک رسائی نہیں ہوسکے گی۔آج کا مسلمان معاشرہ چونکہ پوری طرح اسلامی معاشرہ نہیں ہے اس لیے اسلام کی تعلیمات اور اسلامی معاشرے کی برکات سے نہ صرف غیرمسلم بلکہ بیشتر مسلمان دنیا محروم و ناواقف ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ آج کی جدید زبان و اصطلاح میں ان تعلیمات کو نکات وار منضبط کرکے عام لوگوں تک پہنچایا جائے تاکہ لوگ اسلام کی اصل روح اور اس کی تعلیمات سے اچھی طرح واقف ہوسکیں۔ ہم یہاں نہایت اختصار کے ساتھ ان تعلیمات کا ایک مختصر جائزہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ اسلامی شریعت (Code of Conduct) کیا ہے اور اسلام نے عام انسانوں کو یعنی مسلم، غیرمسلم، آزاد، غلام اور عورت اور مرد کے فرق کے بغیر کون کون سے بنیادی حقوق عطا کیے ہیں۔آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک اور بات واضح کرتے چلیں کہ جو احکامات و ہدایات وحی و رسالت کے ذریعے دیے گئے ہیں یعنی جو قرآن اور حدیث میں وارد ہوئے ہیں وہ قیامت تک ناقابل تبدیل، ناقابلِ ترمیم، ناقابلِ تنسیخ ہیں۔اس لیے کہ قرآن کا عقیدہ ہے کہ قرآن اللہ کی آخری اور مکمل کتاب ہدایت ہے اور حضورﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں یعنی آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس لیے اب چاہے وہ مسلمان حکمران ہو، وزیر اور جج ہو یا حکومت کا کوئی اعلیٰ عہدہ دار، عالم اور فقیہ ہو یا کوئی مجتہد وقت یا پھر سائنس داں، دانشور، مدبر وفلسفی ہو یا کوئی عام آدمی وہ ان احکامات کو بدل نہیں سکتا ہے۔ان احکامات کو کسی ریفرنڈم یا رائے شماری سے تبدیل نہیں کیا جاسکتا ہے، اس قانون کا اطلاق حکمران اور عوام دونوں پر یکساں طریقے سے ہوگا تمام کے تمام لوگ اس قانون کے تحت، اس کے مطابق اپنے تمام دستوری ضابطوں کی تدوین کریں گے اور اسی کے مطابق اپنے قوانین بنائیں گے نیز اپنے انتظامی ضوابط طے کریں گے۔کوئی قانون

جو اس اصول اور اس کی روح کے منافی ہوگا نیز اس کی خلاف ورزی پر مشتمل ہوگا اسے قابلِ رد اور باطل (Null & Viod) قرار دیا جائے گا۔ ہاں، قرآن وحدیث کی روشنی میں مختلف زمانوں میں فقہا اور دیگر ذمہ داران نے جو اجتہاد استنباط کیا ہے اس کی حیثیت وحی اور رسالت کی نہیں ہے۔ لہٰذا وقت اور حالات کے مطابق ان کی رائے اور فیصلوں سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے، اس کو بدلا بھی جاسکتا ہے، اس کو چھوڑ کر کوئی اور رائے بھی اختیار کی جاسکتی ہے مگر یہ آزادی نص میں نہیں لی جاسکتی ہے۔ اس طرح اسلام کا ضابطہ Rigid اور Flexible دونوں ہے۔ اصول مستحکم ہیں مگر استنباط اور اجتہادی امور میں Flexibility ہے جو اس کو وقت، حالات، زمان ومکان کے اعتبار سے قابلِ عمل اور آسان پہلوؤں کی طرف رہنمائی کرتا ہے تاکہ انسانی ارتقاء، ایجاد اور عروج کا سلسلہ باقی رہے اور یہ احکامات قیامت تک تمام زمانوں، ملکوں اور رنگ ونسل کے لوگوں کے لیے قابلِ عمل اور قابلِ صلاح و فلاح بنے رہیں۔ اسلام کی یہی وہ Flexibility ہے جو اس کو دائمی دین (Permanent System of Life) بناتی ہے اور اس کے عالمی کردار (Global & Universal Character) کو واضح کرتی ہے۔

ان بنیادی باتوں کے ساتھ اسلامی ضابطہ حیات یعنی شریعت کے مقاصد اور خصائص (Objectives and Salient Features) پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے چلنا بہتر ہوگا تاکہ نفس موضوع پوری طرح واضح ہوجائے۔

امام غزالی (وفات 505ھ/1111ء) نے مقاصد شریعت کے باب میں لکھا ہے:

> ”شریعت کا مقصد خلق خدا کے سلسلے میں پانچ چیزوں سے عبارت ہے (1) دین کا تحفظ (2) انسانی جان کا تحفظ (3) انسانی عقل کا تحفظ (4) نسل انسانی کا تحفظ (5) انسان کے مال کا تحفظ۔ ہر وہ چیز جو ان پانچ بنیادی چیزوں کی حفاظت کرنے والی ہو مصلحت شمار ہوگی اور ہر وہ چیز جو ان پانچ بنیادی چیزوں کے لیے خطرہ ہو، مفسدہ شمار ہوگی جسے دور کرنا مصلحت قرار

پائے گا۔"

یہ جو فہرست ہے وہ منصوص فہرست نہیں ہے بلکہ مستنبط ہے یعنی قرآن و سنت کے عمومی مطالعہ سے یہ مقاصدابھر کر سامنے آئے ہیں جن میں بعد کے علماء جیسے علامہ شاطبی، ابن قیم اور شاہ ولی اللہ علیہم الرحمہ نے متعدد اضافے کیے ہیں۔ اگر ان کی رایوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو وہ تمام بنیادی باتیں جو امت اور انسانیت کے تحفظ، آزادی، شرف، کفالت، فلاح، عدل و مساوات اور امن و سلامتی سے تعلق رکھتے ہیں، شریعت کے مقاصد میں شمار کیے جائیں گے۔

ہم ایک ارتقا پذیر اور حرکی معاشرہ میں رہتے ہیں جہاں تغیر وتبدل ایک اٹل فطری قانون کے طور پر کام کرتا ہے لہٰذا اس دین کو ہر معاشرہ اور ہر عہد کی ضرورتوں کے مطابق نت نئی بدلتی صورتحال میں ان نئے نئے مقاصد کو بھی شامل کرنا ہوگا جو اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ اور اس کی تعلیمات کے عصری انطباق سے متصادم نہ ہوں۔ یعنی ہر نئی چیز پر اسلام کا لیبل لگا کر اس کو جائز اور صحیح بنانے کا عمل صحیح نہیں ہوگا بلکہ یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ وہ اضافہ اسلام کے اعتقادی، شرعی، اخلاقی اور روحانی نظام سے ہم آہنگ ہے یا نہیں۔ اگر اس کے مطابق ہے تو اسے اختیار کیا جائے گا اور اگر اس سے الگ ہے تو اسے رد کر دیا جائے گا۔

اسلامی شریعت کی اصل خصوصیت عدل ہے۔ مشہور مفکر، فقیہ، محدث اور سیرت نگار علامہ ابن القیم (متوفی 751ھ) کے مطابق شریعت کے تمام احکام مبنی بر عدل ہیں۔ شریعت سراپا عدل ہے۔ جہاں شریعت ہے وہاں عدل ہے۔ جہاں عدل ہے وہاں شریعت ہونی چاہیے، اور جہاں عدل نہیں ہے وہاں شریعت نہیں ہوسکتی۔ بالفاظ دیگر اگر کوئی شخص شریعت کے احکام کی ایسی تعبیر کرتا ہے جس کے نتیجے میں عدل قائم نہیں ہوتا تو وہ تعبیر نظرثانی کی محتاج ہے۔

اوپر مقاصد شریعت کے باب میں بعض اسلامی مفکرین اور مجتہدین کی جن آراء کا

ذکر کیا گیا ہے اس سے شریعت اسلامی کا اصل مزاج سمجھا جاسکتا ہے اور اس پس منظر میں اسلام میں انسانی حقوق کو جاننا اور سمجھنا آسان ہوگا۔

عصر حاضر کے عظیم اسلامی مفکر سید قطبؒ نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''اسلام میں عدل اجتماعی'' میں انسانی حقوق کے باب میں اسلام کے تین رہنما اصولوں کا ذکر کیا ہے:

(1) مطلق اور مکمل آزادئ ضمیر
(2) عمومی اور کلی انسانی مساوات
(3) دائمی ہمہ گیر مضبوط اجتماعی نظام کفالت

یہ تینوں بنیادی اصول وحدت انسانی کے وہ تین پہلو ہیں جو ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں اور ان کے اختلاط و اجتماع سے ہی پورا اسلامی نظام بنتا اور پروان چڑھتا ہے۔ پہلے اصول کے تحت تمام انسانوں کو مکمل اور پوری آزادی حاصل ہے اور اس پر کوئی عقیدہ جبراً تھوپا نہیں جائے گا۔ انسانوں کے درمیان کسی طرح کا تفاوت و امتیاز قابلِ قبول نہ ہوگا اور ہر شخص کی انفرادی آزادی اور مساوی حقوق کا احترام کرتے ہوئے اس کی عزتِ نفس کی حفاظت کی جائے گی اور کسی حال میں اس کو محتاج و مضطرب نہیں چھوڑا جائے گا، جس میں وہ اپنی عزتِ نفس کا سودا کرنے یا اپنی آزادی گروی رکھنے پر مجبور ہوجائے یا اسے اپنے ضمیر کے خلاف کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا پڑے جو اسے گوارہ نہ ہو۔ یعنی انسانی شرف و آزادی جو اللہ کا خلیفہ ہونے کے ناطے اسے حاصل ہے اس میں کوئی چیز مانع نہ ہو۔

فقہائے اسلام نے بڑی محنت اور جانکاہی سے یہ تمام اصول اور ضوابط طے کیے ہیں جن کے ذریعہ انسانی حقوق کو حاصل قائم اور مستحکم رکھا جاسکتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ، ابنِ قیمؒ اور شاطبیؒ نے اصولی طور پر مندرجہ ذیل چھ بنیادی حقوق کا ذکر کیا ہے جن میں مجموعی طور پر انسانی زندگی کے تمام پہلو آجاتے ہیں:

(1) حق الحیات: یعنی عزت کے ساتھ جینے کا حق۔

(2) حق النسل: یعنی احترام آدمی، نسل کی حفاظت، خاندان اور معاشرہ کی حفاظت کا حق۔

(3) حق المال: یعنی ذاتی ملکیت اور ذرائع پیداوار کے حق کا احترام۔

(4) حق الحریہ: یعنی انسانی آزادی کا حق، قانون کی حکمرانی اور قانون کے سامنے برابری کا حق یعنی ایک ذمہ دار اور جوابدہ حکومت جو انسانی آزادی کا التزام و احترام کرتی ہے۔

(5) حق الکرامۃ: یعنی انسانی شرف، ضمیر کی آزادی، عقیدے اور اظہار خیال کی آزادی، انسانی شرف و کرامت کے لیے ان آزادیوں کا احترام ضروری ہے۔

(6) حق العلم: علم اور حصولِ علم کی آزادی اور علم نافع سے مستفید ہونے کا حق۔

اب اگر ہم ان باتوں کو انسانی حقوق کے ابواب کے طور پر دیکھیں تو اس کی بنیاد پر وہ تمام حقوق مرتب کیے جاسکتے ہیں جو انسان کے حق کے طور پر معروف اور مشہور ہیں اور جس میں جیسے جیسے انسانی علم وشعور میں اضافہ ہورہا ہے اور جمہوری ادارے مضبوط ہورہے ہیں، نیز جوابدہ حکومت کا تصور اور واضح ہوتا جارہا ہے، اس میں دن بدن وسعت پیدا ہورہی ہے۔

آپ سب جانتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل دین ہے۔ لہٰذا جب آپ کوئی موضوع اور مقصد متعین کرکے قرآن وسنت سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیں گے تو قرآن کے کتابِ مبین اور مکمل دین ہونے پر آپ کا ایمان پختہ ہوجائے گا۔ لہٰذا یہ محض کوئی قیاس و استنباط یا اجتہادی عمل نہیں ہے بلکہ وہ منصوص ہدایات ہیں جو واضح الفاظ میں قرآن و حدیث میں موجود ہیں جن کو عنوان وار نیچے پیش کیا جارہا ہے تاکہ اسلام میں انسانی حقوق کا تصور پوری طرح واضح اور مبرہن ہوکر تمام لوگوں کے سامنے آجائے۔ ہم تمام احکامات و ہدایات کا ذکر نہیں کریں گے بلکہ امر واقعہ کو واضح کرنے کے لیے صرف ایک یا دو آیت یا ایک دو حدیث تک ہی اکتفا کریں گے تاکہ ان باتوں کو اختصار کے ساتھ سمجھنا آسان ہوجائے۔

(1) تحفظ جان کا حق

انسان کے بنیادی حقوق میں جان کی حفاظت کا حق یعنی (Right to Life) سب سے پہلا اور بنیادی حق ہے۔ تمام دوسرے حقوق اسی حق سے نکلے ہیں۔ اس لیے اسلام نے انسانی جان کو سب سے محترم اور مکرم قرار دیا ہے۔ قرآن کے بقول جس نے کسی انسان کو ناحق قتل کردیا اس نے گویا پوری انسانیت کو قتل کردیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے پوری انسانیت کی جان بچائی۔ (المائدۃ:32) اس طرح کسی انسان کا ناحق قتل کرنا، کسی مومن کا قتل کرنا، اولاد کا قتل کرنا، لڑکی کا قتل کرنا، اپنی جان لینا، کسی ذمی، غیر مسلم بچے، قیدی، عورتیں، بچے، معذور اور مذہبی لوگوں کو مارنا سب حرام اور ممنوع ہیں۔ اسلامی قانون کے تحت قتل عمد کے مجرم سے قصاص، جہاد فی سبیل اللہ کے مزاحم لوگوں سے جنگ، حکومت اسلامی کے خلاف بغاوت، شادی شدہ عورت یا مرد کو زنا کی سزا، ارتداد کی سزا اور شاہ راہوں پر ڈاکہ زنی، ان چھ صورتوں کے علاوہ باقی تمام صورت میں انسانی جان کی حرمت ساقط نہیں ہوتی۔

(2) تحفظ ملکیت (Right to Property)

انسانی جان کے تحفظ کے بعد دوسرا بڑا حق تحفظ ملکیت کا حق ہے۔ اسلام نے جو تمام حقوق و واجبات ایک فرد پر عائد کیے ہیں وہ اس وقت تک پورے نہیں ہوسکتے جب تک اس کو ملکیت کا حق نہ دیا جائے نیز اس حق کو آزادانہ استعمال کا حق نہ ہو۔ اس لیے اسلام حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے سبھی افراد کو جائز طریقے سے دولت حاصل کرنے، اس کو جائز امور میں خرچ کرنے، نفع بخش کاروبار میں لگانے، اپنی جائداد کو کسی اور کو منتقل کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کا حق عطا کرتا ہے۔ حکومت وقت کو کسی کی جائداد کو بلا معاوضہ لینے کا حق نہیں ہے۔

(3) تحفظ آبرو(Right to Dignity)

اسلام ہر انسان کو اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کا حق دیتا ہے۔ اس معاملہ میں وہ

اس قدر حساس ہے کہ کسی کا مذاق اڑانا، غیبت کرنا، بہتان لگانا، گالی گلوچ کرنا، کسی کی عزتِ نفس پر حملہ کرنا، اس کی تذلیل وتوہین کرنا، مارنا پیٹنا، کسی پاک دامن مرد وعورت پر تہمت لگانا سب ممنوع اور حرام ہیں۔ زبان، ہاتھ، اور ارادے سے کسی کی عزت سے کھیلنا گوارانہیں ہے۔ ایسا کرنا خدا اور خلق دونوں کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور گناہ ہے جس سے بچنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔

(4) نجی زندگی کا تحفظ (Right to Privacy)

اسلام میں لوگوں کی نجی زندگی کو مکمل تحفظ فراہم کیا گیا ہے اور گھروں کی چہار دیواری کو محفوظ قلعہ کی حیثیت دی گئی ہے۔ جس میں کسی کو بھی مداخلت کا حق نہیں ہے۔ لہٰذا کسی کے گھر میں بلا اجازت گھسنا، ٹوہ لگانا، کسی کے عیب ڈھونڈنا، کسی کی جاسوسی کرنا وغیرہ جائز نہیں ہے، جب تک کوئی ایسی ضرورت نہ پیش ہو جس سے مفادِ عامہ پر ضرب پڑتی ہو، اس وقت تک ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

(5) شخصی آزادی کا تحفظ (Right to Individual Freedom)

انسان آزاد اور محترم پیدا کیا گیا ہے، لہٰذا اس کی شخصی آزادی پر کوئی قدغن نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ اس طرح کھلی عدالت میں کوئی جرم ثابت کیے بغیر قید نہیں کیا جاسکتا ہے۔ شکوک وشبہات کی بنیاد پر لوگوں کو گرفتار کرنا اور عدالتی کارروائی کے بغیر جیلوں میں ڈال دینا اسلام میں جائز نہیں ہے۔

(6) عملِ غیر سے برأت (Exonerdtion from Others Deeds)

اسلام میں ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے لہٰذا کسی اور کے جرم میں کسی دوسرے کو سزا نہیں دی جاسکتی ہے۔ جس پر کوئی جرم ثابت ہوتا ہے وہی سزا کا مستحق ہوگا۔ اس کے ماں باپ، بھائی بہن، بیوی اولاد یا کسی دوسرے رشتہ دار یا ساتھی کو موردِ الزام مان کر اس کو سزا دینے کا اختیار نہیں ہے، جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ ان میں سے کوئی اس جرم

میں شریک تھا۔ قرآن کے الفاظ میں ظالموں کے سوا کسی اور پر دست درازی روا نہیں ہے۔ (البقرۃ:193)

(7) ظلم کے خلاف احتجاج کا حق(Right to Protest)

اسلام نے نہ تو ظلم کرنے اور نا ظلم سہنے کی ہدایت دی ہے۔ بلکہ ظالم حکمراں کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو سب سے بڑا جہاد قرار دیا ہے۔ لہٰذا احتجاج کا حق ایک بنیادی حق ہے۔ اسلام شہریوں کو یہ حق دیتا ہے کہ ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں اور ظالم کو ظلم سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ اس میں ایک دوسرے کی مدد واجب ہے۔

(8) آزادی اظہارِ رائے (Right to Expression)

اسلام اپنے ماننے والوں کو اظہارِ رائے کی آزادی عطا کرتا ہے اور اس کے ذریعہ بھلائی کو عام کرنے اور برائی کو روکنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ کام اظہار رائے کی آزادی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح اسلام اظہارِ رائے کی آزادی کو معلوم، متعین اور معروف اقدار کا پابند بناتا ہے تاکہ اظہارِ رائے معاشرے میں فواحش کے فروغ کا ذریعہ نہ بنے۔

(9) آزادیِ ضمیر و اعتقاد(Right to Faith & conscience)

اسلام نے ہر شخص کو ضمیر و اعتقاد کی آزادی عطا کی ہے اور دین کے معاملہ میں کسی جبر کی اجازت نہیں دی ہے۔ (البقرۃ:256) لہٰذا دعوت دین میں جبر کی اجازت نہیں ہے بلکہ ہر شخص کو اپنا عقیدہ چننے اور اس پر قائم رہنے کی آزادی ہے۔ اسلام کا اصول عام ہے کہ تمہارا دین تمہارے لیے اور ہمارا دین ہمارے لیے۔ اس لیے نہ تو مسلمانوں کو غیر مسلموں پر جبراً اپنا عقیدہ تھوپنے کی اجازت ہے اور نہ غیر مسلم کو مسلمانوں پر اپنا عقیدہ ماننے کے لیے دباؤ ڈالنے کی اجازت ہے۔ اسلام کی نظر میں ہر دو صورت ناقابلِ قبول ہے۔

(10) حق مساوات(Right to Equality)

اسلام کی رو سے تمام انسان ایک خدا کے بندے اور ایک ماں باپ کی اولاد ہیں

لہٰذا کسی عربی کو عجمی پر کسی گورے کو کالے پر اور کسی کو بھی اپنے حسب و نسب کی بنا پر کوئی بڑائی حاصل نہیں ہے۔ اسلامی معاشرے میں صرف خدا بڑا ہے باقی سب برابر ہیں۔

(11) حصول انصاف کا حق (Right to Justice)

اسلام کا بنیادی مقصد ہر طرح کے ظلم کا خاتمہ اور عدل و اعتدال کا قیام ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان کو بحیثیت فرد اور پوری امت مسلمہ کے بحیثیت جماعت عدل کا علم بردار بننا چاہیے، دوست دشمن، امیر غریب، اجنبی اور رشتہ دار ہر کسی کے معاملے میں اور ہر معاملہ میں عدل پر قائم رہتے ہوئے فیصلہ کرنا چاہیے۔ جو کوئی اس سے روگردانی کرے گا وہ ظالم قرار پائے گا اور اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔ عدالتوں کو اس معاملے میں پوری طرح آزاد اور خود مختار ہونا چاہیے تاکہ وہ بے لاگ فیصلہ دے سکیں اور مظلوموں کو انصاف ملے۔

(12) معاشی تحفظ کا حق (Right to Livelihood)

اسلام ہر شخص کو معاشی تحفظ فراہم کرتا ہے اور اسے اپنی عزت نفس کے ساتھ اپنی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کا حق عطا کرتا ہے۔ یتیم، مسکین، بیوہ، کمزور، معذور، بیمار، ضعیف، مسافر، بے کار، نادار وغیرہ۔ جو بھی کسی وجہ سے اپنی ضرورت کا کفیل نہ ہو، اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ اس کا پتہ لگا کر بن مانگے اس کی ضرورت پوری کرے اور اس کو بھرپور معاشی تحفظ فراہم کرے تاکہ وہ جرم، گناہ اور غلط کاری سے بچتے ہوئے اپنی زندگی گزار سکے، اگر حکومت ایسا کرنے میں کوتاہی برتتی ہے اور اس وجہ سے لوگ مجبوراً جرم اور گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں ، اس صورت میں شریعت کے تعزیری قوانین کا اطلاق نہیں ہوگا۔ شریعت کے تعزیری قوانین کے اطلاق سے پہلے معاشی تحفظات فراہم کرنا ضروری ہے۔ اسلام نے بعض جرائم کے انسداد کے لیے سخت سزائیں تجویز کی ہیں جس پر اکثر لوگ منہ آتے ہیں، مگر ان سزاؤں کے نفاذ سے پہلے اس نے جن تحفظات کو ضروری

قرار دیا ہے اگر اُن کا التزام نہیں کیا جاتا تو پھر یہ سزائیں ساقط ہوجائیں گی۔

(13) معصیت سے اجتناب کا حق (Right to Chastity)

ریاست کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی شہری کو ایسا حکم دے جس میں خدا کی نافرمانی ہوتی ہے یا گناہ لازم آتا ہے۔ اگر ریاست یا اس کا کوئی فرد ایسا کوئی حکم دیتا ہے جس سے خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی ہوتی ہے تو ایک مسلمان شہری کو حق ہے کہ ریاست کا یہ حکم نہ مانے کیونکہ ایسا کرنا جبر ہے اور اسلام جبر کی اجازت نہیں دیتا۔ خاص طور سے اس صورت میں جبکہ وہ گناہ ہو۔ جیسے پبلک آرڈر کو قائم رکھنے کے لیے بعض اوقات ریاست شہری حقوق کی تحدید کردیتی ہے یا کچھ وقتوں کے لیے اسے ملتوی اور منسوخ کردیتی ہے، اسی طرح شہریوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ جس کام کو کرنے میں گناہ لازم ہوتا ہے تو ریاست کسی شہری کو ایسے کسی کام کے ارتکاب پر مجبور نہیں کرسکتی ہے اور ریاست ایسا کرے تو شہریوں کو اس سے انکار کا حق ہے۔ حضورؐ کی مشہور حدیث ہے جس کا مفہوم ہے: ''خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں۔'' اسلام شہریوں کو یہ امتیازی حق عطا کرتا ہے جو کسی اور نظام میں میسر نہیں ہے۔

(14) آزادیٔ تنظیم و اجتماع (Right to Association & Assembly)

اسلام اپنے ماننے والوں کو منکرات کے ازالے اور معروفات کے قیام کے لیے تنظیم و اجتماع کا حق دیتا ہے۔ مگر معصیت، گناہ، فواحش کے پھیلاؤ اور فساد فی الارض کی اجازت نہیں ہے۔ پرامن اور جمہوری طریقے سے تمام جائز اور مفید امور کے لیے مجتمع ہوکر جدوجہد کرنے کی اجازت ہے۔ جو چیز فرد کے لیے گناہ اور ناجائز ہے، وہی چیز جماعت کے لیے گناہ اور ناجائز ہوگی۔ لہٰذا تنظیم و اجتماع کی آزادی کی اجازت کے ساتھ ان باتوں پر دھیان دینا ضروری ہوگا ورنہ معاشرہ شروفساد اور ظلم و گناہ سے بھر جائے گا جس کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوگا۔

(15) سیاسی زندگی میں شرکت کا حق (Right to Participation in Politics)

اسلام تمام انسانوں کو اللہ کا خلیفہ، محترم و مکرم نیز مساوی مانتا ہے۔ اسلام میں کوئی مراعات یافتہ گروہ نہیں ہے جس کو منصب خلافت یا امور مملکت کی ذمہ داری عطا کی گئی ہے۔ جو شخص بھی اس منصب کی اہلیت رکھتا ہے، امانت، دیانت، صداقت، شجاعت، فراست اور اعلیٰ علم و اخلاق سے متصف ہے، اس عہدے کا امیدوار ہوسکتا ہے اور اس کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ اسلام جس اجتماعی نظام کا خاکہ پیش کرتا ہے وہ سرتاسر شورائی ہے، لہٰذا صاحب الرائے لوگوں کے ذریعہ ہی وہ نظام چلایا جائے گا۔ اس طرح سیاست اور ریاست کے تمام مناصب پوری طرح کھلے ہیں جس پر آزادانہ انتخاب کے ذریعہ امیر اور دیگر ذمہ داران چنے جائیں گے۔ فیصلے کھلی فضا میں تنقید، اختلاف، اور اظہارِ رائے کی آزادی کے ساتھ باہمی مشورے سے ہوں گے اور لوگوں کو امورِ مملکت سے واقفیت حاصل کرنے کا پورا اختیار ہوگا تاکہ عوام جانکاری کی بنیاد پر صحیح فیصلہ لینے کے اہل ہوں۔

(16) آزادی نقل وحرکت وسکونت (Right to Movement & Habitation)

اسلام کی رو سے یہ پوری دنیا خدا کی مِلک ہے۔ لہٰذا ایک انسان کو فطری حق حاصل ہے کہ وہ جہاں چاہے جائے اور جہاں چاہے قیام کرے۔ آج کے دور میں دنیا کے تمام ملکوں نے اپنی سرحدیں کھینچ رکھی ہیں، جس کی وجہ سے لوگوں کا ایک ملک سے دوسرے ملک جانا اور وہاں قیام کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ ان پر بہت سی مصنوعی پابندیاں عائد کردی گئی ہیں۔ یہ ایک عملی مسئلہ ہے لیکن اسلام کا اصولی موقف یہی ہے۔ تاہم ایک ملک کے اندر اس ملک کے تمام شہریوں کو بلا روک ٹوک ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے اور اپنی پسند کی جگہ پر قیام کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ اسلام اس آزادی کے حق میں ہے اور کسی کو بھی ظلماً اور جبراً بے خانماں کرنے اور ان کی ان کے گھروں سے نکالنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کسی کے ساتھ ایسا ظلم ہوتا ہے تو ان کو وہاں سے ہجرت کرنے کا حق ہے اور جہاں وہ

ہجرت کر کے جارہے ہیں وہاں ان کو پناہ دینا چاہیے۔

(17) حق اجرت و معاوضہ (Right to Fare Wages & Compensation)

اسلام کسی سے بیگار لینے، اس کی سکت سے زیادہ کام لینے، اس کو معقول اجرت نہ دینے اور اس کے ساتھ برا سلوک کرنے سے سختی سے منع کرتا ہے۔ اور ہر شخص کو صحیح پوری اور بروقت اجرت ادا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مزدوروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے اور ان کی سکت اور صلاحیت کے مطابق ہی کام لینے کی اجازت دیتا ہے۔ اسی طرح کسی کا کوئی مال، جائداد بلا معاوضہ جبراً نہیں لیا جاسکتا ہے۔ اگر کسی کی کوئی چیز لینا ناگزیر ہے تو اس کا معقول معاوضہ دینا ہوگا۔ اجرت اور معاوضہ کے باب میں اسلام کی تفصیلی تعلیمات تمام مستند احادیث و آثار میں موجود ہیں جس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی پتہ چل جائے گا کہ اسلام اس معاملے میں کتنا حساس ہے، یہاں صرف ایک حدیث کا مفہوم نقل کیا جارہا ہے، جس سے اسلام کی اس بارے میں تاکید سمجھ میں آجائے گی۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تین آدمیوں کا دشمن ہوگا ایک وہ جس نے اللہ کا نام لے کر عہد کیا اور پھر اس سے پھر گیا، دوسرا جس نے کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اس کا مول وصول کیا اور تیسرا جس نے مزدور سے پوری محنت لی اور پھر اس کی اجرت ادا نہیں کی۔ اجرت کا یہ تعین وقت، حالات، قیمت اور اس وقت کی عملی صورتحال کے لحاظ سے ہوگا۔

یہ ہے اسلام میں بنیادی انسانی حقوق کا تصور جس میں تمام انسان اور سارے مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ جو لوگ غیر مسلم ہیں یعنی جن کا دین مسلمانوں سے الگ ہے ان کو اسلام نے پوری شخصی اور مذہبی آزادی دی ہے، جس کے ذریعے وہ اپنی نسلوں اور دین و تہذیب کی مکمل حفاظت کر سکتے ہیں نیز ان کو فروغ دے سکتے ہیں۔

■❖■

مسلمان ملکوں میں انسانی حقوق کا مسئلہ

دنیا کے ان ملکوں میں جہاں اس وقت مسلمانوں کی اکثریت ہے اکثر اخبارات اور ٹیلی ویژن میں خبریں اورتبصرے چھپتے ہیں اور مناظر دکھائے جاتے ہیں جہاں ان جگہوں پر بسنے والی غیر مسلم قوموں کے ساتھ زیادتیاں ہوتے دکھائی جاتی ہیں۔ اگر یہ واقعات صحیح ہیں اور کسی جھوٹے پروپیگنڈہ مشنری کا حصہ نہیں ہیں تو بے حد تشویشناک اور شرمناک ہیں جن پر وہاں کی حکومت اور اربابِ حل وعقد کوفوری توجہ دینی چاہیے کیونکہ اس سے نہ صرف اس ملک کی شبیہ خراب ہوتی ہے بلکہ اس سے اسلام اور اسلامی تہذیب پر بھی بٹہ لگتا ہے جبکہ اصولاً اور عملاً اسلام اس طرح کی حرکات کی قطعی اجازت نہیں دیتا ہے۔ لہٰذا اگر کہیں ایسا ہوتا ہے تو اس ملک اور معاشرے کا قصور ہے۔ اسلام کا ان کی ان غلط حرکتوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اگر چہ غیر مسلم دنیا کو یہ فرق سمجھنا مشکل ہوگا کیونکہ کوئی دین اس کے ماننے والوں سے ہی جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ مگر آج معلوم دنیا پر یہ بات اچھی طرح واضح ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت اگر چہ اسلام سے جذباتی رشتہ ضرور رکھتی ہے لیکن عملی طور پر اسلام سے ان کا رشتہ بہت کمزور ہے اور مسلمان معاشرہ خود صحیح طور پر اسلام پر عامل نہیں ہے۔ مسلمان معاشرے میں غیر مسلموں سے یہ ناروا برتاؤ اس کی منہ بولتی تصویر ہے، جس سے اسلام بری الذمہ ہے۔

صرف غیر مسلم آبادی ہی نہیں بلکہ بیشتر مسلمان ملکوں میں وہاں کی عام عوام بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ انسانی حقوق کے نام پر ان کو جینے، سانس لینے، کھانے پینے، شادی بیاہ کرنے، جمعہ اور جماعت کی آزادی تو میسر ہے مگر وہ اربابِ حل وعقد کے خلاف ان کی تمام تر زیادتیوں کے باوجود زبان نہیں کھول سکتے ہیں۔ وہاں کی عدالت، پریس اور سول سوسائٹی سب پابندیوں کے گھیرے میں ہیں۔ بیشتر مسلمان ملکوں میں یا تو بادشاہت ہے یا مطلق العنان آمریت ہے یا فوجی ڈکٹیٹر شپ ہے۔ اس صورت میں مسلمان ملکوں میں بالعموم انسانی حقوق کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے جس سے ساری دنیا میں ان کی جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ ان تمام تر سیاہ کارناموں کو اسلام کے نام پر انجام دیا جاتا ہے جس سے غیر مسلم دنیا کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کی بہت ہی افسوسناک اور ہیبت ناک تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ مصر، بنگلہ دیش، پاکستان، افغانستان، شام، لیبیا، صومالیہ اور دیگر تمام ملکوں سے آئے دن جس طرح کی خبریں موصول ہوتی ہیں اس سے ان ملکوں اور معاشرے کی ایسی ہیبت ناک تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جس کو سننے اور دیکھنے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مسلمان ملکوں میں جس خوفناک دہشت گردی کی وارداتیں روز کا معمول بن گئی ہیں، وہ اس معاشرے کی اندرونی کشمکش اور بے چینی کی غماز ہیں۔ جب لوگوں کو اپنے جائز غم وغصہ کے اظہار کا کوئی پرامن راستہ میسر نہیں ہوتا ہے تو لوگ اس طرح کی انتہا پسندانہ کارروائیاں کرنے لگتے ہیں۔ بہرحال دہشت گردی انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے لہٰذا اس کا کوئی جواز نہیں ہے جس کی کسی صورت میں تائید نہیں کی جاسکتی، کسی ظلم کا بدلہ کسی بے گناہ کے خون سے نہیں لیا جاسکتا ہے۔ دہشت گردی اس لیے دہشت گردی کہی جاتی ہے کیونکہ اس سے معصوم لوگوں کو جانیں جاتی ہیں۔

اس وقت آپ اگر دنیا کے نقشہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ایشیا اور افریقہ کے قریب ایک درجن مسلمان ملکوں میں خانہ جنگی کی کیفیت پائی جاتی ہے اور ان ملکوں میں حکومت اور عوام اور عوام کے مختلف گروہوں کے درمیان تصادم وکشمکش جاری ہے، جس کے

نتیجے میں لاکھوں لوگ خود اپنے اپنے ملکوں میں پناہ گزینوں کی زندگی جی رہے ہیں اور جان پر کھیل کر دوسرے ملکوں میں بھاگ کر پناہ لے رہے ہیں۔ اس صورتحال میں عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار اور اپاہج لوگ سب سے زیادہ ظلم و استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کی حالیہ رپورٹ کے مطابق دنیا کی 80% پناہ گزیں آبادی مسلمان ہے جو مختلف ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور ہیں اور عالمی امدادی ایجنسیوں کے سہارے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس صورت حال سے جب ان ملکوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں تمام تر دباؤ اور پریشانیوں کے باوجود حالات قدرے بہتر نظر آتے ہیں۔ اس طرح ان نام نہاد مسلمان ملکوں میں نہ صرف مسلمانوں کے جان و مال، عزت و آبرو پر ضرب پڑ رہی ہے بلکہ اسلام بھی سب سے زیادہ مظلوم و مقہور ہے۔ اس وقت اسلام کو جتنا خطرہ نام نہاد پشتینی اور خاندانی مسلمانوں سے ہے جو تہذیبی طور پر مسلمان عوام کا حصہ ہیں مگر اصلاً اور ایماناً انھوں نے اسلام کا قلادہ اپنی گردن سے اتار کر پھینک دیا ہے، انھوں نے قولی طور پر اسلام چھوڑنے کا اعلان تو نہیں کیا ہے مگر عملی طور پر وہ بڑی حد تک اسلام چھوڑ چکے ہیں۔ اس لیے مسلمان ملکوں میں انسانی حقوق کا مسئلہ سب سے زیادہ سنگین اور ناقابلِ بیان حد تک افسوس ناک ہے۔ یقیناً عوامی سطح پر کچھ مستثنیات ہیں اور ہوں گے مگر یہ محض مستثنیات ہیں جن سے عمومی صورتحال پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ اس لیے ہم موجودہ عالمی تناظر میں مسلمان ملکوں کو انسانی حقوق کے معاملہ میں ایک کالے دھبے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس طرح اسلامی اور انسانی قدروں کی پامالی کو دیکھ کر ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ ان ملکوں میں اسلام کا کام کرنے والے جو ادارے اور افراد ہیں ان کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنے اپنے دائرۂ اثر میں عام عوام بالخصوص مظلوموں اور اقلیتوں کی داد رسی میں کوئی کسر نہ چھوڑیں تاکہ لوگوں کے سامنے دوسری تصویر بھی ابھر کر آئے اور لوگ صحیح اسلام اور اس کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوسکیں۔

کوئی ملک و معاشرہ کتنا اسلامی اور کتنا غیر اسلامی ہے یہ محض زبانی دعوؤں کی بنیاد

پر طے نہیں ہوگا بلکہ اس کے کچھ معروضی پیمانے ہمارے پاس موجود ہیں جن کی بنیاد پر ہم ان کی موجودہ صورتحال کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ چند پیمانے مندرجہ ذیل ہیں:

(1) اس ملک و معاشرے کے خواص وعوام میں خدا کا خوف اور آخرت کی جوابدہی کا احساس کتنا ہے؟ یہ چیز ان کے روز مرہ کے معاملات سے اچھی طرح جانچی پرکھی جاسکتی ہے۔

(2) اس ملک اور معاشرے میں رسول کی شخصیت سے کیسی محبت اور کتنا احترام پایا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ حضورؐ کی سنتوں اور سیرت کی اتباع اور التزام سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

(3) اس معاشرے میں عبادات اور اسلامی اخلاقیات کا کس درجہ اہتمام کیا جاتا ہے۔

(4) اس معاشرے میں عورتوں کی عصمت وحرمت اور ان کے حقوق اور اختیارات کا کتنا اہتمام اور التزام کیا جاتا ہے۔

(5) اس معاشرے میں جرائم کی مقدار اور نوعیت کیسی ہے اور انصاف کا نظام کیسا ہے؟

(6) اس معاشرے میں بزرگوں کی خبر گیری اور احترام کی نوعیت کیا ہے؟

(7) اس معاشرے میں کمزوروں، معذوروں اور دیگر پس ماندہ طبقات کی حقوق پروری کیسے اور کتنی ہوتی ہے؟

(8) اس ملک اور معاشرے میں مذہبی اقلیتوں کو اپنے دین و مذہب، معبد ومسکن، اپنی نسلوں کی حفاظت اور عزت و برابری کے ساتھ جینے اور کام کرنے کے کتنے مواقع میسر ہیں؟

(9) اس معاشرے میں نوجوانوں کی شخصیت و کردار اور ان کی تعمیری تخلیقی صلاحیتیوں کی آبیاری کتنی اور کیسی ہورہی ہے؟

(10) اس معاشرے میں بچوں کی صحت مند ماحول میں کیسی نشو ونما ہو رہی ہے؟

یہ سب وہ پیمانے ہیں جس سے ایک جدید مہذب اسلامی معاشرے کی پرکھ کی جاسکتی ہے۔ اگر یہ موجود ہیں تو اس کو ایک اسلامی ملک اور معاشرہ قرار دیا جاسکتا ہے اور اگر موجود نہیں ہیں تو چاہے وہ اپنے دستور میں خود کو اسلامی مملکت کیوں نہ لکھیں وہ اسلامی ملک اور معاشرہ نہیں ہیں اگر آپ اس فہرست پر غور کریں تو اس کا براہِ راست اور بالواسطہ تعلق انسانی حقوق سے ہے۔ اسلام دراصل دو چیزوں سے عبارت ہے۔ ایک کا تعلق حقوق اللہ سے ہے جس میں اللہ کو ایک ماننا اور زندگی کے جملہ معاملات میں اس کی عبادت و اطاعت کرنا، اللہ کا خالص حق ہے، اس میں جو لوگ کسی اور کو شریک کرتے ہیں وہ خدا کا حق مارتے ہیں جس کی سزا اللہ کے یہاں مقرر ہے۔ دوسرا حق بندوں کا ہے۔ بندوں میں اللہ کی تمام مخلوقات شامل ہیں۔ اس کائنات میں جو کچھ ہے سب اللہ کی مخلوق ہے وہ سب اللہ کے بندے ہیں اور ان کا ایک دوسرے پر متعین حق ہے۔ ان حقوق کو جاننا اور ان کی پاسداری کرنا دراصل یہی اسلام ہے۔

ہمارے علم کی حد تک چونکہ بیشتر مسلم ملکوں میں جمہوریت نہیں ہے، لہٰذا وہ ممالک جمہوری آزادی کی برکات سے محروم ہیں۔ جہاں کچھ نام نہاد جمہوریت پائی بھی جاتی ہے وہاں جمہوری اداروں کا فقدان ہے، جس کی وجہ سے ان ملکوں میں جمہوریت کی جڑیں اور جمہوری روایات بہت کمزور ہیں جو ایک جھٹکے میں اکھڑ جاتی ہیں۔ اس وقت عالمی طور پر اسلام خود اپنے ملکوں اور معاشرے میں اجنبی ہے۔ جن ملکوں اور معاشرے میں کھلے عام دن رات اسلامی احکامات اور اصولوں کی پامالی ہوتی ہے ان ملکوں میں اگر انسانی حقوق کی پامالی ہو رہی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے بلکہ ایک فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ ان ملکوں میں انسانی حقوق کی پامالی کا سارا الزام اسلام کے سر آتا ہے اور وہاں اسلام کا کام کرنے والے جو ادارے اور افراد ہیں ان کو عام انسانی برادری کے سامنے بطور مجرم پیش کیا جاتا ہے، گویا یہی لوگ ہیں جو انسانی حقوق کی پامالی کے ذمہ دار ہیں۔

بالخصوص عورتوں اور دیگر مذہبی اقلیتوں کے حقوق تلفی کا سارا الزام اسلام پسندوں پر آتا ہے۔ ہمارے پاس ایسی آزادانہ تحقیق کا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے یہ پتا لگایا جاسکے کہ واقعتاً اس الزام میں کتنی سچائی ہے۔ اسلامی تعلیمات کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اگر واقعی کوئی اسلام پسند گروہ ہے تو اس پر یہ سارے الزامات بے بنیاد ہوں گے کیونکہ وہ اسلام کی عمومی تعلیم کے خلاف ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگوں نے سازش کے طور پر اسلام کو بدنام کرنے کے لیے اسلام کے نام پر کچھ ایسے ادارے قائم کرر کھے ہوں جو اس طرح کی حرکات میں ملوث ہوں تاکہ ثبوت کے ساتھ دنیا کے سامنے اسلام کی غلط تصویر پیش کرنے کا موقع مل سکے۔ بہرحال اسلام کی پندرہ سوسالہ تاریخ میں ایسی بہت سے مثالیں ملتی ہیں جبکہ کچھ شرارت پسند گروہ نے اسلام کا جامہ پہن کر محض دھوکہ دینے کے لیے اور اسلام کو بدنام کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے پاس قرآن وسنت اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں لہٰذا ہم آسانی سے سچ اور جھوٹ کا پتہ لگا سکتے ہیں، اس لیے محض اسلامی نام اور کسی کے جبہ و دستار سے دھوکہ کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس قرآن و وسنت کی کسوٹی موجود ہے۔ جس سے ہم آسانی کے ساتھ کھرے کھوٹے کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ اس وقت اسلامی دنیا ہو یا غیر اسلامی دنیا ساری دنیا میں بڑے پیمانے پر اسلام کے نام پر کھوٹے سکے کا چلن عام ہے، اس لیے دنیا کو اسلام کے سمجھنے میں غلط فہمی ہورہی ہے۔ ہم پوری قوت سے اعلان کرتے ہیں کہ مسلمان ملکوں اور معاشرے میں جو بڑے پیمانے پر انسانی حقوق کی پامالی دیکھنے کومل رہی ہے وہ اسلام نہیں ہے بلکہ خلافِ اسلام ہے جس سے ہم برأت کا اعلان کرتے ہیں۔ اسلام انسانی حقوق اور انسانی حسیت (Human Sensibilities) کا احترام کرتا ہے۔ لہٰذا جہاں بھی اور جس کے ذریعہ بھی اس کا احترام و اہتمام نہیں ہوتا وہ اسلام نہیں ہے چاہے وہ مسلمان حکمراں کے ذریعہ ہو یا طبقہ علماء کے ذریعہ یا پھر نام نہاد دانشوروں اور عام عوام کے ذریعہ۔ یہ مسلمانوں کا قصور مانا جائے گا مگر اسلام کا قصور ہرگز تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ لوگوں کو اس سے باخبر رہنے اور باخبر کرنے کی

ضرورت ہے۔ میں یہاں اس بات پر اس بحث کو ختم کروں گا کہ جس ملک اور معاشرے میں عورتوں کی حرمت اور حقوق محفوظ نہ ہوں اور جہاں دیگر مذاہب کے ماننے والے خود کو محفوظ و مامون محسوس نہ کریں وہ کوئی اور ملک و معاشرہ ہوگا اس کو اسلامی ملک و معاشرہ ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

■❖■

ہندوستان میں مسلمانوں کے انسانی حقوق کا مسئلہ

15/اگست 1947 کو جس نئے ہندوستان کا جنم ہوا وہ کئی معنوں میں سابقہ ہندوستان سے الگ ہے۔ اب اس ملک پر کوئی باہری حکومت نہیں ہے، یعنی اب یہ ایک آزاد خود مختار ملک ہے جس کو اپنی قسمت سنوارنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جواہرلعل نے 15/اگست 1947 کی نصف شب میں جب یونین جیک اتار کر بھارت کا ترنگا پھیرایا تو اس وقت انھوں نے آزاد ہندوستان کی نئی صبح اور نئی بیداری کو Tryst with Destiny قرار دیا۔ ہندوستان کی دوسری خصوصیت یہ سامنے آئی کہ اب نہ اس ملک پر کوئی مسلم اقتدار ہے، نہ ہندو اقتدار ہے اور نہ سکھ اور کرسچین اقتدار ہے بلکہ ہندوستان کے تمام باشندے بلا لحاظ مذہب، رنگ، نسل، زبان، جنس اور علاقہ ایک قوم ہیں اور یہ ان سبھوں کا ملک ہے اور سبھی اقتدار و اختیار میں برابر کے شریک ہیں۔ تیسری بات یہ ابھر کر سامنے آئی اس ملک میں تمام مذاہب کے ماننے والوں کو عقیدہ، عبادت اور دیگر آزادیاں حاصل ہوں گی جس پر وہ بلا روک ٹوک عمل کر سکتے ہیں، مگر ملک کا کوئی مذہب نہیں ہوگا۔ یعنی ملک میں قانون سازی کسی مذہبی کتاب کی بنیاد پر نہیں ہوگی بلکہ ملک کے دستور اور مفادِ عامہ کی بنیاد پر قانون سازی ہوگی۔ حکومت مذہب کے معاملے میں غیر جانبدار ہوگی یعنی حکومت نہ تو کسی مذہب کی حمایت کرے گی اور نہ کسی مذہب کی مخالفت کرے گی بلکہ تمام مذاہب اور ان کے ماننے والوں کا یکساں احترام کرتے ہوئے ان کے درمیان غیر جانبدار ہوگی۔

آزادی کے بعد ہندوستان کو ایک سیکولر سوشلسٹ عوامی جمہوریہ قرار دیا گیا اور 26/جنوری1950 کو ملک کا نیا دستور نافذ کیا گیا جس میں ملک کے تمام شہریوں کو We, the people of Indiaیعنی ہم ہندوستان کے عوام کہہ کر پکارا گیا اور تمام لوگوں کے لیے انصاف، آزادی، برابری اور بھائی چارہ کا اعلان کیا گیا۔ اس طرح ملک کے تمام شہریوں کو برابر کے شہری اور انسانی حقوق عطا کیے گئے، جس کا تفصیلی ذکر 'ہندوستان میں بنیادی حقوق' کے عنوان سے اوپر ہو چکا ہے۔

اگر ہندوستان کے دستور اور قانون کا مطالعہ کیا جائے تو ملک کے تمام شہریوں اور یہاں بسنے والی تمام مذہبی، لسانی، لونی، نسلی اور علاقائی اقلیتوں اور دیگر پسماندہ طبقات مثلاً درج فہرست ذاتوں اور قبائل کو بعض تحفظات اور خصوصی مراعات بھی دیے گئے ہیں تاکہ وہ بے خوف ہوکر برابر کے شہری کی حیثیت سے ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیں۔ اس طرح دستور ہند نہ صرف دنیا کے مروج دستوروں میں سب سے بڑا اور سب سے بہتر ہے بلکہ ہندوستان جیسے متنوع سماج میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ایک بہترین ورکنگ فارمولہ ہے جس کو Unity in Diversity کہا جاتا ہے۔ یہ ہندوستان کا وہ رخ ہے جس کو شاندار اور مثالی کہا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ترقی پذیر ملک ہونے کے باوجود ہندوستان عالمی برادری بالخصوص تیسری دنیا کے نوآزاد ملکوں میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ہندوستان عالمی برادری کا ایک پُر وقار رکن مانا جاتا ہے۔

مگر یہ تصویر کا ایک رخ ہے، دوسرا رخ دوسری تصویر بیان کرتی ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے دستور ساز اسمبلی میں اپنے آخری خطاب میں انتباہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ آپ چاہے جتنا اچھا دستور بنالیں مگر اس کو نافذ کرنے والے ہاتھ اور دماغ ایماندار نہیں ہیں تو یہ اچھا دستور بھی برے لوگوں کے ہاتھوں میں برا ہوجائے گا اور لوگوں کو اس سے مطلوبہ فائدے حاصل نہیں ہوسکیں گے۔ ایک برا دستور بھی اچھے ہاتھوں میں ہو تو وہ دستور کی خامیوں کو دور کرکے اس کی اچھائیوں سے لوگوں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ لہٰذا صرف کاغذ پر

اچھے الفاظ لکھ دینے سے حالات اور معاملات نہیں بدل جائیں گے بلکہ اس کے ایماندارانہ نفاذ کی ضرورت ہوگی، تبھی لوگ اس دستور کی برکات سے مستفیض ہوسکیں گے۔

آج جدید ہندوستان کا المیہ یہ ہے کہ جو لوگ دستور ہند کا حلف لے کر انتظام واقتدار میں آتے ہیں وہ اس دستور کے خلاف عمل کررہے ہیں۔ اس لیے بھارت کا دستور اور اس کا پورا دستوری ڈھانچہ ایک بحرانی دور سے گزر رہا ہے اور دستور کا تقدس پامال ہورہا ہے جس کی وجہ سے قانون کی حکمرانی پر سوال اٹھ رہے ہیں۔ جب کبھی ملک میں قانون کی حکمرانی ختم ہوتی ہے تو اس کا سب سے زیادہ نقصان اقلیتوں، کمزوروں، غریبوں اور پس ماندہ طبقات کو ہوتا ہے۔ جو لوگ طاقتور ہیں تعداد میں زیادہ ہیں، صاحبِ وسائل ہیں وہ اپنے زور وقوت سے اپنا حق حاصل کرلیتے ہیں بلکہ اپنے حق سے زیادہ لینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ قانون کی ضرورت بنیادی طور پر ان کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے جو خود سے اپنا واجبی حق حاصل کرنے میں قاصر ہیں۔مگر جب قانون کی حکمرانی پر ضرب آتی ہے تو اس کا براہِ راست اثر تمام اقلیتوں اور کمزور طبقات پر پڑتا ہے اور وہ تمام تر دستوری ضمانتوں اور تحفظات کے باوجود خود کو خطرے میں گھرا اور ٹھگا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد ملک کی سات دہائیوں کی تاریخ اس امر کی منہ بولتی تصویر ہے۔

ملک میں جمہوریت ہے، جمہوری ادارے ہیں، ہر پانچ سال پر انتخاب ہوتے ہیں، ریاست سے مرکز تک مختلف پارٹیوں کی سرکاریں ہیں۔ ہر پانچ سال پر پورے تام جھام کے ساتھ جمہوری تماشہ ہوتا ہے اور لوگ کبھی اس کے جھانسے میں آجاتے ہیں تو کبھی کسی اور کے جھانسے میں آجاتے ہیں۔ اوپر اوپر بہت سے کوسمیٹک چینجز دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن اندرونی حالت جوں کی توں رہتی ہے۔ جو غریب ہے، پسماندہ ہے، کمزور ہے جس کی نمائندگی کم ہے، وہ کل بھی غریب تھا، پس ماندہ تھا، کمزور تھا اور آج بھی اس کی نہ تقدیر بدلی ہے اور نہ تصویر بدلی ہے۔ اقبال نے جمہوریت کے لیے کہا تھا جب اقدار سے عاری ہوتی ہے تو اسے دیو استبداد بننے میں دیر نہیں لگتی۔ پرانے زمانے میں اقتدار کی جنگ

بادشاہوں کے درمیان ہوتی تھی۔ ہر بادشاہ کا لاؤ لشکر ہوتا تھا جو دوسرے سے لڑکر اقتدار حاصل کرتا تھا۔ اب بادشاہت پارٹیوں میں تبدیل ہوگئی ہے اور جنگ کی جگہ پر الیکشن ہوتے ہیں۔ جہاں ہر پارٹی اپنے وسائل اور لاؤ لشکر کی بناء پر الیکشنی جنگ لڑتی ہے، کوئی ہارتا ہے تو کوئی جیتتا ہے۔ یقیناً اس تبدیلیِ اقتدار میں خون خرابہ نہیں ہوتا ہے مگر دھن بل اور دھاندھلی اسی طرح ہوتی ہے جس طرح پرانے زمانے میں ہوتی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ الیکشن میں عوام ہر پانچ سال میں حکمرانوں کا حساب لیتی ہے اور پھر ان کے کارناموں کی بنیاد پر جزا اور سزا دیتی ہے لیکن جو لوگ سیاست کا کھیل کھیلتے ہیں وہ اتنے سیانے ہیں کہ عوام کو ان کی اندرونی سازشوں اور چال بازیوں کا پتہ بھی نہیں چلتا اور وہ دھوکہ کھاجاتے ہیں۔ اقتدار کی جنگ تندوتلخ ہونے کے باوجود ان کے درمیان ایک ملی بھگت ہوتی ہے اس لیے ہر دوصورت میں ان کے اپنے مفادات محفوظ رہتے ہیں، نقصان عوام کا ہوتا ہے۔

موجودہ جمہوری الیکشن اتنا مہنگا ہے کہ ایک عام آدمی اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے سیاسی پارٹیاں بڑے بڑے کارپوریٹ گھرانے کی باج گزار ہوتی ہیں اور بڑے سرمایہ دار پورے ملک کو اپنا مال تجارت مانتے ہوئے سیاسی پارٹیوں سے سودا کرتے ہیں اور جو ان کے مفاد میں جتنا کام کرنے کا مدعی ہوتا ہے اس کو اتنا ہی زیادہ سرمایہ فراہم کرتے ہیں تاکہ وہ پوری فنی مہارت کے ساتھ اپنی سیاسی پروپیگنڈہ بازی کرکے اقتدار اپنے ہاتھ میں لیں اور پھر ان کو ان کا سرمایہ سود اور نفع کے ساتھ واپس کریں۔ جس طرح سینما میں ڈائریکٹر، پوروڈیوسر کوئی اور ہوتا ہے جو کبھی پردہ سیمیں پر نہیں آتا، وہ ایکٹر اور دیگر لوگوں کو ہائر کرتا ہے اور پھر ان کے ذریعہ سے اپنے نقشہ میں رنگ بھرتا ہے۔ ٹھیک یہی حال ہماری جمہوری سیاست کا ہے۔ لہٰذا انسانی حقوق کا مسئلہ ایک طبقاتی اور گروہی مسئلہ ہے، اس لیے جمہوریت، جمہوری اداروں اور تمام تر دستوری ضمانتوں اور تحفظات کے باوجود غریب، کمزور اور کم تعداد والوں پر ظلم و استحصال ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ماہ و

سال بیتتے چلے جاتے ہیں اور لوگ اچھے دن کی تلاش میں سراب صحرا کی طرح دھوکہ کھاتے رہتے ہیں۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلادیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

نوبل انعام یافتہ ماہر معاشیات پروفیسرامرتیہ سین نے غربت، جہالت، بے روزگاری، بے گھری، بیماری وغیرہ کو آزادی کی نفی (Unfreedom) قرار دیا ہے۔ لہٰذا اگر آزادی اور جمہوریت ایک انسان یا کسی انسانی گروہ کو ان مسائل سے آزادنہیں کرتے تو پھر اس کے لیے آزادی بے معنی ہے۔

اگر آپ غربت، جہالت، بے روزگاری وغیرہ کو انسانی حقوق کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ جو انسان یا انسانی گروہ ان چیزوں کے شکار ہیں، یہ چیزیں اس کی زندگی کے حق (Right to Life) کی نفی کرتے ہیں اور انسانی شرف (Right to Dignity) کے بھی خلاف ہیں۔

اقوامِ متحدہ نے غریبی کی ایک بہت ہی جامع تعریف پیش کی ہے جس نے غربت سے ابھرنے والے تمام مسائل و حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

> "Fundamentally, poverty is a denial of choices and opportunities, a violation of human dignity. It means lack of basic capacity to participate effectively in society. It means not having enough to feed and clothe a family, not having a school or clinic to go to, not having the land on which to grow one's food or a job to earn one's living, not having access to credit. It means insecurity, powerlessness and

exclusion of individuals, households and communities. It means susceptibility to violence, and it often implies living in marginal or fragile environments, without access to clean water or sanitation."

اس اقتباس کا آزاد ترجمہ اس طرح ہے:

''بنیادی طور پر غربت مواقع اور پسند کے حصول کی نا اہلیت ہے، یہ انسانی شرف کے خلاف ہے۔ یہ سماجی عمل میں مؤثر حصہ داری کی صلاحیت میں بنیادی کمی کے ہم معنی ہے۔ اس کا مطلب غذا اور پورے خاندان کے لیے ضروری کپڑوں کی عدم فراہمی ہے۔ اسکول، دواخانہ اور اپنے گزارے کے لیے اناج پیدا کرنے کے لیے زمین کا نہ ہونا اور زندہ رہنے کے لیے روزگار کی عدم فراہمی ہے۔ قرضوں کا عدم حصول ہے، اس کا مطلب عدم تحفظ، ناطاقتی اور خاندانوں اور برادریوں کو الگ تھلگ رکھنا ہے۔ اس کا مطلب ان کو آسانی سے تشدد کا شکار بنایا جاسکتا ہے، وہ حد درجہ خراب ماحول میں رہتے ہیں جہاں صفائی اور پینے کا صاف پانی بھی میسر نہیں ہے۔''

اس اقتباس کو غور سے دیکھیں تو سمجھ میں آئے گا کہ غربت اور جہالت سیدھے طور پر حقوق انسانی کے منافی ہے، جو فرد اور قوم جتنا غریب ہوں گے ان کے انسانی حقوق کی اتنی ہی زیادہ پامالی ہوگی۔ اس وقت مسلمانوں میں جس طرح کی غربت وجہالت ہے اور وہ جن تعصّبات کا شکار ہیں اگر اوپر بیان کردہ اقتباس میں غربت لفظ ہٹا کر اس کی جگہ پر مسلمان لکھ دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک ایچ ڈی کیمرہ سے مسلمان فرد اور سماج کی ایک ایسی ڈیجیٹل رنگین تصویر لی گئی ہے جس میں ان کی محرومی، کمزوری، پسماندگی، ذلت اور عدم تحفظ کے تمام رنگ اپنی تمام جزوی تفصیلات کے ساتھ بہت نمایاں کرکے پیش کیے گئے ہیں۔ اس اقتباس کا اگر محاکمہ کیا جائے تو چند بنیادی حقائق ابھر کر سامنے آتے ہیں:

(1) مسلمان اس وقت ملک میں ناقابلِ قبول مشکلات Unacceptable Hardship سے دوچار ہیں۔

(2) انھیں بنیادی تحفظ (Lack of Basic Security) نہیں ہے، ان کی جان، مال، عزت، آبرو، دین وتہذیب، شریعت و ثقافت، تعلیمی ادارے، تجارت و معیشت کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔

(3) ان کے اندر اختیار و اہلیت (Lack of Entitlement / Capability) کی کمی ہے۔

(4) ان کی بنیادی اور واجبی ضرورتیں (Nonfulfilment of basic needs) بھی پوری نہیں ہوتی ہیں۔

(5) ان کو محروم رکھنے کا ایک مسلسل (Pattern of Deprivsation) قائم ہے۔

(6) ان کی معیار زندگی بے حد گھٹیا (Lowest standard of living) ہے۔

(7) ان کے پاس وسائل کی بے حد کمی (Lack of Resources) ہے۔

(8) ان کو معاشی عمل سے دور (Economic Distance) رکھا جارہا ہے۔

(9) ان کی ایک الگ معاشی درجہ بندی (Economic Class) ہے۔

(10) ان کی ایک الگ سماجی درجہ بندی (Social Class) ہے۔

(11) ان کے اندر انحصار (Dependancy) پائی جاتی ہے۔ اپنے پاؤں پر اعتماد کے ساتھ کھڑے ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔

(12) ان کو جان بوجھ کر الگ تھلگ اور محروم (Deprivation & Exclusion) رکھنے کی پالیسی پر عمل ہورہا ہے۔

مسلمانوں کے باب میں یہ جدید آزاد بھارت کی وہ تصویر ہے جو ہمارے حکمرانوں اور پالیسی ساز اداروں اور افراد کی ذہنیت اور طرزِ عمل کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں اگر کسی ایک طبقے کے انسانی حقوق کی پورے

جمہوری تام جھام کے ساتھ کھلم کھلا پامالی ہو رہی ہے تو وہ مسلمان ہیں۔

اگر ہم موجودہ ہندوستان کا سماجی، مذہبی اور معاشی منظر نامہ دیکھیں تو اس ملک میں ہندو بڑی اکثریت میں ہیں۔ ان کی مجموعی آبادی 82% ہے، جبکہ مسلمان دوسری بڑی آبادی ہیں جو کم و بیش 15% ہیں۔ تیسرے نمبر پر سکھ آتے ہیں، چوتھے نمبر پر کرسچین ہیں۔ اس کے علاوہ اس ملک میں کئی اور مذہبی اقلیتیں ہیں جیسے پارسی، جین، بودھ، یہودی وغیرہ۔ ہندوؤں میں دو طبقات درج فہرست ذاتیں اور آدی باسی کچھ مٹھی بھر لوگوں کو چھوڑ کر حد درجہ غریب اور پس ماندہ ہیں۔ ہندو دیو مالائی روایات کی وجہ سے ان کا ہزاروں سال سے استحصال ہوتا آرہا ہے۔ بھارت کی آزادی کے پہلے انھیں بنیادی انسانی حقوق حاصل نہیں تھے۔ دستورِ ہند نے انہیں برابر کا شہری ہونے کا درجہ دیا اور ساتھ ہی تعلیمی، معاشی اور سیاسی تحفظات دے کر ان کو اوپر اٹھانے اور برابر کی سطح پر لانے کی کوشش شروع ہوئی۔ پچھلے ستر سالوں میں ایک قلیل تعداد اوپر آئی ہے۔ ابھی بھی اس طبقہ کی 80-90% فیصد آبادی انتہائی پس ماندگی اور بے اختیاری کی زندگی جی رہی ہے۔ دوسرے نمبر پر ہندوؤں کے دیگر پس ماندہ طبقات ہیں جن کی بڑی عددی قوت ہے۔ انہیں آزادی کے بعد اپنی سیاسی طاقت کا اندازہ ہوا۔ لہٰذا وہ گول بند ہوکر مضبوط پہل کر رہے ہیں۔ ان کو تعلیمی اور معاشی تحفظات بھی حاصل ہیں، اس لیے وہ تیزی سے اوپر آرہے ہیں تاہم ابھی بھی اس طبقہ کی غالب اکثریت غربت اور جہالت کی شکار ہے اور سرکاری نوکریوں میں ان کی نمائندگی بہت کم ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کی 70% آبادی یا تو خطِ غربت پر ہے یا اس سے تھوڑا اوپر ہے۔ انسانی حقوق کے باب میں ان کی پوزیشن ابھی بھی بہت اچھی نہیں ہے۔ سکھ، کرسچین، بودھ، جین اور پارسی گرچہ تعداد میں کم ہیں، مگر معاشی، تعلیمی اور سماجی حیثیت میں بلند مرتبہ ہیں۔ ان طبقات میں غربت کم ہے۔ سکھ، بودھ، جین تو ہندوؤں کے انگ مانے جاتے ہیں اس لیے ان کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ نہیں ہے۔ 1984ء کے دنگے میں پہلی بار سکھوں کو اپنے اقلیت ہونے کا احساس ہوا مگر ہندوؤں اور سکھوں دونوں جانب سے ایسی کوششیں بڑے پیمانے پر

ہوئیں جس نے ان کے زخم پر مرہم رکھنے کا کام کیا اور دھیرے دھیرے ان کا یہ زخم مندمل ہوگیا ہے۔

اس وقت سب سے ناگفتہ بہ صورتحال مسلمانوں کی ہے۔ اب تک جو بھی سرکاری اور غیر سرکاری رپورٹ اور مطالعات سامنے آئے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جمہوریت اور آزادی کے برکات سے پوری طرح محروم ہیں اور وہ ہندوستان کے پسماندہ گروہوں کے درمیان سب سے نچلے پائیدان پر ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ترقی کے دور میں وہ پیچھے چھوٹ گئے ہیں بلکہ ان کو پیچھے چھوڑ دیا گیا ہے اور کسی کو ان کو آگے لانے اور اوپر اٹھانے کی فکر نہیں ہے بلکہ اگر کوئی ان کی حمایت میں ہمدردی کے دو بول بولتا ہے تو ہر طرف سے لعن طعن کی بارش شروع ہوجاتی ہے۔

آزادی کے بعد ملک کے طول وعرض پر ریاستوں سے لے کر مرکز تک کانگریس کا 45 برسوں تک بلا شرکت غیرے اقتدار رہا۔ کانگریس لبرل، سیکولر نظریات کی پارٹی مانی جاتی ہے جو تمام ہندوستانیوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہے مگر کانگریس نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی ترقی و استحکام میں ایماندارانہ دلچسپی نہیں لی بلکہ وہ ان کو بنیادی تحفظ بھی فراہم کرنے میں ناکام رہی۔ ساؤتھ کی چند ریاستوں کو چھوڑ کر ہندوستان کا کوئی ایسا صوبہ اور بڑا شہر نہیں ہے جہاں تسلسل کے ساتھ فرقہ وارانہ فساد نہ ہوئے ہوں، جس میں ہزاروں مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے اور اربوں کھربوں کی جائداد تلف کردی گئی۔ ان فسادات میں نہ صرف مظلوموں کو انصاف نہیں ملا، مجرموں کو کوئی سزا نہیں ہوئی، نہ ان کی داد رسی کی گئی اور نہ ان کو تحفظ اور معاوضہ دیا گیا۔ فسادات کے تسلسل نے پوری قوم کو خوف کی نفسیات میں مبتلا کردیا جس نے ان کے اندر سے Initiative اور Incentive کی صلاحیت چھین لی۔ جس کے نتیجے میں وہ پس ماندگی کی اندھی کھائی میں گرتے چلے گئے۔ تعلیمی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی ہر سطح پر ان کو آزادی اور جمہوریت کی نعمتوں سے محروم رکھا گیا اور وہ ان کا حصہ میوہ حلوہ اور اپنا حصہ دور کا جلوہ بن کر رہ گئے۔

کانگریس کا زوال جیسے جیسے شروع ہوا اس خلا کو بہت سی سیکولر، سوشلسٹ، کمیونسٹ اور دیگر لبرل نظریات کی پارٹیوں نے بھرنا شروع کیا اور ریاست ومرکز میں ان کی واضح اکثریت یا پھر ملی جلی سرکار بننے لگی۔ انھوں نے ملک کے سیاسی، معاشی اور دیگر معاملات میں بہت سی تبدیلیاں لائیں اور بہت سے طبقات اور گروہوں کو حاشیہ سے اوپر اٹھا کر سینٹرا سٹیج پر آنے کا موقع دیا مگر نہیں بدلا تو مسلمانوں کی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ جہاں تھے وہاں سے نیچے ہی آئے اوپر نہیں آپائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی محرومی اور بے وقعتی میں اضافہ ہورہا ہے۔ دراصل مسلمان تاریخی تعصب کے شکار ہیں ان کے خلاف فرقہ واریت، تعصب، تنگ نظری، نفرت اور تشدد عام ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ حکمران اور حزبِ اختلاف کی پارٹیوں نے ایک خاموش سمجھوتہ کے تحت اس کو قومی پالیسی کا روپ دے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستوں اور مرکز میں اقتدار میں تبدیلی کے باوجود مسلمانوں کی حالت میں اور ان کے سلسلے میں رائج سوچ میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا اور وہ ترقی اور حصہ داری کے عمل میں مسلسل پیچھے چھوٹتے چلے جارہے ہیں۔ 2014ء کے بعد ہندوستان کا سیاسی منظر نامہ پوری طرح تبدیل ہوگیا ہے۔ اس وقت مرکز میں اور ہندوستان کی متعدد ریاستوں میں بی جے پی اور ان کی حامی پارٹیوں کی سرکار ہے۔ بی جے پی اور سنگھ پریوار جس سیاست کی مدعی ہے وہ اکثریت کی حکومت یعنی (Majoritanian Govt.) کی قائل ہے۔ چونکہ ہندوستان میں ہندو غالب اکثریت میں ہیں اس لیے مسلمانوں کو پوری طرح نظر انداز کرکے محض ہندوؤں کی حمایت سے ایوان میں اکثریت حاصل کرکے سرکار بنائی جاسکتی ہے۔ 2014ء کے الیکشن نے یہ بات ثابت کردی ہے۔ لہٰذا سنگھ کا تھنک ٹینک اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی اہمیت ختم کردی جائے۔

جب عملاً ان کے ووٹ کی اہمیت ختم ہوجائے گی تو دستور میں کوئی تبدیلی لائے بغیر بھی پورے جمہوری عمل کے ذریعے وہ اکثریت کی حکومت قائم کرسکتے ہیں۔ اس صورت میں دکھاوے کے لیے ان کو کسی اقدام کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس طرح ہندوستان کے

مسلمان دستور قانون، جمہوریت اور جمہوری اداروں اور اقدار کی موجودگی میں پوری طرح Marginalised ہوگئے ہیں اور اب ان کے Exclusion اور Disempowerment کا ایک نیا دور شروع ہوگیا ہے۔ ان حالات میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت عملاً دوسرے درجے کے شہری کی ہوتی جارہی ہے۔ اس صورت میں ان کے بنیادی حقوق اور دستوری ضمانتیں کورے کاغذ کی طرح ہیں جس کی کوئی قیمت واہمیت نہیں ہے۔

شہریوں کے جان ومال، عزت و آبرو کا تحفظ، ان کے دین، زبان، تہذیب، تعلیمی اور مذہبی اداروں اور شخصی آزادی کا تحفظ کسی بھی حکومت کا بنیادی اور لازمی فرض ہوتا ہے۔ مگر جب ایک حکومت اور اس کی ایجنسیاں جان بوجھ کر ان بنیادی تحفظات کو دینے میں پہلو تہی کرتی ہے تو پھر اس صورت میں انسانی حقوق کا مسئلہ کتنا پیچیدہ اور بحران کن ہوسکتا ہے اس کا اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان اس وقت اس بحرانی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔ ابھی دستور اور اس کے بنیادی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے لیکن اس کو نافذ کرنے والے ہاتھ اور دماغ بدل گئے ہیں اس لیے دستور کے الفاظ بے معنی لفظوں کا پلندہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دستور میں کوئی تبدیلی لائے بغیر بھی اس کو معطل اور بے اثر کیا جاسکتا ہے۔ میں اس بحث کو اس نوٹ پر ختم کرنا چاہوں گا کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے بنیادی حقوق کا مسئلہ ایک ایسے بحرانی دور میں داخل ہوگیا ہے جس پر بھرپور قومی بحث کی ضرورت ہے۔ شہریوں کے تحفظ (Security) پسند کی آزادی (Freedom of Choice)، مواقع کی یکسانیت (Equal Opportunity)، اہلیت (Enablement)، متعین حصہ داری (Ensured Participation) اور اختیار (Empowerment) کے بغیر ان کے بنیادی انسانی حقوق کو متعین اور محفوظ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جدید ہندوستان کا المیہ یہ ہے کہ تمام تر دستوری اعلانات اور بیانات کے باوجود عملی طور پر وہ اپنے بنیادی شہری حقوق کی برکات سے محروم ہیں اس لیے آزاد بھارت میں مسلمانوں کے بنیادی حقوق کا مسئلہ دراصل دستور کے عدم نفاذ کا مسئلہ ہے جس نے بھارت

کے Constitutional Provisions کو بڑی حد تک Inoperative بنادیا ہے۔ جب تک آزاد بھارت میں دستور کے ایماندارانہ نفاذ کی ضمانت نہیں دی جاتی اس وقت تک ہندوستان میں مسلمانوں کے انسانی حقوق کے عدم نفاذ اور پامالی پر روک لگانا ناممکن ہے۔ بھارت کے موجودہ دستور کا عملی اور ایماندارانہ نفاذ کیسے ہوگا یہ اس وقت کا ملین ڈالر کا سوال ہے۔ لہٰذا پریس، پارلیامنٹ، عدالت، سول سوسائٹی، دانشوروں، ادیبوں، فنکاروں اور تمام انسانیت نواز طاقتوں کو متحد اور منظّم ہوکر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو بھی اپنی قومی، ملی جنگ فرقہ وارانہ دائرے میں لڑنے کے بجائے دستوری، قانونی، سماجی اور سیاسی طور پرلڑنے کے لیے خود کو منظّم اور متحد کرکے ایک قومی اور انسانی مسئلہ کے طور پر لڑنا چاہیے۔ تاریخ، سماج اور سیاست کی غلطیوں کو اسی طرح سدھارا جاسکتا ہے، اس کے لیے ملک کے مین دھارے سے الگ نہیں بلکہ ان میں شامل ہوکر اس جنگ کو لڑنے کی ضرورت ہے۔

■❖■

باب دوم

ہندوستان کے موجودہ مسلم سماج
میں انسانی حقوق کی صورتحال

ہندوستان کے موجودہ مسلم سماج میں انسانی حقوق کی صورتحال

ابھی تک ہم نے انسانی حقوق کیا ہے؟ اس کی تاریخ کیا ہے؟ اس کا ارتقا کیسے ہوا؟ دستور ہند میں بنیادی حقوق کا تعارف، اسلام میں بنیادی حقوق اور ہندوستان میں مسلمانوں کے بنیادی حقوق کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے جس سے انسانی حقوق کے تمام اہم پہلوؤں کو جاننے اور سمجھنے میں مدد ملے گی۔اس باب میں ہندوستان کے مسلم سماج میں رائج انسانی حقوق کی صورتحال پر روشنی ڈالوں گا تاکہ مسلم سماج کی اندرونی کمیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی جاسکے اور اس کے تدارک پر غور کیا جاسکے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انسانی حقوق کا مسئلہ صرف حکومت اور اکثریت کی ناانصافیوں سے تعلق رکھتا ہے، یہ ایک خارجی مسئلہ ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ انسانی حقوق کا مسئلہ ہر سماجی اور مذہبی گروہ کا داخلی مسئلہ بھی ہے اور یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کسی سماجی گروہ کے اندر کیا صورت حال ہے۔ اگر ہم دلت اور آدی باسی یا دیگر پس ماندہ طبقات بالخصوص خواتین کے خلاف ہونے والی زیادتیوں کا ذکر کرتے ہیں تو یہ محض سیاسی اور خارجی مسئلہ نہیں ہے جس کو محض امن و قانون کی مشنری کو چست درست کر کے ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس سماج کا داخلی مسئلہ بھی ہے جس کو سماجی، نفسیاتی، تمدنی

اور اخلاقی طور پر اگر نہیں دیکھا جائے گا تو ہم مسئلہ کی جڑ تک نہیں پہنچ سکتے ہیں اور پھر یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہوگا۔ آپ عبادت خانوں میں، تالاب میں اور دیگر عوامی مقامات پر قانون بنا کر لوگوں کو داخلے کی اجازت دے سکتے ہیں اور جو اس میں رکاوٹ پیدا کرنے والے ہیں ان کے خلاف تادیبی کارروائی کے ذریعہ ان کے حوصلے پست کر سکتے ہیں لیکن یہ اس مسئلہ کا دائمی اور فول پروف حل نہیں ہے، اس مسئلہ کا دائمی اور فول پروف حل یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے لوگوں کی ذہنیت بدلی جائے، ان کے اندر انسانی شرف اور برابری کا احساس ابھارا جائے، بھائی چارہ اور انسانیت نوازی پیدا کی جائے تو یہ مسئلہ بلا زور وقوت ختم کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا قانون کسی سماجی اور تہذیبی مسئلہ کے حل میں جو محدودیت رکھتا ہے اس کو سماجی اصلاح کی کوششوں سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا کسی بھی سماجی خرابی کی اصلاح کے لیے قانون کے ساتھ ساتھ سماجی اصلاح اور تعلیم و تربیت کا فروغ ضروری ہے۔ انسانی حقوق کی بازیابی میں تعلیم وتربیت قانون سازی اور قانون کو نافذ کرنے والے ادارے کا بہت اہم رول ہوتا ہے۔

اس وقت ہندوستان کا مسلم سماج بہت سارے خارجی اور داخلی مسائل سے دوچار ہے۔ لہٰذا اصلاح حال کی خاطر مسلم سماج میں اس وقت انسانی حقوق کے معاملے میں کیا صورت واقع ہے اس کا جائزہ ضروری ہے۔ ذیل کے صفحات میں ہم اس کا ایک معروضی اور واقعاتی (Realistic) جائزہ لیں گے تاکہ جو آئینہ اب تک باہر کے مناظر کی منظر کشی کر رہا تھا وہ اندرونی طور پر اندر کی کمزوریوں اور خرابیوں کی بھی نشاندہی کر سکے تاکہ لوگوں میں بیداری اور اصلاح لائی جاسکے۔ جب تک لوگ بیدار نہیں ہوں گے اصلاحِ حال کی کوئی کوشش بار آور نہیں ہوسکتی۔ اس وقت مسلمانوں میں کوئی اجتماعیت نہیں ہے، قیادت کا فقدان ہے، لوگ ذات پات، گروہی اور مسلکی دھرے بندیوں میں بٹے ہیں۔ اس لیے کسی کے ہاتھ میں کوئی قوت نافذہ نہیں ہے۔ فتویٰ اور وعظ وتنقید سے کسی بڑی تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ اقدار سے عاری سیاست نے لوگوں کو شتر بے مہار بنادیا ہے اور مسلمان

دھیرے دھیرے اپنی پہچان اور اہمیت کھوتے جا رہے ہیں۔

علامہ اقبال نے قرآن پاک کی ایک مشہور آیت کا منظوم ترجمہ اس طرح کیا ہے، خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا۔ وقت آ گیا ہے کہ مسلمان سماج اپنا ایماندارانہ محاسبہ کرے اور اپنی کمزوریوں اور کمیوں پر ایمانداری سے غور کرے اور اصلاحِ حال کی مخلصانہ جدوجہد کے لیے تیار ہو جائے۔ حالات انتہائی سخت و سنگین ہیں۔ معاند قوتیں پوری طرح سے ہتھیار بند ہو کر حملہ آور ہو رہی ہیں۔ اگر ہم نے اپنے آپ کو نہیں سنبھالا اور اپنی اندرونی کمزوریوں پر قابو پانے کی ایماندارانہ کوشش نہیں کی تو اندلس، غرناطہ، البانیہ اور فلسطین میں ہی نہیں ہندوستان میں بھی اپنی تمام تر مضبوط تاریخ و روایات کے باوجود خاکم بہ دہن ہمیں تاریخ کا ایک فراموش کردہ باب اور درسِ عبرت بننے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ دنیا جائے عمل ہے۔ یہاں عمل اور انجام کا ایک فطری اور طبعی قانون نافذ ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جس میں کسی کی خاطر کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی کھیل کے اصول (Rule of the Game) کو سمجھنا ہوگا اور اسی مطابق دنیا اور معاملات دنیا کو سرانجام دینا ہوگا۔ قدرت کا ایک اصول ہے خدا بھی اسی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنی تقدیر سنوارنے کا نسخہ کسی حکومت یا اکثریت کے پاس نہیں بلکہ ہمارے پاس ہے اور ہم کو اس کو بروئے کار لا کر آگے کی منزل طے کرنی ہے۔

اس وقت انسانی حقوق کے باب میں کم و بیش ساری دنیا میں مسلمانوں کا ریکارڈ اچھا نہیں ہے، لہٰذا مسلمان سماج پر ہر طرف سے طعن و تشنیع کی بارش ہو رہی ہے۔ ہمیں اپنے سماج کی انسانیت نواز تصویر بنانی ہے اس لیے اپنی اصلاح اور تبدیلی کے لیے آگے آنا ہوگا تاکہ ہم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں روحِ عصر (Spirit of the Age) کے مطابق اپنی ملت کی نئی تعمیر اور تزئین کر سکیں اور اپنے سماج میں انسانی حقوق کی بازیابی اور حفاظت کو مستحکم کر سکیں۔ ذیل کے صفحات میں ہم مسلمانوں کے مختلف طبقات کی موجودہ صورتحال اور

ان کے بنیادی حقوق کا تحفظ کیسے ہوسکتا ہے، اس کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں اس پر روشنی ڈالیں گے۔ یہاں ہم خاص طور پر تین طبقات — بچوں کے حقوق، پسماندہ برادریوں کے حقوق اور خواتین کے حقوق پر روشنی ڈالیں گے۔

■❖■

ہندوستان کے مسلم سماج میں بچوں کے حقوق

جیسا کہ تمام مطالعات اور رپورٹوں سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان سماج میں تقریباً ملک کی تمام ریاستوں، خطوں اور علاقوں میں دیگر تمام طبقات کے مقابل ان کی تمام برادریوں کے مابین غربت اور جہالت سب سے زیادہ ہے اور وہ ہندوستان کی پسماندہ ترین آبادی شمار کی جاتی ہیں۔ ہندوستان عالمی برادری میں ایک پسماندہ اور غریب ملک اس وجہ سے بھی شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس کی 15% آبادی جو مسلمانوں پر مشتمل ہے وہ غریب اور پسماندہ ہے۔ لہٰذا ملک کا گراف اس وقت تک بہتر نہیں ہوسکتا جب تک مسلمانوں کا گراف بہتر نہیں ہوتا۔

غربت اور جہالت کا اثر صرف بڑوں اور بالغ آبادی پر ہی نہیں پڑتا ہے بلکہ بچوں اور دیگر طبقات پر زیادہ پڑتا ہے۔ بچے چونکہ چھوٹے ہوتے ہیں لہٰذا وہ اپنے حقوق کو طلب کرنے اور اس کی حفاظت کرنے سے قاصر ہوتے ہیں، اس لیے ان کا استحصال بھی زیادہ ہوتا ہے۔

جہالت کا مطلب صرف اتنا نہیں ہے کہ وہ جدید تعلیم سے ناآشنا ہیں۔ بلکہ جہالت کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے بھی نا آشنا ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کی غالب اکثریت یہ جانتی ہی نہیں ہے کہ اسلام نے بچوں کے حقوق کے باب میں کیا تعلیم

دی ہے اور کیسے اس کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

مسلمان سماج پر یہ الزام ہے کہ اس سماج میں ہر فرد چار چار شادیاں کرتا ہے اور اس کے چالیس چالیس بچے ہوتے ہیں۔ اکثریت کے ایک طبقہ کو ڈر ہے کہ مسلمان جس طرح اپنی آبادی بڑھا رہے ہیں، ایک دن وہ بھارت میں ہندوؤں سے زیادہ ہوجائیں گے اس لیے ان کے بعض لیڈران اور مذہبی رہنما چار بچے پیدا کرنے کی ہدایت دیتے ہیں۔ مسلمان سماج کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان فیملی پلاننگ ایک سازش کے طور پرنہیں کراتے ہیں تا کہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو۔

ان پروپیگنڈہ کرنے والوں کو شاید یہ نہیں معلوم ہے کہ مسلمانوں میں بڑھتی آبادی کی بڑی وجہ ان کی غربت اور جہالت ہے۔ دنیا بھر کے آبادی کا مطالعہ کرنے والے ماہرین (Demographers) کی متفقہ رائے ہے کہ جس ملک، قوم اور معاشرے میں غربت و جہالت زیادہ ہے وہاں آبادی میں اضافہ کی شرح زیادہ ہے اور جہاں نسبتاً کم ہے وہاں اضافہ کی شرح کم ہے۔ آبادی کم کرنے میں علم اور معیارِ زندگی سب سے بڑی مانع (Contraceptive) ہے۔ مسلمانوں کے وہ مخالفین جو مسلمانوں کی بڑھتی آبادی کی وجہ سے پریشان ہیں وہ اگر حکومت اور اکثریت کو اس بات کے لیے آمادہ کرنے میں کامیاب ہوجائیں کہ خاص پالیسی بنا کر مسلمانوں کی غربت و جہالت دور کی جائے اور ان کے معیارِ زندگی کو بلند کیا جائے تو مسلمانوں کی آبادی کی شرح خود بخود کم ہوجائے گی۔ مگر وہ تو محض پروپیگنڈہ کرکے ماحول خراب کرنا چاہتے ہیں، مسلمانوں کے واجبی مسائل سے ان کو کوئی ہمدردی نہیں ہے۔

بڑھتی آبادی صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے کہ بلکہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے وہ تمام ممالک جہاں غربت و جہالت زیادہ ہے وہاں آبادی کی شرح زیادہ ہے جس نے پوری دنیا میں عدم توازن کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ بہرحال مسلمانوں میں بڑھتی آبادی کی بڑی وجہ ان کی غربت وجہالت ہے۔

یہ ایک بات ہے لیکن ایک دوسری حقیقت یہ بھی ہے کہ بچوں کی افزائش کے معاملے میں مسلمان بہت حساس ہیں۔ ایک تو غربت اور جہالت کی وجہ سے منع حمل کی بہت ساری محفوظ اور جائز صورتوں سے وہ ناواقف ہیں، دوسری طرف اسلام کی جو کچی پکی معلومات ان تک پہنچی ہیں اس نے بہت سے لوگوں کو منع حمل کی جدید تدابیر اختیار کرنے سے روک رکھا ہے تیسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح اکثریت کے بعض عناصر مسلمانوں کی بڑھتی آبادی کو ایک خطرہ بتا کر اکثریتی سماج کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں بعض عناصر مسلمانوں کو موجودہ خوف اور بے چارگی کے ماحول سے باہر نکلنے کے لیے اپنی عددی قوت کو بڑھانے کی تلقین کرتے ہیں۔

اس وقت ہم مسلمانوں کی گھٹتی بڑھتی آبادی پر کوئی تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ اس وقت ہمارا فوکس مسلمان معاشرے میں بچوں کے حقوق پر ہے۔ بچوں کے حقوق کے نقطہ نظر سے جب ہم مسلمان معاشرے کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے سامنے بہت ہی ناگفتہ بہ صورتحال ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ازروئے اسلام صرف بے روک ٹوک بچہ پیدا کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کی کفالت، صحت، تعلیم وتربیت اور ان کو ہر طرح کے ظلم واستحصال سے بچانا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی فرد خاندان اور معاشرہ اپنے بچوں کی کفالت وحفاظت سے قاصر ہے تو اس کو اپنی سوچ اور اپنے رویہ پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ رزق کی کمی کے ڈر سے اپنے بچوں کو قتل نہ کرو ہم تمہیں بھی رزق دیں گے اور انہیں بھی۔ بچوں کا قتل کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ (17:31) اس آیت میں بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ بچوں کو قتل کرنا اور منع حمل کے طریقے اختیار کرنا دونوں دو چیزیں ہیں۔ قتل انتہائی انسانیت سوز اور سفاکانہ عمل ہے خاص طور سے اپنے بچے کا اس سے زیادہ قبیح اور وحشیانہ عمل کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ جو سماج اپنے بچوں کا قاتل ہو اس سے زیادہ شقی القلب کوئی دوسرا سماج ہو ہی نہیں سکتا۔ حضورؐ کی بعثت کے وقت عرب کے بعض قبائل ایسے تھے جو اپنی بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ قرآن نے ان کے مختلف وجوہات کی وضاحت

کی ہے اور ان کے طرزِ عمل کا نفسیاتی جائزہ بھی لیا ہے اور اس فعلِ قبیح سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ آج کے مہذب تعلیم یافتہ، عورت مرد کی مساوی حیثیت کا دعویٰ کرنے والے گھروں اور سماج میں جو نسبتاً خوشحال اور بڑے بڑے شہروں میں رہتے ہیں اور اعلیٰ مناصب پر فائز ہیں اکثر وہ لوگ رحم مادر میں بچے کا جنس معلوم کرلیتے ہیں اور اگر یہ پتہ چلتا ہے کہ پیٹ میں پلنے والا بچہ لڑکی ہے تو اس کا اسقاط کرادیتے ہیں۔ یہ صریحاً قتل ہے۔ جب استقرار حمل ہوگیا اور بچے نے ماں کے پیٹ میں shape لینا شروع کردیا اس کے اندر جان پیدا ہوگئی، اگر میڈیکل وجوہات کے بغیر یعنی زچہ کے جان پر خطرہ ہوئے بغیر اس بچے کو عالم وجود میں آنے سے روکا گیا تو یہ صریحاً قتل کی تعریف میں ہی آئے گا اور اس کو بچے کے جینے کے بنیادی حق کے منافی مانا جائے گا۔ اسلام نے سب سے پہلے بچہ خصوصی طور پر گرل چائلڈ کو جان سے مارنے سے روکا ہے۔ اس وقت پنجاب، ہریانہ، مہاراشٹر، تلنگانہ، آندھرا پردیش اور ملک کے کم و بیش تمام ریاستوں کیرل کو چھوڑ کر لڑکے اور لڑکیوں کے تناسب میں بہت فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتنا بڑا مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج حکومت بیٹے بیٹی میں فرق کے خلاف مہم چلانے اور بیٹی بچاؤ جیسی مہم شروع کرنے پر مجبور ہے۔ اسلام نے بیٹیوں کو نئی زندگی دی ہے اور ان کو جینے کا برابر کا حق دیا ہے۔ بچوں کی پرورش خواہ وہ بیٹا ہو یا بیٹی اس میں فرق کو ناپسندیدہ عمل بتایا ہے۔

مگر جب ہم مسلمان معاشرے کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان سماج میں بھی یہ فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی اعداد و شمار نہیں ہے جس سے یہ پتہ لگایا جاسکے کہ مسلمان معاشرے میں کتنی فیصد لڑکیوں کو کوکھ میں ہی ماردیا جاتا ہے۔ مگر یہ بات قطعیت سے کہی جاسکتی ہے کہ اس کا تناسب بہت کم ہوگا کیونکہ مجموعی طور پر مسلمانوں میں مرد و عورت کے درمیان جنسی تناسب کا فرق بہت کم ہے تاہم لڑکیوں کے ساتھ عمومی معاملات میں بھید بھاؤ بچپن سے ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ صرف غریب اور اوسط گھرانوں میں ہی نہیں بلکہ بعض متوسط اور مذہبی گھرانوں میں بھی بیٹے اور بیٹی کے درمیان

امتیاز برتا جاتا ہے۔ بیٹے کو اچھے کھانے کھلائے جاتے ہیں، ان کو اچھے کپڑے دیے جاتے ہیں، ان کو اچھے اسکول اور کالج میں تعلیم دلوائی جاتی ہے جبکہ بیٹیوں کے ساتھ کھانے کپڑے اور تعلیم کے معاملے میں کھلی بے انصافی کی جاتی ہے۔ عام مسلمان گھرانوں میں بیٹی ایک بوجھ اور ایک ذمہ داری سمجھی جاتی ہے جبکہ بیٹا اثاثہ مانا جاتا ہے۔ لوگ حج جیسے فریضے کو استطاعت کے باوجود اس وقت تک موخر رکھتے ہیں جب تک بیٹی کی شادی نہ ہوجائے۔ مسجدوں میں عام طور پر بیٹیوں کی شادی کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ بیٹے کی شادی کی اعلانیہ اور اجتماعی طور پر کوئی دعا نہیں مانگی جاتی۔ یہ وہ علامتیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان معاشرے میں عام طور پر بیٹوں کے ساتھ لوگوں کا رویہ اور ان کی سوچ مساویانہ نہیں ہے۔ مسلمانوں میں تلک، جہیز اور شادیوں میں مانگ جانگ یعنی مطالبات کی قبیح رسم جو شروع ہوگئی ہے اس کی وجہ سے اگر کسی کے گھر بیٹی پیدا ہوتی ہے تو اس کا چہرہ اتر جاتا ہے کیونکہ بیٹی پیدا ہوتے ہی وہ سمجھتا ہے کہ اس کے سر بڑی ذمہ داری آ گئی ہے۔ اس طرح بچپن سے ہی دوہرے معیار اور دوہرے رویہ کی وجہ سے بچیوں کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی ایک عام بات ہے۔

مسلمان معاشرے میں خوشحال اور درمیانہ طبقہ مجموعی آبادی کا محض 5% ہے، 95% فیصد آبادی نچلے، پسماندہ اور غریب طبقات پر مشتمل ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جہاں غربت و جہالت سب سے زیادہ ہے، غربت اور جہالت کی وجہ سے معاشی طور پر مفلوک الحال ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شعور اور ثقافت کے اعتبار سے بھی حد درجہ پچھڑے ہیں اور ان کے سماج میں طرح طرح کی قبیح رسمیں اور اوہام وخرافات پائے جاتے ہیں۔ نسلی طور پر مسلمان سماج کا حصہ ہونے کے باوجود وہ سماجی اور ثقافتی طور پر غیر مسلم سماج کا حصہ معلوم ہوتے ہیں، جن کو دیکھ کر ہی مسلمان دشمن قوتوں میں جوش و حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور وہ گھر واپسی جیسی تحریک چلاتے ہیں اور جابجا کچھ فرضی ڈرامے اسٹیج کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ آسانی سے اکثریتی سماج میں ضم کیا جاسکتا ہے۔

اس سماج میں بچوں کی حالت بہت خراب ہے۔

کافی بڑی تعداد میں ایسے خاندانوں میں بچہ پیدا ہوتے ہی مرجاتے ہیں۔ زچگی کے وقت غیر محفوظ ولادت کی وجہ سے ماں کی جان پر بھی پڑ جاتا ہے، مسلمان معاشرے میں بالعموم زچہ بچہ کی شرح اموات دوسری برادریوں سے زیادہ ہے۔

پانچ برس کی عمر آتے آتے ایک بڑی تعداد میں چھوٹے بچے مختلف قابل علاج بیماریوں کے شکار ہوکر مرجاتے ہیں جو بچے بچ جاتے ہیں چونکہ ان کو بھر پور غذا میسر نہیں آتی یعنی نہ تو پوری خوراک ملتی ہے اور نہ اس میں ضروری تغذیہ (Nutrition) ہوتا ہے اس لیے عموماً بچے کو پوشن کے شکار ہوتے ہیں جس کی وجہ سے صحیح طور پر ان کی ذہنی اور جسمانی نشوونما نہیں ہو پاتی ہے اور وہ بڑے ہوکر کمزور، بیمار اور ذہنی طور پر غبی ہوتے ہیں۔ مسلمان بچوں میں ذہنی پسماندگی (Mental Retraction) اور ٹھگنا پن(Stunted growth) زیادہ ہوتا ہے۔ یعنی وہ ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور ہوتے ہیں اور ان کا قد بھی عام طور پر چھوٹا ہوتا ہے۔ آپ دور سے کسی نو دس سال کے بچے کو آتے دیکھیں اور اس کو کمزور دبلا پتلا، بیمار، آنکھیں دھنسی ہوئی، گال پچکے ہوئی اور ٹیڑھی میڑھی چال چلتے ہوئے پائیں تو دس میں آٹھ گمان ہے کہ وہ مسلمان بچہ ہوگا۔ اکثر ماں، باپ ان کو کھانا اور کپڑا دینے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا ان کی اکثریت بھوکی ننگی ہوتی ہے اور ان کے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے ہوتے ہیں۔ یہی وہ بچے ہیں جو مجبوری میں بچہ مزدور ہوتے ہیں، گھروں سے بھاگ جاتے ہیں اور جرائم پیشہ لوگوں کے ہاتھوں چڑھ جاتے ہیں جو ان سے بھیک منگواتے ہیں، اسمگلنگ کرواتے ہیں یا ان کو بیچ دیتے ہیں۔ ان میں بڑی تعداد لڑکیوں کی ہوتی ہے جن کا کم سنی میں ہی جنسی استحصال ہوتا ہے۔

چھوٹے بچوں کے ساتھ مار پیٹ ایک عام بات ہے، گھر میں ماں باپ، شہر اور محلے میں بڑے بچے اور بدمعاش لوگ گھروں اور کارخانوں، ہوٹلوں اور دیگر کام کی جگہوں پر مالکان، اسکول اور مدرسے میں ماسٹر اور مولوی صاحبان سب بچوں کو بے طرح پیٹتے

ہیں۔ مدرسوں میں مار کی وجہ سے بہت سے بچے گھر اور پڑھائی چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور پھر زندگی بھر جہالت کی زندگی جیتے ہیں۔ ہزاروں شواہد اور ثبوت کے باوجود کوئی اپنے اس اختیار تمیزی سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا ہے اور بچوں کو جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی ایذا پہنچانے کا عمل جاری وساری ہے۔ سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بیشتر مدارس اسلامیہ میں بچوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا، ان کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ نہیں ہوتا۔ ان کو رے، بے کر کے مخاطب بھی کیا جاتا ہے۔ اکثر ان کا کھانا بند کر کے سزا دی جاتی ہے۔ ان سے خادموں جیسا سلوک ہوتا ہے، کہیں کہیں ان کا جنسی استحصال بھی سننے کو ملتا ہے۔

بچوں کے حفظان صحت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ نہ تو ان کو پیٹ بھر غذا ملتی ہے نہ صاف پانی میسر ہے، نہ ان کو دودھ اور دوا دی جاتی ہے بلکہ جو چیزیں آسانی سے میسر ہیں ان کو بھی دینے میں کوتاہی برتی جاتی ہے۔ پیدائش کے وقت کالی کھانسی، ڈپ تھیریا، ٹی بی، اور کئی موذی امراض سے بچانے کے لیے سرکاری طور پر مفت ٹیکے کا انتظام ہے، مگر لوگ اس میں بھی کوتاہی برتتے ہیں اور طرح طرح کی غلط فہمیوں کی وجہ سے اپنے بچوں کو اس طرح کا ٹیکہ لگانے سے روکتے ہیں۔

پولیو جیسی بیماری جس میں بچہ زندگی بھر کے لیے اپاہج ہوجاتا ہے، سرکار نے مہم چلا کر اور گھر گھر جا کر پولیو کی خوراک پلوانے کا انتظام کیا ہے، مگر بہت سے مسلمان گھرانوں کے لوگ اپنے بچوں کو پولیو کا ٹیکہ نہیں دلوانا چاہتے۔ بعض جاہل لوگوں کے ساتھ ساتھ اچھے خاصے مولوی نما لوگ اور مذہبی لوگ بھی اس طرح کا ٹیکہ لگوانے سے منع کرتے ہیں اور پولیو کارکنان کے ساتھ مار پیٹ کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ کسی نے یہ غلط فہمی پھیلا دی ہے کہ پولیو کی خوراک پلانے سے بچے نامرد یا بانجھ ہوسکتے ہیں، اس لیے وہ پولیو کا ٹیکہ لگانے سے روکتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ:

- مسلمانوں میں جاہل بچوں اور اسکول چھوڑنے والے بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

- مسلمانوں میں بیمار، لاغر، ذہنی طور پر کمزور اور مجہول قد کے بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔
- مسلمانوں میں بچہ مزدوری کی شرح سب سے زیادہ ہے۔
- مسلمانوں میں معذور بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔
- مسلمانوں میں جن بچوں کو جرائم پیشہ بنایا جاتا ہے ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔
- مسلمانوں میں بچوں کا جنسی استحصال سب سے زیادہ ہوتا ہے۔
- مسلمانوں میں ہیومن چائلڈ ٹریفکنگ سب سے زیادہ ہے۔
- مسلمانوں میں بھیک مانگنے والے بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

مجموعی طور پر مسلمان بچوں کے بنیادی انسانی حقوق کی جس درجے پامالی ہوتی ہے اتنی پامالی کسی دوسری قوم میں نہیں ہے۔افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان بچوں کے حقوق کی اس درجہ اور اتنے بڑے پیمانے پر پامالی دیکھنے کے باوجود قوم کے اندر کوئی سوچ اور غیرت پیدا نہیں ہورہی ہے اس سے زیادہ شرمناک اور اندوہناک کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔مسلمانوں میں کام کرنے والی بڑی بڑی دینی، ملی تنظیمیں اپنے بچوں کے حالات زار سے بے خبر چند ایسے مسائل میں الجھے ہیں جس کی اہمیت یقیناً اس مسئلہ کے مقابلے کم ہے۔جس قوم میں 90-95% فیصد بچوں کا مستقبل محفوظ نہیں ہے، اس قوم کا مستقبل کیا ہوگا۔لہٰذا وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے بچوں کی فکر کریں اور ان کو دنیوی اور اخروی دونوں عذاب سے بچانے کا اہتمام کریں۔ملی تنظیموں کو اپنے بجٹ کا پچیس فیصد حصہ اور اپنی سرگرمیوں کا پچاس فیصد حصہ اپنے بچوں کی حفاظت پر لگانا چاہیے۔حکومت نے بچوں کی فلاح کے لیے بہت سارے منصوبے بنائے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اندر ایسے ادارے اور تنظیمیں بنائیں جس کے ذریعے ان منصوبوں کا فائدہ ملت کے نونہالوں تک پہنچ سکے اور ہم اپنے بچوں کو ایک تعلیم یافتہ، خوشحال اور صحت مند ماحول اور مستقبل دے سکیں۔

جس قوم کا بچپن محفوظ نہیں ہے اس قوم کا مستقبل کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔حضورؐ

نے بچوں کو جنت کا پھول کہا ہے۔ پھول خوبصورت اور دل پذیر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت نازک ہوتا ہے اس لیے اس کی بہت احتیاط سے دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ پھول کی خوبصورتی برقرار رہے اور اس کا رنگ اور خوشبو قائم رہے اس کے لیے بہت التزام و اہتمام کی ضرورت ہے۔ بچوں کا پہلا فرض والدین پر ہے۔ ان کی غذا، لباس، دوا، رہائش، ضروری آسائش کی فراہمی اور ان کی تعلیم و تربیت کی بنیادی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے۔ بچوں کی کفالت میں صرف ان کی غذا ہی شامل نہیں ہے بلکہ وہ تمام ضروری چیزیں جو ان کے صحت مند ارتقاء کے لیے لازمی ہیں وہ سب چیزیں چاہئیں۔ کسی وجہ سے اگر والدین بچوں کو صحیح اور پوری کفالت کرنے میں قاصر ہیں تو سماج اور ریاست کی ذمہ داری بنتی ہے کہ بچوں کی کفالت، صحت، تعلیم اور تربیت کا انتظام کرے اور ان کو ظلم و استحصال سے بچائے نیز ان کو ایک باوقار شہری کی حیثیت سے پروان چڑھانے میں مدد کرے۔ اس کے لیے جو گارجین کمزور ہیں اسلام ریاست پر یہ ذمہ داری ڈالتا ہے کہ ان کی کفالت کا متبادل انتظام کرے اور بچوں کی ضروریات کے لحاظ سے ان کا وظیفہ مقرر کیا جائے تاکہ ان کی صحت مند خطوط پر پرورش و پرداخت ہو سکے۔

آج کے جدید دور میں ان امور کو متحقق کرنے کے لیے دنیا کے دساتیر اور قوانین میں متعدد دفعات شامل کی گئی ہیں نیز بین الاقوامی اداروں کی جانب سے بھی ایسی کوششیں ہو رہی ہیں۔ بھارت کے دستور میں جہاں دیگر تمام طبقات کو تحفظ دیا گیا ہے اسی طرح بچوں کو بھی بنیادی حقوق کے باب میں جگہ دی گئی ہے اور ان کو ظلم و ستم سے بچانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

دستور ہند کے بنیادی حقوق کی دفعہ 23 میں بچوں کے خرید و فروخت (Trafficing)، ان سے بے گار لینے اور ان سے جبراً خدمت لینے جیسے امور کی ممانعت کی گئی ہے اور اسے قابلِ تعزیر جرم مانا گیا ہے۔ دفعہ 27 میں 14 سال سے کم عمر کے بچوں کو کسی ایسی فیکٹری اور کانوں میں اور اسی طرح مزدوری کی تمام خطرناک صورتوں کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اس

کے علاوہ ضمیر کی آزادی، زندگی کی آزادی، عقیدہ اور مذہب کی تعلیم وتبلیغ کی آزادی وغیرہ بھی بچے کو دی گئی بنیادی حق کی توسیع وتفصیل ہے۔ دستور کے رہنما اصول کی دفعہ 45 میں 14 سال کی عمر تک کے بچوں کی مفت لازمی تعلیم کی ذمہ داری ریاست کی قرار دی گئی ہے۔ دفعہ 46 میں تمام کمزور طبقات کے تعلیمی اور معاشی تحفظ کی بات کی گئی ہے۔

اس طرح ایک وسیع خاکے کے تحت بچوں کی کفالت، صحت، تعلیم اور تحفظ کو دستوری ضمانت حاصل ہے۔ 1959 میں حکومت ہند نے حقوق اطفال کا اعلامیہ جس کو Declaretion of The Rights of Child 1959 کہا جاتا ہے جاری کیا جس کے تحت تعلیم، صحت، رہائش، ظلم و استحصال سے تحفظ، علیحدہ نام اور قومیت اور آزادی و وقار کی فضا میں پرورش کو ہر بچے کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے۔ مرکز اور ریاستوں میں باضابطہ بچوں اور عورتوں کی فلاح کی باضابطہ وزارت ہے جس کے تحت بچوں کی محفوظ ولادت، زچہ کو غذا دوا کی سہولت، بچوں کو موذی امراض سے بچانے کے لیے ٹیکہ اور ان کو تغذیہ کی کمی سے بچانے نیز ان کی تعلیم وغیرہ کا معقول انتظام کرنے کی تدابیر اختیار کرنے کا ذمہ دیا گیا ہے۔ اس وقت اس ادارے کو کافی وسائل فراہم کیے گئے ہیں اور اس کا دائرہ بڑھا کر اس کو مؤثر بنانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ ساری سہولتیں ایسی ہیں جن سے ملت کو بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ملی اداروں اور تنظیموں کو ادارے بنا کر اور این جی او رجسٹر کرا کر ان سے فائدہ اٹھانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ہماری تھوڑی توجہ سے ایک بڑا مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ اقوام متحدہ کی ذیلی شاخ یونیسکو کی طرف سے ساری دنیا میں بچوں کے حقوق کی بازیابی اور اس کے مؤثر نفاذ کی بھرپور کوشش ہورہی ہے۔ ہندوستان میں اس کے تعاون سے بہت ساری فلاحی اسکیمیں پورے شدومد سے چلائی جارہی ہیں۔

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات، دستور ہند کی ضمانتیں، وزارت اطفال کی کوششیں، عالمی اداروں کے تعاون سے بچوں کی فلاح کے جامع منصوبوں پر عمل کیا جارہا ہے۔ اگر مسلم کمیونٹی اس باب میں حساس، بے دار منظّم اور مستعد ہوگی تو

وسائل بھی مل جائیں گے، اور کاموں کے لیے ضروری تکنیکی تعاون بھی حاصل ہوگا۔ اس طرح ہم اپنے اندرونی وسائل، سرکاری سہولیات اور بین الاقوامی تعاون سے اپنے ملت کے نونہالوں کا مستقبل سنوار سکتے ہیں۔

اس سال بھارت میں کیلاش ستیارتھی کو بچوں کی فلاح کے لیے کام کرنے کے باب میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو پاکستان کی ملالہ یوسف زئی کے ساتھ جس نے طالبان کی مخالفت کے باوجود بچیوں میں تعلیم کے فروغ کی کوشش کی ہے، نوبل پرائز دیا گیا ہے۔ کیلاش ستیارتھی کو بچوں کے حقوق کے باب میں کام کرنے کا بڑا تجربہ ہے۔ ملی اداروں کو چاہیے کہ وہ اپنے یہاں خصوصی پروگرام رکھیں اور اس طرح کے لوگوں کو مدعو کریں۔ ان کے تجربات اور خدمات سے فائدہ اٹھائیں۔ اس وقت ماحول بہت سازگار ہے بس ایک مثبت پہل کی ضرورت ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلم ملت کو ایک مضبوط بنیاد دینی ہے تو بغیر وقت گنوائے اپنی نئی نسل کے تحفظ، تعلیم، صحت اور اخلاقی تربیت کے لیے قوم کو بیدار اور منظّم ہوکر آگے آنا ہوگا۔

بچوں کے بنیادی حقوق کے تحفظ کے باب میں یہ گفتگو اس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ بچوں کی فطری ساخت کیا ہے اور دنیا میں انسانی وجود کا مقصد کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو انسانوں سمیت پوری کائنات کا خالق ہے اس نے ہر شے کی پیدائش یا عالم وجود میں آنے کی غرض و غایت نہایت واضح الفاظ میں بیان کردی ہے۔ اللہ نے اس پوری کائنات کو انسانوں کے لیے ایک ایسی جائے قیام کے طور پر تشکیل دیا ہے جہاں انسان آسانی سے رہتے ہوئے کائنات کی تمام چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیا میں اپنا مقصد وجود پورا کرسکے۔ یہ پوری کائنات نہ صرف انسان کے فائدے کے لیے بنائی گئی ہے بلکہ اس کے لیے مسخر کردی گئی ہے تاکہ وہ بلا روک ٹوک ان کا استعمال کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے۔

انسان بنیادی طور پر اس کائنات میں اللہ کا خلیفہ ہے یعنی ایک بااختیار مخلوق ہے

جس کو تصرف اور اختیار کی آزادی دی گئی ہے۔ اس تصرف اور اختیار کی آزادی اور قوت کو کس طرح استعمال کیا جائے تا کہ اس کی زندگی خیر وصلاح سے ہمکنار ہو اور وہ آخرت میں اللہ کے حضور کامیاب اور سرخرو ہو اس کے لیے اللہ نے نبی اور وحی کے ذریعے اس کا مقصد وجود بھی واضح کیا ہے۔ دنیا میں انسان کی تخلیق اللہ کے بندے کے طور پر ہوئی ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی کا بنیادی مقصد اللہ کی بندگی اور اطاعت ہے یعنی اللہ کے حکم و ہدایت کی پابندی ہے۔ اسی سے حق خلافت ادا ہوگی۔ اگر ایک شخص خود کو اس حکم و ہدایت سے الگ کرلے گا تو وہ خلافت کے منصب سے روگردانی مانی جائے گی جس کے نتیجے میں خود اس کی زندگی بے اعتدالی، شر اور ظلم کی شکار ہوگی اور اس دنیا میں بھی شر وفساد بھر جائے گا۔ لہٰذا جب ایک بچہ عالم وجود میں آتا ہے تو لازمی ہے کہ اس کی فطرت کے مطابق اس کی پرورش و پرداخت کی جائے تا کہ وہ منصب خلافت کا اہل ہو سکے اور خدا کے آخری فیصلے میں کامیاب و سرخرو ہو۔

لہٰذا ایک بچے کا صرف اتنا ہی حق نہیں ہے کہ اس کو اچھی اور متناسب غذا دی جائے، موسم کے لحاظ سے تن ڈھانکنے کے لیے مناسب کپڑا دیا جائے۔ اس کے سر پر چھت ہو، اس کے دوا علاج کا معقول انتظام ہو، اس کے لیے اچھی اور چیزیں ضروری ہیں جو ہر والدین کو حسبِ استطاعت عطا کرنی چاہیے اور جہاں والدین عطا کرنے سے قاصر ہیں وہاں سرکار اور سماج کو یہ ذمہ داری اپنے اوپر لینا چاہیے۔ لیکن بچے کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اس کی فطرت مسخ نہ کی جائے بلکہ اس کی فطرت کے مطابق اس کی نشوونما کی جائے۔

حضورؐ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔ یعنی ہر بچہ پیدا تو خالصتاً ایک بندہ خدا کے طور پر ہوتا ہے جو کفر و شرک سے پوری طرح نا آشنا ہوتا ہے لیکن وہ جس گھرانے اور ماحول میں پیدا ہوتا ہے اس گھر اور سماج کے لوگ جو دین وعقیدہ رکھتے ہیں اس کی

نشوونما اور تربیت اسی انداز کی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ بھی والدین کی طرح کافر ومشرک بن کر ابھرتا ہے۔ لیکن جو بچے مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کو لازمی طور پر ان کی فطرت کے مطابق مومن وموحد بن کر ابھرنا چاہیے۔ لہٰذا ایک بچے کا یہ ایک بنیادی پیدائشی اور ازلی حق ہے کہ اس کی نشوونما اور تربیت خالص توحید کے ماحول میں ہو، تاکہ وہ بندگیٔ رب کے اپنے منصبی فرائض کو بحسن وخوبی انجام دے کر اللہ کے آخری فیصلے میں کامیاب و سرخرو ہو۔ اس لیے حضورؐ نے بچوں کی اچھی تعلیم وتربیت کی ہدایت کی ہے۔

حضرت ابنِ عباس سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''اپنی اولاد کے ساتھ رحم وکرم کا برتاؤ کرو اور ان کی بہتر تربیت کرو۔'' (ابن ماجہ)

ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا: ''والد اپنی اولاد کو جو کچھ دیتا ہے اس میں سب سے بہتر عطیہ ان کی تعلیم و تربیت ہے۔'' (مشکوٰۃ، جامع الاصول) قرآن نے تمام اہل ایمان کو جو رہنما اصول دیے ہیں اس میں کہا گیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔

انسان کی زندگی صرف دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے انسان کی زندگی دنیا اور آخرت دونوں تک پھیلی ہوئی ہے، آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی مختصر اور محدود ہے۔ آخرت لافانی اور غیر محدود ہے۔ اس لیے کامیابی صرف دنیا کی کامیابی نہیں ہے بلکہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ اس لیے ایک بچے کی تعلیم وتربیت، نشوونما اور پرورش میں صرف اس کی مادی ضرورتوں کو ہی اہمیت نہیں دینی چاہیے بلکہ اس کی دینی، روحانی اور اخلاقی ضرورتوں کا بھی لحاظ رکھنا لازمی ہے ورنہ انجام کار یہ گھاٹے کا سودا ہوگا۔

اس لیے بچوں کے حقوق کے باب میں جہاں اوپر بیان کیے گئے تمام پہلوؤں پر دھیان دینا ضروری ہے جو دنیا بھر کے دساتیر، قوانین اور بین الاقوامی اداروں کے اعلامیہ میں موجود ہیں وہیں قرآن اور رسول پاک ﷺ کے ان ارشادات پر بھی دھیان دینا ضروری ہوگا تبھی صحیح معنوں میں اسلامی نقطہ نظر سے بچوں کے حقوق کی حفاظت ہو سکے گی

اور تبھی یہ بچے ایک اچھے انسان، ایک اچھے شہری، ایک اچھے مسلمان، خدا کی زمین پر صحیح معنوں میں خلیفہ اور اللہ کے بندے، قرآن کے مطلوبہ انسان اور مطلوبہ مومن بن سکیں گے۔ اس لیے بچوں کی دینی، اسلامی ماحول میں ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت کا بنیادی انسانی حق ہے جس کی ادائیگی کے بغیر بچوں کا بنیادی حق ادانہیں ہوسکتا ہے۔

■❖■

مسلمان معاشرے میں
پسماندہ برادریوں کے حقوق

کوئی اگر ہم سے پوچھے کہ دنیا بھر کے ادیان اور نظریات میں اسلام کا سب سے بڑا امتیاز کیا ہے؟ تو اس کا سیدھا اور واضح جواب ہے (1) توحید اور (2) انسانی شرف و مساوات۔ اسلام کی رو سے اللہ ایک ہے، اس کا کوئی ثانی اور مثل نہیں ہے اس کے برابر کوئی نہیں۔ لہٰذا وہ تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اپنے دین اور عقیدے کو شرک اور کفر کے شائبہ سے پاک کرکے صرف اور صرف ایک خدا کی بندگی بجالائیں۔ قرآن نے اللہ کی ذات، صفات اور اختیارات کے بارے میں اتنی واضح اور تفصیلی ہدایتیں دی ہیں کہ اگر ایک بار کوئی انسان اس کا صحیح ڈھنگ سے استحضار کرلے تو وہ تا عمر شرک و کفر کی گندگی اور گمراہی سے محفوظ ہوجائے گا۔

توحید ہی کی طرح قرآن کا انسانی شرف و مساوات کا نظریہ پوری طرح واضح اور سورج کی طرح روشن ہے۔ قرآن کی رو سے اللہ نے آدم کی تخلیق کی اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں کو زمین میں اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ یعنی جس طرح زمین میں مرد اللہ کا خلیفہ ہے، اسی طرح عورت بھی اللہ کی خلیفہ ہے۔ پھر ان دونوں مردوعورت سے باقی تمام

انسان پیدا ہوئے۔ اس طرح تمام انسان اپنی تخلیق اور پیدائش میں ایک خدا کی مخلوق اور ایک ماں باپ کی اولاد ہے۔ ایک ماں باپ کی کئی اولادیں ہوتی ہیں، چونکہ سب کی اصل اورنسل ایک ہوتی ہے اس لیے سب آپس میں برابر ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان شرف و عزت میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔ ان کے حقوق اور اختیار برابر ہوتے ہیں۔قرآن نے واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ ہم نے اولاد آدم کوعزت وتکریم بخشی ہے۔یعنی جو بھی انسان ہے سب مساوی اورمحترم ہیں۔حضورؐ نے فرمایا: تم سب آدم کی اولاد ہواور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔ اس طرح دنیا میں جتنے بھی انسان ہیں ان کی اصل اورنسل ایک ہی ہے۔ اس لیے سب برابر ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے انسانوں کی آبادی بڑھتی گئی، یہ لوگ مختلف جغرافیائی خطوں میں بستے اور پھیلتے چلے گئے، پھر بعض طبعی، فطری، جغرافیائی اور ماحولیاتی وجوہات کی وجہ سے ان کے رنگوں اورنسلوں میں فرق آنے لگا۔نئی نئی زبانوں کا جنم ہوا، نئی تہذیب، نیا تمدن اور نئے نئے ضابطے بننے لگے۔ انسانوں نے اپنی عقل وفہم اور تجربات و ماحول سے نئی نئی چیزیں ایجاد کیں۔ پھر عقائد، نظامِ عبادت، تمدن، اخلاق، سماجی اور سیاسی ضابطے، معاش اورفن کے طریقے وجود میں آنے لگے۔ ان میں کچھ چیزیں غلط تھیں اور کچھ چیزیں صحیح۔ اللہ نے انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے نبی اور رسول بھیجے، کتابیں اور صحیفے نازل کیے۔ کچھ لوگوں نے مانا، کچھ لوگوں نے نہیں مانا۔نتیجتاً انسانوں میں اختلاف و انتشار، تنوع اور تضاد کی مختلف بلکہ ان گنت صورتیں پیدا ہونے لگیں۔ جس نے وقت کے ساتھ اداروں اور عقائد کی شکل اختیار کرلی اور اس طرح فکر ونظر اور اخلاق و معاشرت کے ہزاروں روپ رنگ ابھرے جس نے مستقل اداروں اور دبستان کی شکل اختیار کرلی۔ اب کوئی ایک مذہب نہیں رہ گیا، کوئی ایک عبادت کا طریقہ نہیں رہا اور نہ کوئی ایک طرزِ معاشرت اور طرزِ تمدن رہ گیا ۔ہزاروں نسل، ہزاروں رنگ، ہزاروں زبان، ہزاروں خاندان، ہزاروں برادریاں، ہزاروں قبیلے اور ہزاروں قوم دھرتی پر معرض وجود میں آ گئے۔

جس میں بعض نے خود کو دوسرے سے ممتاز اور برتر بتایا اور دوسروں کو کمتر اور ذلیل مانا۔ پھر ان کے درمیان نسلی برتری اور قومی تفاخر کی جنگ شروع ہوئی اور انھوں نے رنگ، نسل، جنس، زبان اور علاقہ کی بنیاد پر فرق و امتیاز پیدا کر دیا۔

بات صرف یہیں پر آکر نہیں رکی بلکہ جس نے اپنی برتری کا نعرہ دیا اس کو قائم اور باقی رکھنے کے لیے کمتر قوموں کی نسل کشی شروع کر دی اور ان پر ظلم و استحصال کے پہاڑ توڑ دیے۔ کچھ لوگوں نے اس ظالمانہ نظام کا مقابلہ کیا اور اپنی کھوئی ہوئی عزت واپس لائے جن کو Accomodate کرکے اعلیٰ نسلوں میں شامل کرلیا گیا اور ان سے صلح کرلی گئی اور کچھ لوگوں نے ان کے ظلم و استحصال کی تاب نہ لاکر اپنی شکست تسلیم کرلی اور اس طرح ذلیل و حقیر بن کر جینے پر راضی ہوگئے۔ اس طرح اعلیٰ اور ادنیٰ ذاتوں کی تقسیم شروع ہوئی جو آج بھی مختلف سماجی اکائیوں کی شکل میں دنیا کے ہر سماج میں موجود ہیں۔

اللہ نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ دنیا کے ہر خطے میں اور ہر قوم اور زبان میں اپنا دین بھیجا اور ان کو توحید کے ساتھ ساتھ انسانی شرف و مساوات کی تعلیم دی۔ مگر اکثریت نے انبیاء کی بات نہیں مانی اور خدا کے حکم کی روگردانی کی اور جاہلیت وعصبیت کے اپنے سماجی چلن پر قائم رہے۔ اخیر میں اللہ نے حضورﷺ کی شکل میں اپنا آخری نبی بھیجا اور ان کے ذریعے قیامت تک ساری دنیا کے انسانوں کے لیے ایک مکمل دین نازل فرمایا تاکہ دنیا اپنی ابدی گمراہیوں سے نجات پاکر صحیح اور سچے دین کو اختیار کرلے۔ اس دین کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ خدا ایک ہے اس کے علاوہ اس پوری کائنات میں چاہے انسان ہو یا جن، بادشاہ ہو یا دیوی دیوتا، سورج، چاند ہو یا پہاڑ، سمندر ہو یا دریا نہ تو کوئی خدا ہے اور نہ خدائی میں ذرہ برابر شریک ہے۔

اسی طرح اس کی دوسری دفعہ یہ ہے کہ تمام انسان چاہے کالے ہوں یا گورے، عربی ہوں یا عجمی، کوئی زبان بولتے ہوں، کسی نسل برادری اور قوم کا حصہ ہوں، اس کی کوئی جنس اور رنگ ہو سب خدا کے بندے، ایک ماں باپ کی اولاد، آپس میں برابر اور بھائی بھائی ہیں۔

کسی پر کسی کو کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ ہاں! جو اللہ سے جتنا ڈرنے والا ہے یعنی اس کے حکموں کا جو جتنا پابند ہے، وہ اللہ کے نزدیک اتنا ہی عزت واکرام کا مستحق ہے۔

آج سے پندرہ سو سال پہلے جب اسلام نے حضورؐ کی زبانِ اقدس سے عرب کے قبائلی اور طبقاتی سماج میں انسانی شرف و مساوات کا نعرہ بلند کیا تو پہلے تو عرب کے طبقاتی برتری پر قائم سماج میں ایک زلزلہ آ گیا اور وہ سب لوگ جو اپنی برتری کے زعم باطل میں مبتلا تھے، اسلام کو مٹانے کے لیے اور اس آواز کو دبانے کے لیے اکٹھے ہوکر کھڑے ہوگئے اور پوری قوت سے اسلام پر اور حضورﷺ پر حملہ بول دیا۔ مگر دوسری طرف سماج کے دبے کچلے لوگوں نے جب یہ حیات بخش پیغام سنا تو وہ استحصال و بربریت کے حصار کو توڑ کر جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ مکے کے سرداروں کی ناقابل بیان ایذا رسانیوں کے باوجود انھوں نے اسلام کی راہ نجات کو چنا اور انھوں نے اپنی عزیمت اور قربانیوں سے ایک ایسی آندھی برپا کی جس کے نتیجے میں طبقاتی سماج کے تمام محفوظ قلعہ خس وخاشاک کی طرح ہوا میں اڑ گئے۔ جو کام ہزاروں برسوں میں نہیں ہوا وہ محض 23 برس میں ہوگیا۔

پھر یہ جیالے جب حصارِ عرب سے نکل کر توحید، انصاف او رمساوات کا پرچم لے کر مشرق و مغرب میں پھیل گئے تو محض ایک صدی کے اندر اندر وہ ایشیا، افریقہ اور یوروپ کے بڑے علاقے میں پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ جہاں گئے اپنے حیات آفریں پیغام سے نہ صرف ملکوں اور زمینوں کو فتح کیا بلکہ لاکھوں انسانوں کو اس دین رحمت میں پناہ لینے کا موقع دیا۔ توحید و مساوات کے علم بردار مختلف گروہ عسکری، تجارتی اور تبلیغی مشنوں کے ساتھ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بھی آئے۔ یہاں انھوں نے اپنی حکومتیں بھی قائم کیں، تجارتی مراکز بھی قائم کیے اور عوام الناس کی تبلیغ و اصلاح کے لیے خانقاہوں اور دینی اداروں کا قیام بھی عمل میں لایا۔ جس سے ایک بڑی آبادی متاثر ہوکر اسلام میں داخل ہونے لگی۔

ہندوستان بنیادی طور پر طبقاتی سماج پر مشتمل ملک ہے۔ بودھ، جین اور سکھ دھرم

گروؤں اور خود ہندوقوم میں بہت سے مصلحین نے زمانہ قدیم سے ہندوسماج میں رائج ذات پات پر مبنی طبقاتی نظام کی اصلاح کی کوشش کی مگر وہ سب کے سب اپنی کوششوں میں ناکام رہے اور ایک پنتھ اور وچار بن کر تاریخ کا ایک باب بن کر رہ گئے کیونکہ انھوں نے طبقاتی سماج کی جڑ پر کبھی کلہاڑی نہیں چلائی، وہ صرف اس کی شاخوں کو کاٹنے میں مصروف رہے۔

اس طبقاتی سماج کی جڑ میں ان کا شرک کا عقیدہ تھا۔ جب خدا کی انسانی تجسیم ہوگئی، اس کے بھی بیوی بچے ہوگئے وہ بھی جینے مرنے لگا، اس کو بھی اپنی ستّا بچانے کی فکر ستانے لگی، تو اس کے اندر انسانی خصوصیات کا پیدا ہونا فطری تھا۔ اب خدا کے کئی خاندان ہوگئے، جن کے درمیان برتری کی جنگ شروع ہوگئی اس طرح کوئی چندربنشی ہوگیا تو کوئی سوریہ بنشی ہوگیا، کوئی ہوا کی اولاد قرار پایا تو کوئی سمندر کی اولاد ہوگیا۔ جب تک یہ عقیدہ ختم نہیں ہوتا ہے اس عقیدہ پر مبنی سماج اور اس سماج کے امتیازات ختم نہیں ہوں گے۔

اس لیے اس طبقاتی سماج کے پیچھے وہ عقیدہ کام کررہا ہے جس کی بنیاد پر یہ سماج کھڑا ہے۔ لہٰذا اس سماج میں رہتے ہوئے انسانی شرف و مساوات کے نظریہ کو قبول کرنا ناممکن تھا۔ اسلام جب بھارت میں آیا تو اس نے اس لوہے کے خول میں پہلی بار ایک راستہ بنایا۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کو ایک حیات بخش اور جانفزا ہوا کا جھونکا محسوس ہوا اور وہ اس بند خول سے نکل کر اسلام کی کھلی فضا میں سانس لینے لگے۔

بھارت میں جب اسلام آیا اس نے اس ملک کے خاص و عام کے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا اور ملک کے ہر قوم قبیلے، ذات برادری کے لوگ یہاں تک کہ آدی باسی، خانہ بدوش برادریوں کے لوگ اور سماج کے حاشیہ پر رہنے والے سینکڑوں ذاتوں نے اسلام قبول کرلیا اور وہ مسلمان ہوگئے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو بھارت میں اسلام عربوں کے ذریعہ سے نہیں بلکہ ایرانی اور تورانی، مغل، افغان اور منگول قوموں کے ذریعہ آیا، جس کے بارے میں

مورخین کی رائے یہ ہے کہ بھارت میں اسلام سکنڈ ریٹ مسلمانوں کے ذریعہ آیا جو ہندوستان میں اپنے اسلام کے ساتھ ساتھ اپنے نسلی اور خاندانی تعصّبات کے ساتھ داخل ہوئے۔ لہٰذا ان کی طرزِ معاشرت اور اخلاق پر اس کی واضح چھاپ نظر آتی ہے۔

ایران اور توران سے آئے مسلمانوں نے کبھی مقامی مسلمانوں کو اپنے برابر نہیں سمجھا۔ انھوں نے یہاں اپنی حکومت تو قائم کی مگر مقامی مسلمانوں کی فکری اور تمدنی اصلاح کی کوئی خاص کوشش نہیں کی، خود ان کا اپنا سیرت و کردار مثالی نہیں تھا۔ علماء، صوفیا، اور خانقاہوں کے ذریعہ کچھ کوششیں ضرور ہوئیں، مگر وہاں بھی گروہی اور مسلکی عصبیت دیکھنے کو ملتی ہے۔

ہندوستان میں مختلف مسلمان خاندانوں کی سات آٹھ سو سال تک حکومت قائم رہنے کے باوجود عوامی تعلیم وتربیت کا کوئی سرکاری نظام ایسا نہیں تھا جہاں تمام طبقات کے لوگوں کو یکساں تعلیم وتربیت کے مواقع میسر ہوں، وہ لوگ جو شرفا تھے اور دربار سے وابستہ تھے ان کے اندر علم وشعور کی روشنی پھیلی مگر عام عوام تعلیم کی نعمت سے بے بہرہ رہے۔

ہندوستان میں جو مسلمانوں کی حکومت تھی وہ خلافت کے بجائے ملوکیت تھی۔ بادشاہوں نے اپنی حکومت کو دوام واستحکام دینے کے لیے جاگیرداری اور زمینداری نظام قائم کیا اور اس طرح وہ عام عوام پر حکومت کرتے تھے۔ جاگیرداروں اور زمینداروں کو لامحدود اختیارات حاصل تھے، جس کی وجہ سے ان کو ظلم وتعدی سے باز رکھنے کا کوئی نظام نہیں تھا۔ اس لیے اسلام کے آنے کے باوجود لوگ اس کے برکات سے محروم رہے اور طبقاتی سماج اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ قائم رہا۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ مسلمانوں میں چھوا چھوت کی رسم باقی نہیں رہی۔ لوگ کسی کو چھونے یا اس کا سایہ پڑنے سے ناپاک نہیں ہوتے تھے۔ مسجد میں جانے اور ساتھ نماز پڑھنے کی چھوٹ تھی۔ ایک کنواں اور تالاب سے پانی لے سکتے تھے۔ ایک دوسرے کا ذبیحہ کھاتے تھے لیکن کئی طرح کے امتیازات پوری شدت سے قائم رہے۔ شرفا اور عام عوام ایک ساتھ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ان کے درمیان

شادی بیاہ کا معاملہ نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح مسلم دورِ حکومت میں بھی ذات برادری کا نظام پوری طرح پختہ اور Institutionalised ہوگیا تھا اور مسلمان مختلف طبقات اور ذاتوں میں بٹ گئے تھے۔ آج مسلمانوں میں جو ذات پات اور طبقاتی تفاوت پایا جاتا ہے وہ مسلم عہد سے اس دور تک چلا آ رہا ہے۔ اس دور میں مسلمانوں کی اصلاح کے لیے تحریکیں اٹھیں، اس نے عقائد کی اصلاح پر تو زور دیا اور تزکیہ نفس کی تعلیم دی، مگر ذات پات کے سماجی نظام کو جوں کا توں تسلیم کرتے ہوئے اس کی اصلاح کی کوشش نہیں کی حالانکہ یہ ضرور ہوا کہ مسلم پسماندہ طبقہ میں سے اگر کوئی شخص بڑا عالم یا فقیہ ہوا تو اس کی عظمت تسلیم کرتے ہوئے اس کو عزت کا اعلیٰ مقام دیا گیا مگر نہ تو خود اس نے اور نہ ہی قوم کے ذمہ داروں نے دیگر ابنائے نوع کی تعلیم و اصلاح میں واجبی دلچسپی لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم سماج اشراف، ارذال اور اجلاف کے خانوں میں تقسیم ہوگیا جن کے درمیان بہت کم سماجی نقل وعمل (Mobility) پائی جاتی ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ اسلام میں مساوات کی تعلیم ایک کتابی حقیقت ہے مگر مسلمان سماج میں مساوات نہیں ہے۔ ہندوستان کے مسلم سماج کی بناوٹ اس تعلیم کے بالکل الٹ ہے۔

وقت اور حالات تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ مسلم حکومت کو سات سمندر پار سے آئے انگریز تاجروں نے ختم کر دیا، پہلے کمپنی سرکار اور پھر تاج برطانیہ کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ چونکہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لیے لازمی طور پر مسلمان منصب دار، جاگیردار، رؤسا اور زمینداروں نے انگریزوں کی مخالفت شروع کی جس کو فرو کرنے کے لیے انگریزوں نے ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملانا شروع کیا۔ انگریزوں نے جو نظام تعلیم قائم کیا اس کو ہندوؤں کے ایک طبقہ نے بڑھ چڑھ کر اپنایا ۔اس طرح انھیں انگریز سول ایڈمنسٹریشن اور حکومت کے اعلیٰ مناصب میں جگہ پانے کا موقع ملا۔ مسلمان اس ریس میں بچھڑ گئے۔ سرسید نے جب دیکھا کہ مسلمانوں نے منفی ردعمل اور انگریزوں سے ترک موالات کی جو روش اختیار کر رکھی ہے اس سے ہندوستان کا مسلم سماج، سیاست اور معیشت

کے میدان میں حاشیہ پر جانے لگا ہے تو انھوں نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا بیڑا اٹھایا اور مسلمان شرفا اور رؤسا کو اس بات کے لیے آمادہ Convince کیا کہ اگر وہ جدید تعلیم سے بے بہرہ رہیں گے تو پوری قوم شودروں کے مقام پر پہنچ جائے گی۔ سرسید کی کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں میں جدید تعلیم یافتہ ایک طبقہ ابھرا جس نے انگریز انتظامیہ میں اپنی جگہ بنانی شروع کی۔

جب ملک میں آزادی کی تحریک اٹھی تو ابتداً یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ مطالبہ تھی مگر بہت جلد یہ ہندو مسلم کشمکش میں تبدیل ہوگئی۔ ہندوؤں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ مسلمان پھر سے اس ملک میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو یہ ڈر ستانے لگا کہ ہندو چونکہ غالب اکثریت میں ہیں، اس لیے ہندوستان میں ہندو راج قائم ہو جائے گا۔ آزادی کا مطالبہ جیسے جیسے شدت اختیار کرتا گیا ویسے ویسے ہندو مسلم کشمکش بھی تیز ہوتی گئی۔ ہندوستان میں ہندو مسلم کشمکش اسلام اور ہندو دھرم کی جنگ نہیں ہے بلکہ یہ دونوں قوموں کی قومی جنگ ہے جو ایک دوسرے پر برتری لے جانا چاہتی ہیں۔ انگریزوں نے اپنی پھوٹ ڈالو راج کرو کی پالیسی کے تحت اس کشمکش کی آگ میں گھی ڈالنے کا کام کیا جس کے نتیجہ میں ان دونوں قوموں کی آپسی چپقلش Point of No Return تک پہنچ گئی۔ دراصل ہندوؤں اور مسلمانوں کی یہ کشمکش ہندو اور مسلمان عوام کے درمیان نہیں تھی بلکہ ہندو اور مسلم شرفاء جن کو مڈل کلاس کہا جاتا ہے ان کے درمیان تھی۔ ان دونوں طبقات نے ایک دوسرے کی برتری تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور وہ برابری کا کوئی فارمولہ وضع کرنے میں ناکام رہے۔

ہندو مڈل کلاس کی قیادت بنیادی طور پر کانگریس کر رہی تھی جس میں تمام دوسرے طبقات اور گروہ شامل تھے اور مسلم مڈل کلاس کی قیادت مسلم لیگ کے ہاتھ میں تھی۔ مسلم لیگ بنیادی طور پر مسلمان نوابوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کی پارٹی تھی، اس وقت کے سماجی سیاسی ڈھانچے میں اس طبقہ کی اہمیت تھی اور گویا یہی مسلمان قوم اور مجموعی

طور پر مسلمان عوام کی قیادت کرتے تھے۔ جب کانگریس نے محسوس کیا کہ مسلم لیگ کی قیادت اور مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے سے کوئی مفاہمت اور مصالحت ممکن نہیں ہے تو اس نے نہایت ہوشیاری اور زیرکی سے اپنی پالیسی میں وسعت دیتے ہوئے 1932 میں مسلمان عوام سے براہ راست رابطے کی مہم شروع کی اور اس طرح مسلمانوں کی پسماندہ برادریوں اور حاشیہ پر رہے لوگوں کو سینٹر اسٹیج پر لاکر ایک متبادل قیادت کھڑا کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں مسلمان پسماندہ طبقات سے بہت سے لوگ ابھر کر اوپر آئے اور پہلی بار گویا ان طبقات کو آواز اور پہچان ملی۔ یہ لوگ قائدانہ مقام پر تو بہت کم پہنچے مگر ان کی عددی قوت سے کانگریس کو فائدہ پہنچا۔

اکبر الٰہ آبادی نے اس صورتحال پر طنز کرتے ہوئے کہا، جمن میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں، گو گرد راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں۔ دھیرے دھیرے جب اس طبقہ کو قائدانہ منصب ملا تو ان کی پہلی کشمکش اپنے ابنائے ملت سے شروع ہوئی اور وہ پہلے سے قائم و قابض لوگوں کو ہٹا کر ان کی جگہ پر فائز ہونے کے لیے بے تاب ہونے لگے۔ اس طرح مسلمانوں کے اندر ایک نئی سماجی کشمکش کا آغاز ہوا۔

اس کہانی کا سب سے افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اس دور کے مسلمان قائدین، مصلحین، علما اور روحانی پیشواؤں نے بھی اس بدلتے سماجی منظر نامے کو پسند نہیں کیا اور وہ مسلم سماج میں طبقاتی تعصب کو برقرار رکھتے ہوئے ایسی کسی کوشش کے خلاف تھے۔ سرسید احمد خان، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا احمد رضا خان جیسے مصلحین اور اعلیٰ روحانی پیشواؤں نے بھی مسلمانوں کے پسماندہ طبقات کو نظر انداز کرنے کی روش کو صحیح مانتے ہوئے صرف شرفاء اور اعلیٰ ذات کے لوگوں کو ہی دین وملت کا پاسدار مانا۔ ہمارے بڑے علماء اور قائدین کی اس بے رخی کی وجہ سے پسماندہ برادریوں کے اندر تلخی اور شدت پیدا ہوئی اور مسلمان ملت میں ذات پات کی کشمکش تیز ہوگئی۔ پسماندہ برادریوں میں نئی نئی قیادت سامنے آنے لگی جس کو کانگریس کی بھرپور حمایت حاصل تھی اس طرح ان میں شدت اور

تیزی پیدا ہونے لگی۔

بالآخر 1947ء میں آزادی کے ساتھ ملک تقسیم ہوگیا۔ نہ صرف مسلمانوں کی مسلم لیگی قیادت بلکہ بعض کانگریسی بھی راتوں رات اپنی وفاداری تبدیل کرکے پاکستان چلے گئے۔ ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہندوستانی مسلمانوں کی عظیم اکثریت بغیر گلے کی ریوڑ بن کر اس ملک میں بے یار و مددگار رہ گئی۔ اب یہی ہندوستان کی مسلم ملت ہیں۔

جب ہندوستان میں ہم مسلمان کی بات کرتے ہیں تو چند برادریوں تک گن کر رک جاتے ہیں گویا یہی مسلمان ہیں۔ اگر ان برادریوں کی آبادی تک ہندوستان میں مسلمانوں کو محدود کردیا جائے تو ان کی مجموعی آبادی پانچ چھ کروڑ سے زائد نہیں ہوگی۔ مگر اس وقت بھارت میں پندرہ سولہ کروڑ مسلمان ہیں جو اس ملک کی کل آبادی کا 17-18% ہیں۔ ہندوستان میں سید، شیخ، پٹھان، ملک، انصاری، راعین، منصوری، ادریسی، قریشی، عراقی اور سیفی برادریاں ہی نہیں رہتی ہیں جو معروف ومشہور ہیں، بلکہ ان کے علاوہ ملک کی تمام ریاستوں اور ہر خطے میں سینکڑوں کی تعداد میں ذیلی برادریاں ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود اپنے عقائد اور سماجی بناوٹ کے لحاظ سے کفر اور اسلام کی سرحد پر کھڑی ہیں۔ ہمیں اس ملک میں یہ مہم چلانی ہوگی کہ جو بھی کلمہ گو ہیں اور جس نے اعلانیہ اسلام سے نکلنے کا اعلان نہیں کیا ہے وہ چاہے اپنے عقائد، اعمال اور اخلاق کے اعتبار سے کتنی ہی جاہلانہ اور غیر اسلامی رسموں اور طریقوں میں ملوث ہوں، وہ سب مسلمان ہیں اور ان کو اسلام کے مین دھارے میں لانا ہے، ہمارے ملک کی وہ تنظیمیں جو غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت عام کرنا چاہتی ہیں ان کو اپنی ترجیحات پر پھر سے غور کرنا چاہیے اور مسلمانوں میں جو لوگ غیر اسلام کی سرحد پر کھڑے ہیں ان کو اسلام کے دائرے میں لانے کے لیے باضابطہ اور منظّم ملک گیر کوشش شروع کرنی چاہیے ورنہ اس وقت اسلام دشمن قوتیں جس طرح اپنا سازشی جال بچھا رہی ہیں اندیشہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اسلام سے نکال کر کفر کے دائرے میں لے جائیں۔

ہمارے یہاں جب ذات پات کی بات ہوتی ہے تو بہت سے لوگ آنکھوں دیکھی حقیقت کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام میں ذات پات نہیں ہے۔ یہ بات نہ تو حقیقت واقعہ سے میل کھاتی ہے اور نہ قرآن کے فرمان سے مطابقت رکھتی ہے۔قرآن نے سورہ الحجرات آیت ۱۳ میں واضح طور پر اعلان کیا ہے۔

> ''اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور اس سے تمہاری قوم اور قبیلے بنائے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ اللہ ہر چیز سے باخبر ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

اس آیت سے واضح ہے کہ مسلمانوں میں بھی قوم اور قبیلے ہیں، مگر اس کی حیثیت ہندوؤں کے دیومالائی ورن آشرم کی طرح نہیں ہے جہاں کوئی پیدائشی شریف اور پیدائشی رذیل ہوتا ہے۔ یہاں قوم، قبیلہ، ذات اور برادری محض پہچان کے لیے ہیں جیسے ایک شخص کا نام ہوتا ہے۔کسی کے نام میں کوئی شرف و امتیاز نہیں ہوتا۔ اس لیے اس بنیاد پر تعصب برتنا اور کسی کو نیچا اور کسی کو اونچا سمجھنا غلط ہے۔حضورؐ کی ایک واضح حدیث ہے جس کا مفہوم ہے کہ ایک شخص کے برا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے کسی بھائی کو نیچا سمجھے۔

شرعی، انسانی اور اخلاقی طور پر تمام مسلمان چاہے وہ کسی برادری، رنگ اور نسل کے لوگ ہوں آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ اس لیے اسلامی اور شرعی طور پر اشراف اجلاف یا ارذال کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔ اسلام میں ایسا کوئی طبقہ نہیں ہے۔ اگر مسلمان سماج میں ایسی طبقاتی تفریق پائی جاتی ہے تو اس کو ختم ہونا چاہیے کم از کم اس بنیاد پر کسی کو چھوٹا یا بڑا نہیں سمجھنا چاہیے۔

دراصل اس وقت ہندوستان کی پوری مسلم سوسائٹی ایک عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ ملت آزادی کے بعد جس عدم استحکام سے دوچار ہے، اس نے سماجی اور نفسیاتی طور پر اس کے اندر تضاد و تصادم کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ جس کو Settle ہونے میں وقت لگے

گا۔ آزادی سے قبل ہماری جو سوچ تھی اور ہم جس طرزِ عمل کے عادی تھی وہ اب ہمارے لیے صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا ہم کو اپنے فکر و عمل میں بنیادی تبدیلی لانی ہوگی۔ آزادی سے قبل مسلمانوں کا ایک طبقہ پسماندہ تھا آزادی کے بعد پوری قوم پسماندگی اور بے چارگی کی شکار ہے۔ سچ پوچھیں تو اشراف اب صرف قبرستان اور لغت میں ہی ہیں پوری قوم اجلاف و ارذال کی صف میں کھڑی ہے۔ اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کی غربت اور جہالت ہے جس کی وجہ سے وہ سیاسی اور معاشی طور پر حد درجہ Marginalised ہو گئے ہیں۔ اس صورت میں اپنے ملی حقوق کی بازیابی ہم پارٹیوں اور گروہوں میں بٹ کر نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ہمیں مشترکہ جدوجہد کرنی ہوگی۔ مگر بدقسمتی سے مسلمانوں میں ابھی بھی کچھ لوگ ہیں جو پدرم سلطان بود کے جھوٹے زعم میں مبتلا ہیں اور اپنے سامنے کسی کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ دوسری طرف بہت سے ایسے لوگ ہیں جو تاریخ کے گڑے مردے اکھاڑ کر نئی نسل سے بدلہ لینے پر آمادہ ہیں۔ یہ جاہلی عصبیت ہے۔ ملت اس سے جتنی جلدی باہر آئے اس کے لیے اتنا ہی بہتر ہے۔ اس معاملے میں ملت کے سبھی طبقوں کے دانشوروں، علماء، دینی، ملی، اصلاحی، سماجی اور ثقافتی تنظیموں کو اپنی اپنی سطح پر اور مشترکہ طور پر منصوبہ بند جدوجہد کرنی ہوگی تاکہ برسوں کی عصبیت کم ہو اور ہم ایک دوسرے کو عزت کے ساتھ اپنے درمیان Accomadate کرنے کو تیار ہوں اور اپنے حصہ کی روٹی ایمانداری اور دیانت سے بانٹ کر کھانے کی عادت ڈالیں۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل چند عملی اقدام ضروری ہوں گے تاکہ ہم تاریخ کی غلطیوں کو سدھار کر ایک نیا سماج بنانے میں کامیاب ہوں:

(1) اس سلسلے میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ملت میں موجود جہالت کے خلاف بھرپور جدوجہد شروع کی جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ملت کا کوئی طبقہ، گروہ، برادری اور حصہ جاہل نہ رہے۔ سرکاری کوششوں کے ساتھ ساتھ ملی کوششوں کے ذریعہ اس مسئلہ پر ایک متعین وقت میں قابو پانے کی مہم چلائی جانی

چاہیے۔ مسلمانوں میں اس وقت جو بھی دینی، ملی اور سماجی تنظیمیں ہیں چاہے وہ مقامی سطح پر کام کررہی ہوں یا ملکی سطح پر ان کو اپنے پروگرام اور منصوبوں میں خاص طور پر پسماندہ برادریوں میں تعلیم کے فروغ کو اولیت دیتے ہوئے اپنے بجٹ کا ایک حصہ مختص کرنا چاہیے اور اس ٹارگیٹ کے حصول میں پوری سرگرمی اور دلچسپی سے حصہ لینا چاہیے۔

(2) جہالت کے بعد ملت کا دوسرا مسئلہ غربت ہے۔ ان دونوں مسئلوں نے مل کر ملت کا اعتبار اور اس کا وزن ختم کردیا ہے۔ جہالت کی وجہ سے غربت ہے اور غربت کی وجہ سے جہالت ہے۔ لہٰذا غربت و جہالت دونوں ایک دوسرے کی وجہ بھی ہیں اور اثر بھی۔ جہالت اور غربت کی وجہ سے قوم کی قوتِ کار اور اس کی پیداواری صلاحیت کم ہوتی ہے، آمدنی اور روزگار کے مواقع کم ہوتے ہیں، ان کا استحصال ہوتا ہے اور ان کی حق ماری کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے دستوری ڈھانچے میں تمام تر دستوری اور قانونی ضمانتوں کے باوجود ان کا واجبی حق اور حصہ نہیں مل پاتا ہے۔ اس کے لیے جہاں ایک طرف چیزوں سے باخبر ہونا ہوگا وہیں دوسری طرف اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے منظّم جدوجہد کرنی ہوگی۔ ملت کو پورے شعور کے ساتھ اپنی نئی نسل کو تعلیم یافتہ، ہنرمند، باصلاحیت اور مسابقتی اہلیت کی حامل افرادی قوت میں تبدیل کرکے ان کو منظّم جدوجہد کے لیے تیار کرنا چاہیے اور جہاں کہیں ان کی حق ماری ہوتی ہے، اس کے خلاف متحدہ مشترکہ آواز اٹھانی چاہیے۔ اگر ہم ملت کے سبھی طبقات بالخصوص پسماندہ طبقات کو اوپر اٹھانے اور ان کی تعلیمی اور معاشی بہتری کے عمل میں ساتھ لے کر چلنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو پوری ملت کی سطح اونچی ہوگی اور پوری ملت پسماندگی اور بے وقعتی کے قعر مذلت سے باہر آپائے گی۔ اس معاملے میں مخلصانہ اور

ایماندارانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہوگی۔

(3) سماجی اور تہذیبی پسماندگی سے ملت کو باہر نکالنے کی مہم شروع کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ پسماندگی، ذلت و ذلالت یہ سب غربت و جہالت کی وجہ سے ہے۔ ایک قوم یا گروہ جب ایک طویل عرصے تک جہالت و غربت سے دوچار ہوتی ہے تو اس کے اندر سے دھیرے دھیرے شعور و سلیقہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے رویہ اور طرزِ معاشرت میں گنوارپن، کھردراپن پیدا ہوجاتا ہے۔ سلیقہ، صفائی، اخلاق، کردار اور معاملات سب پر اس کا منفی اثر پڑتا ہے پھر یہی چیز اس گروہ یا برادری کی پہچان بن جاتی ہے۔ یہ صورتحال ان سے دور بھاگنے، ان کا مذاق اڑانے ، ان کو حقیر سمجھنے یا ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کے نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ صورتحال ان سے قریب ہونے اور ان سے ہمدردی کرنے اور ان کی اصلاح کرنے کی متقاضی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ جن کے یہاں علم و دولت ہے، مگر ان کو اچھی صحبت اور اچھی تہذیب و معاشرت میسر نہیں آئی ہے، ان کے اندر بھونڈا پن، پھوہڑ پن اور کھردرا پن سب دیکھنے کو ملتا ہے۔ تہذیب و معاشرت برسوں کا عمل ہے جس میں سوشل موبلیٹی سے بہت فرق پڑتا ہے۔ اور یہ چیزیں دھیرے دھیرے آتی ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سماج سے قریب ہوا جائے اور ان کے اندر اخلاق و تہذیب پیدا کرنے کے لیے ان کی تربیت کا معقول انتظام کیا جائے۔ آج ہم انگریز قوموں میں جو مجلسی آداب اور تہذیب و شائستگی دیکھتے ہیں یہ ان کے سماجی اور تمدنی مصلحین کی برسوں کی اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہمیں بھی پوری ملت کو ایک اکائی مان کر پوری ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ سماجی آداب سکھانے کے لیے اجتماعی مگر شعوری جدوجہد کرنی چاہیے۔

(4) اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ پسماندہ برادریوں میں نئی نئی قیادتیں ابھر کر آ رہی ہیں اور جگہ جگہ جمعیۃ القریش، جمعیۃ الراعین، جمعیۃ المنصورین، جمعیۃ الانصار اور اس طرح کی کئی اجتماعتیں ابھر کر سامنے آ رہی ہیں۔ ہمیں اس نئی بیداری کا استقبال کرنا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی ان کے اندر بہت سی بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں ان کا لب و لہجہ تلخ ہے، وہ مسائل کی جڑ میں جانے کے بجائے اوپری اور ظاہری علامتوں میں الجھے ہوئے ہیں ان کے ذہن میں یہ بات ہے کہ ہندوستان کے اجتماعی ڈھانچے میں یہاں کے سماجی، سیاسی اور معاشی نظام میں مسلمانوں کا حصہ بہت محدود ہے۔ وہ اس حصہ کو بڑھانے کے بجائے جو حصہ موجود ہے اس میں ہی اپنا بڑا حصہ چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ اس نظام کے چودھریوں سے الجھنے کے بجائے اپنے ہی لوگوں سے چھینا جھپٹی کر کے اپنا حصہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس مسئلہ کا یہ حل ہرگز نہیں ہے کہ ہم ان کے خلاف جتھے بندی شروع کر دیں اور دوسروں کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ ہمارے اندر انتشار اور افتراق پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور اس طرح ہمیں ہمارے حق سے محروم رکھنے میں کامیاب ہو جائیں۔ ہمیں ایسے تمام لوگوں کو چھوڑنا ہوگا اور ان کو اپنی صف میں کھڑا کر کے ان کو یہ اعتماد دلانا ہوگا کہ حقوق کی جنگ میں ہم بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ اس طرح ان قیادتوں کے ساتھ کھڑے ہونے اور ان کے جائز مطالبات کو حاصل کرنے میں ان کی مدد کرنے کے لیے ملت کے تمام طبقات اور اداروں کو آگے آنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ملت میں جو بھی ادارے، تنظیمیں اور جماعتیں ہیں ان کو وسعت دے کر ان طبقات کو بھی نمائندگی دینی چاہیے تاکہ ہمارے اداروں اور تنظیموں میں ملت کے تمام طبقات، گروہوں اور دھڑوں کی نمائندگی ہو اور اس میں زیادہ سے زیادہ

جمہوری عمل کو فروغ ملے تاکہ ہر کسی کو محسوس ہو کہ یہ ہماری تنظیم ہے اور اس کے اچھے برے میں ہم بھی شریک ہیں۔ یہ وقت کی ایسی ضرورت ہے جس پر ملی اداروں کو بغیر وقت گنوائے مثبت اقدام کرنا چاہیے۔

(5) ہندوستانی سماج اور سیاست کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہاں ظلم و ناانصافی عام ہے۔ جو جتنا طاقت ور ہے وہ دوسروں کا حق اتنا ہی زیادہ مارکھاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تمام تر دستوری ضمانتوں، جمہوری اور قانونی ضابطوں اور عدالتوں کی آزادی اور خودمختاری کے باوجود کمزور طبقات کو ان کا واجبی حق نہیں ملتا اور اگر کچھ ملتا بھی ہے تو اس میں ڈنڈی ماری عام ہے۔ اس ظلم و تعدی کی سب سے زیادہ شکار مسلمان ملت ہے۔ اس وقت تمام تر سرکاری اور غیر سرکاری رپورٹوں سے ثابت ہے کہ مسلمان ہندوستان کی تمام قوموں میں تمام معاملات و اشارات کی بنیاد پر ملک کی سب سے پسماندہ ترین قوم ہیں اور ان کے ساتھ ہر جگہ اور ہر سطح پر ناانصافی ہورہی ہے۔ ان کو ان کا واجبی حق دلانے کے لیے سب لوگ جہاں یکساں مواقع کی وکالت کرتے ہیں وہیں مثبت عمل کی بات بھی کرتے ہیں۔ مثبت عمل کا مطلب ہندوستان میں رزرویشن ہے۔ مگر مسلمانوں کو رزرویشن سے محروم رکھنے کے لیے طرح طرح کی لولی لنگڑی دلیلیں دی جاتی ہیں جبکہ پوری مسلم ملت کو پسماندہ قرار دے کر ان کو دس فیصد رزرویشن دینا عین تقاضۂ انصاف ہے۔ اس دس فیصد رزرویشن میں سے 6% مسلم پسماندہ ذاتوں کو اور 4% مسلمانوں میں کریمی لیئر کے لوگوں کو الگ کرکے باقی غریب آبادی کو دینا چاہیے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کی پسماندگی کی بنیاد پر رزرویشن کے مطالبہ کی مخالفت خود مسلمان پسماندہ برادریوں کا ایک گروہ کرتا ہے۔ ان کو اندیشہ ہے کہ اس سے ان کی حق ماری ہوگی۔ جبکہ دیگر پسماندہ برادریوں کو جو

رزرویشن دیا گیا ہے اس میں بعض مسلمان برادریوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ مگر ہندو پسماندہ برادریوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے اور روز اس میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اس لیے اس فہرست میں کچھ برادریوں کو شامل کرنے کے باوجود ان کا اس کا پورا فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے اگر ان کا کوٹہ متعین کردیا جائے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اس طرح ان کو ان کے حصہ کا فائدہ متعین طور پر مل جائے گا۔ لہٰذا اس معاملے میں مسلمانوں کی تمام برادریوں کو ایک ساتھ بیٹھ کر ایک مشترکہ لائحۂ عمل طے کرنا چاہیے تاکہ موجودہ ڈھانچے میں ان کو ان کا متعین حق مل سکے۔

(6) جیسا اوپر کی بحث سے ظاہر ہے کہ اسلام جب ہندوستان میں آیا تو اس نے تمام تر برادریوں کو متاثر کیا اور بہت سی اچھوت برادریاں بھی دائرے اسلام میں آئیں۔ اسلام لانے کے بعد ان کے سلسلے میں نفرت اور حقارت کا رجحان ختم ہوا مگر وہ اپنے سابقہ پیشے سے جڑے رہے۔ بھارت کا جب دستور بنا تو اچھوت برادریوں کو آرٹیکل 341 کے تحت کچھ خصوصی رعایتیں دی گئیں تھیں جن میں تعلیم، روزگار اور اسمبلی، پارلیمنٹ اورلوکل سیلف گورنمنٹ میں مخصوص جگہیں وغیرہ خاص تھیں۔ دستور میں یہ رعایت تمام پسماندہ برادریوں کو دی گئی مگر ایک صدارتی حکم کے ذریعہ اس رعایت سے ان مسلمان برادریوں کو الگ رکھا گیا جو دلت برادریوں سے آئی تھیں، یہ صریح ناانصافی ہے۔ اور دستور کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کی متعدد تنظیمیں اس ناانصافی کے خلاف آواز اٹھارہی ہیں، خاص بات یہ ہے کہ دلت برادریوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ وہ اس میں وسعت کرنے کی حمایتی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تمام دینی ملی تنظیموں کو اس کو اپنا مشترک ایجنڈا بنانا چاہیے اور مسلم دلت برادریوں کو ان کا جائز حق دلانے کے لیے اپنا پورا اجتماعی وزن ڈالنا چاہیے۔

میں نے بہت تفصیل سے مسلمانوں میں پسماندہ برادریوں کے وجود اور مسائل پر خالص انسانی حقوق کے نقطہ نظر سے ایک تفصیلی نظریاتی، تاریخی، سیاسی، ثقافتی جائزہ لیا ہے اور خود مسلمانوں نے اس معاملے میں جو کوتاہی برتی ہے اس کا ذکر کیا ہے۔ اکیسویں صدی کا ہندوستان ہم سے ایک نئی سوشل انجینئرنگ کا مطالبہ کر رہا ہے۔ جب خدا اور اس کے رسول نے ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان کے درمیان فرق نہیں کیا ہے اور کسی کو عزت دار اور کسی کو ذلیل نہیں مانا ہے تو ہم اگر ایسا کرتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ یہ ظلم و گناہ ہے بلکہ موجودہ حالات میں بڑی ناعاقبت اندیشی اور بے وقوفی ہے۔ ایسی کوئی سوچ اور ایسی کوئی تفریق ہمارے سماج کی اجتماعی قوت کو کمزور کرنے والی ہے جس کا نقصان نام نہاد اشراف اور اجلاف اور ارذال سب کو ہوگا۔ اس لیے مسلمانوں کی تمام برادریوں کے درمیان مساوات اور بھائی چارہ نہ صرف ہماری دینی ذمہ داری ہے بلکہ یہ ہماری ملی پالیسی ہونی چاہیے۔ اسی سے ہندوستان میں مسلم سماج میں نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوسکتا ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ اوپر والے تھوڑا نیچے آئیں اور نیچے والے کو ہاتھ بڑھا کر اوپر لانے کی کوشش کریں۔ اسی طرح نیچے والے اپنی ضد اور جہالت چھوڑیں اور اوپر والے کا ہاتھ تھام لیں اور اس طرح ایک دوسرے کو ایک سطح پر لانے کی کوشش کریں۔ اسی حکمت عملی سے دونوں کے حقوق محفوظ رہیں گے اور دونوں کو شرف وعزت کا مقام حاصل ہوگا۔ پھر ہم ساری دنیا کے سامنے سر اٹھا کر کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں ذات پات کی کوئی تفریق نہیں ہے سارے انسان اور سارے مسلمان برابر ہیں اور یکساں عزت و حقوق کے مستحق ہیں۔ ایسی مثبت پہل سے ہی ملت میں پسماندہ برادریوں کے انسانی حقوق کی حفاظت ممکن ہے۔

■❖■

ہندوستان کے مسلمان معاشرے میں عورتوں کے حقوق

عورت اور مرد انسانی تمدن کی گاڑی کے دو پہیئے ہیں۔کسی سماج کی متوازن ترقی ان دونوں کے مساوی اشتراک و تعاون سے ہی ممکن ہے۔مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عورتوں کے باب میں پورا انسانی معاشرہ بے حد کنفیوز ہے اور ہمیں ہر جگہ افراط وتفریط نظر آتی ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ عورتوں کے بارے میں نقطۂ اعتدال کہیں کھوگیا ہے۔ ہندوستان کا مسلم معاشرہ بھی اس عمومی صورتحال سے الگ نہیں ہے، بلکہ بعض معاملات میں وہ اس وقت جدید تہذیب کے حاملین اور اسلام سے عناد رکھنے والے طبقوں کے نشانے پر ہیں۔ دراصل وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔ایک مسلمان عورتوں کو اسلام کے دائرے سے باہر لانا چاہتے ہیں اور دوسرے اسلام کو منفعل اور معطل کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ پر بہت محتاط اور پھونک پھونک کر آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

اللہ نے عورت اور مرد دونوں کو شرف خلافت سے نوازا ہے اور دونوں کو یکساں عزت وتکریم بخشی ہے۔ دونوں خدا کے حضور یکساں ذمہ دار ہیں اور دونوں یکساں جوابدہ ہیں۔قرآن و حدیث کے احکامات چند مستثنیات کو چھوڑ کر دونوں پر یکساں نافذ و عائد

ہوتے ہیں اور دونوں یکساں سزا و جزا کے مستحق ہیں۔ اس لیے انسانی شرف وتکریم میں دونوں کے درمیان کوئی تفریق و امتیاز نہیں ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ دونوں دو جنس ہیں۔ ایک عورت ہے تو دوسرا مرد ہے۔ جنس میں فرق کی وجہ سے دونوں کی جسمانی بناوٹ میں فرق ہے، جس کی وجہ سے دونوں کے کچھ مخصوص دائرۂ کار اور ذمہ داریاں ہیں۔ اگر اسلام کی بات کریں تو اسلام نے گھر کی ذمہ داری عورت پر ڈالی ہے اور گھر سے باہر کی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے۔ عورت پر عمومی طور پر کوئی معاشی بوجھ نہیں ڈالا ہے۔ لیکن اسے معاشی حقوق دیے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت باہر کا کام نہیں کرسکتی ہے یا باہر کا کام کرنے کی اہل نہیں ہے۔ انسان ہونے کے ناطے اس میں وہ تمام صلاحیتیں (Potential) موجود ہیں جو مرد کے اندر ہیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ وہ کیا کرسکتی ہے اور کیا نہیں کرسکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے لیے کیا پسندیدہ ہے اور کیا پسندیدہ نہیں ہے۔ جو لوگ عورت کی صلاحیت (Potential) پر سوال اٹھاتے ہیں وہ جہالت کے شکار ہیں۔ کیا ہوم منسٹری فورن منسٹری کا کام کرسکتی ہے یا فورن منسٹری ہوم منسٹری کا کام کرسکتی ہے۔ یقیناً کرسکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہیے؟ بعض مخصوص اور ہنگامی حالات میں سب ممکن ہے مگر معمول سے ہٹ کر ایسا کرنا دونوں کے رول کو گڈ مڈ کرنا ہوگا جس سے شاید دونوں میں سے کوئی ذمہ داری ٹھیک ڈھنگ سے پوری نہ ہو۔ جدید معیشت میں ہم لوگ تقسیم کار کے اصول کے پابند ہیں اور اس بات کو مانتے ہیں کہ جس کے اندر جو صلاحیت ہے، جس کی جس کام کے لیے تربیت ہوئی ہے جو جس کام کے لیے فٹ ہے اس سے وہی کام لیا جائے تو کارکردگی بہتر ہوگی اور وہ اپنی پوری صلاحیت اور لیاقت (Full Potential) کا استعمال کرکے پیداواری عمل کو تیز کرے گا ورنہ اس کے برعکس نتیجہ پیدا ہوگا۔

پہلے چونکہ عورتوں کو تعلیم کے مواقع میسر نہیں تھے، ان کے نقل وحمل پر پابندی تھی اور ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کے اظہار کے راستے مسدود تھے تو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ عورتیں

مجہول اور ناقص العقل ہیں اور ان کے اندر Potential کی کمی ہے۔ اب جبکہ ان کو تعلیم کے مواقع میسر آئے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا ہے تو انھوں نے ثابت کردیا ہے کہ وہ انسان ہونے کے ناطے ان تمام خصوصیات سے متصف ہیں جو مردوں کے پاس ہے اور انھوں نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ پرانی تھیوری اور تھیس اور طرزِ عمل یا تو غلط ثابت ہوئی ہیں یا ان پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے نتیجہ میں جونئی بیداری آئی، پھر صنعتی انقلاب اور پچھلی صدی میں دو عظیم جنگوں نے نہ صرف دنیا کی جغرافیائی ہیئت تبدیل کردی بلکہ سماجی اور تمدنی ضابطوں کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ ویمن لب یعنی عورتوں کی آزادی اور جنسی مساوات کا نعرہ زوروں سے بلند ہونے لگا۔ پوری دنیا نے اپنی تمام مذہبی تعلیمات اور ضابطوں کو طاق پر رکھ دیا اور اس نئے طرزِ فکر اور طرزِ تمدن کو اختیار کرلیا۔ اب عورتیں شرم و حیا کو تج کر بے حجاب گھروں سے باہر نکلنے لگیں اور زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کے شانہ بشانہ ہر طرح کا کام کرنے لگیں۔ یورپ کی یہ نئی تہذیب سامراجی اور نوآبادیاتی نظام کے کندھے پر سوار ہوکر جدید ٹکنالوجی سے لیس تمام تر مادی وسائل سے بھرپور دنیا کے مختلف ملکوں میں پہنچی۔ دنیا کی کم و بیش سبھی تہذیبوں نے ابتداً معمولی مزاحمت کے بعد خود کو اس سیلاب کے حوالے کردیا اور آج یہی وہ جدید تہذیب ہے جو ساری دنیا میں رائج و غالب ہے۔ انھوں نے یورپ کو اپنے لیے معیار بنالیا ہے اور جو چیز وہاں سے آتی ہے یا تو من و عن یا پھر کچھ کوسمیٹک تبدیلی کرکے وہ اس کو قبول کرلیتی ہیں۔ چونکہ یورپ کی اس تہذیب میں اخلاق باختگی، ننگاپن، اباحیت اور کئی دیگر بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں نیز اس نے پورے خاندانی نظام کو تہ و بالا کردیا ہے جس سے انسان نما تعلیم یافتہ جانوروں کی ایک فوج تمام مسلمہ اور متفقہ اقدار کو ختم کرکے ایک جنگلی تمدن مہذب معاشرے پر نافذ کرنا چاہتی ہے، اس لیے اسلام کے ماننے والے پیٹھ لگا کر اس سیلاب بلا کے دروازے پر کھڑے ہوگئے ہیں اور اس کو اپنی بساط بھر روکنے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہ وہ صورتحال

ہے جو بطورِ چیلنج ہمارے سامنے موجود ہے۔

اس وقت مسلمان معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ ایک طرف غربت، جہالت اور تہذیبی پسماندگی نے قوم کا سارا حسن، سارا وقار چھین لیا ہے، دوسری طرف ہمارے روایتی علماء ہیں جو جدید تقاضوں سے بے خبر آنکھیں موندے کچھ سوچنے سمجھنے کو تیار نہیں ہیں اور تیسری طرف جدید طبقہ ہے جس کو اسلام کے نام سے چڑھ ہے لہٰذا وہ جلد سے جلد اس حصار کو توڑ کر باہر آنا چاہتا ہے۔ جدید طبقہ کی پشت پر پورا میڈیا ہے نام نہاد سیکولر عناصر اور فرقہ پرست طبقہ ہے۔ مسلم سماج میں رائج بعض خرابیوں کو بہانہ بنا کر نہ صرف پورے اسلامی تعلیمات پر سوالیہ نشان کھڑا کررہے ہیں بلکہ اس کو پوری طرح بدل کر یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی مدعی ہیں۔ کیا یکساں سول کوڈ نافذ ہونے سے عورتوں کا مسئلہ حل ہوجائے گا؟ جن سماجوں اور ملکوں میں یکساں سول کوڈ نافذ ہے وہاں عورتیں ظلم واستحصال کی شکار نہیں ہیں۔ یہ سوالات کوئی پوچھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ظلم واستحصال چاہے جس سماج میں ہے اور جس کے ذریعہ ہے اس کو روکا جانا چاہیے۔

مسلمان سماج کا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان سماج اس وقت اندرونی اور باہری دونوں خرابیوں سے دوچار ہے، کوئی ضابطہ چاہے کتنا اچھا ہو اگر اس کو اس سسٹم کے فریم ورک سے ہٹا کر دیکھیں تو بالکل بے تکا اور بے جوڑ لگے گا، ٹھیک یہی حال اسلام اور اسلامی ضابطوں کا ہے۔ اسلام کا ایک نظام معاشرہ ہے، اس کا ایک نظام اخلاق ہے اس کا ایک نظام عقیدہ ہے۔ کوئی چیز اگر ان سے باہر اور الگ کرکے نافذ کی جائے گی تو اس میں ہم آہنگی کا فقدان ہوگا اور بہت ممکن ہے اس کا الٹا نتیجہ نکلے۔ قرآن نے سزا کا سخت ضابطہ بنایا ہے تاکہ جرائم کی روک تھام ہو۔ مگر اس کے اخلاقی تمدن اور قانونی نظام سے الگ کرکے اگر ان سزاؤں کا نفاذ ہوگا تو اس کو ظلم وبربریت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے اس لیے جب آپ کسی چیز پر غور کریں تو اس کے Prespective پر غور کرنا ضروری ہوگا

کہ یہ کس ماحول اور معاشرے میں کن شرطوں اور ضابطوں کے تحت نافذ العمل ہوگا۔ یہ صرف اسلام کی بات نہیں ہے۔ آپ کسی بھی اصول و قانون کو لے لیں۔ اس کے نفاذ کی جملہ شرطوں کو نظر انداز کر کے اگر آپ اس کو نافذ کریں گے تو لازمی طور پر اس سے غلط نتیجہ برآمد ہوگا۔ آپ ریل گاڑی کسی سڑک پر اور موٹر گاڑی کو ریل کی پٹری پر نہیں دوڑا سکتے ہیں۔ ریل گاڑی ریل کی پٹری پر ہی اپنے ضابطے کے تحت چلے گی اور موٹر گاڑی سڑک پر اپنے ضابطے کے تحت چلے گی۔ ٹھیک یہی بات کسی اصول اور قانون پر بھی نافذ ہوتا ہے ورنہ اس کی معقولیت پر ہمیشہ سوال اٹھتا رہے گا اور کسی کے پاس اس کا کافی و شافی جواب نہیں ہوگا۔

اب میں ان مسائل کی طرف آتا ہوں جو اس وقت مسلمان سماج میں ما بہ النزاع اور ڈبیٹ کا ایشو بنے ہوئے ہیں:

(1) ان میں ایک مسئلہ عورت کی گواہی کا ہے، جہاں ایک مرد اور دو عورت کی گواہی کی بات کہی گئی ہے۔

(2) دوسرا مسئلہ باپ کی جائداد میں بیٹے کے مقابلے بیٹی کے آدھے حصے کا ہے۔

(3) تیسرا مسئلہ عورت کی قیادت و امامت کا ہے۔

(4) چوتھا مسئلہ تین طلاق، کفالت اور حلالہ کا ہے۔

(5) پانچواں مسئلہ تعدد ازدواج کا ہے۔

(6) چھٹا مسئلہ مسجد اور مزار میں داخلے کا ہے۔

(7) ساتواں مسئلہ پردہ اور حجاب کا ہے۔

(8) آٹھواں مسئلہ گھریلو تشدد کا ہے۔

(9) نواں مسئلہ عورتوں کی تعلیم اور نوکری کا ہے۔

(10) دسواں مسئلہ عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط کا ہے۔

(11) گیارہواں مسئلہ بغیر محرم کے تنہا سفر کرنے کا ہے۔

ان سارے امور میں عام طور پر لوگوں کا خیال ہے اسلام نے عورت کی حیثیت کو کم کر کے رکھا ہے، اس طرح ان کو مردوں کی طرح برابر کا درجہ نہیں دیا گیا ہے۔ ہم پہلے ان تمام امور کا محاکمہ کریں گے پھر اس کے بعد یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ صحیح اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے اور موجودہ مسلمان سوسائٹی میں اس کو کس طرح برتا جا رہا ہے۔ کہاں اصلاح کی ضرورت ہے اور کہاں ہمیں قرآن و سنت کے احکام پر سختی سے کاربند ہونے کی ضرورت ہے۔

■❖■

(1) پہلا مسئلہ

ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کا ہے

قرآن آپسی لین دین اور دیگر معاملات میں انصاف و دیانت کے ساتھ معاملات کی صفائی کا قائل ہے۔ اس لیے اس کا حکم ہے کہ جب تمہارے درمیان لین دین یا کوئی معاملہ ہو تو اس کو انصاف کے ساتھ ضبط تحریر میں لا دیا جائے اور جو دستاویز، معاہدہ یا اقرار نامہ تیار ہو اس پر دو مرد گواہ بنالیے جائیں۔ اگر دو مرد اس وقت موجود نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالیا جائے۔ قرآن نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ قرآن کی سورہ البقرۃ آیت 282 میں اس بات کا ذکر کیا گیا۔ آگے بتایا گیا کہ ہر کوئی گواہی کے قابل نہیں ہوتا ہے۔ گواہ وہ ہو جو تمہارے درمیان مقبول یا قابلِ اعتبار ہو۔ اگر مرد قابل اعتبار نہیں ہے تو اس کی گواہی قبول نہیں ہوگی اور اگر عورت قابلِ اعتبار نہیں ہے تو، اس کی بھی گواہی قبول نہیں ہوگی۔ گواہی لیتے وقت عدالت اس بات کو یقینی کرے گی کہ جو مرد یا عورت گواہی دینے آیا ہے وہ معاشرے میں مقبول اور قابلِ اعتبار ہے یا نہیں۔ قرآن جس معاشرے کا تصور رکھتا ہے اس میں گھر سے باہر عورت کی ذمہ داریاں کم ہیں۔ لہٰذا وہ بلا وجہ ان کو ہر معاملہ میں گھسیٹنا نہیں چاہتا۔ اس لیے اس کا مزاج یہ ہے کہ تجارتی اور معاملات میں مرد ہی گواہ ہوں۔ ایک آدمی کی گواہی کافی نہیں مانتا۔ اس لیے کم سے کم دو آدمی کی گواہی چاہتا ہے۔ اگر ایسی صورت پیدا ہوجائے کہ جہاں ایک مرد کے علاوہ کوئی دوسرا مرد نہیں ہو اور صرف عورتیں ہوں تو اس

صورت میں دوعورتوں کو یہ ذمہ داری دیتا ہے کہ وہ مشترکہ طور پر گواہ بنیں تاکہ وہ نفس معاملہ کوصحیح صحیح بیان کرسکیں۔ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلادے۔

ایک بات ہمیں اچھی طرح یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن جس ماحول اور معاشرہ میں نازل ہوا اس نے اپنے احکامات کو قابلِ عمل بنانے کے لیے اس کوملحوظ رکھا ہے۔ حالانکہ یہ کتاب ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ قرآن کے نزول کے وقت عام طور پر عورتیں پڑھی لکھی نہیں ہوتی تھیں۔ انہیں تجارتی امور اور لین دین کے معاملات سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود ان کومعتبر اور مستند مانا گیا اور ان کی گواہی تسلیم کی گئی۔ مگر چونکہ یہ نص قرآن سے ثابت ہے اس لیے ہم اس کو بدل نہیں سکتے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں نکالا جاسکتا کہ قرآن عورت کومردوں کے مقابلے حقیر سمجھتا ہے۔ کم ذمہ داری دینا اور کچھ مخصوص ذمہ داریوں سے مستثنیٰ قرار دینا اس کی کم حیثیت کا نہیں مخصوص حیثیت کی دلیل ہے جو عورتوں کو بہت سے فتنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے دی گئی ہیں۔

فقہا نے اپنے اپنے دور اور حالات کے تحت اس بات کی تشریح کی ہے اور اس کے حدود اور غایت بیان کیے ہیں۔ ہم ان کی بعض باتوں سے اتفاق بھی کرسکتے ہیں اور بعض سے اختلاف بھی کرسکتے ہیں۔ کسی شخص کی رائے خدا اور اس کے رسول کی رائے کے برابر نہیں ہوسکتی۔ جہاں اور جس معاملے میں خدا کا کوئی حکم ہے یا رسول کی صحیح حدیث میں کوئی بات بیان کی گئی اس کو ماننا ایمان کا لازمی تقاضہ ہے۔ رہا فقہا کی آراء تو زمانے اور حالات کے مطابق اس کوضرور دیکھا جائے گا اور جو چیز اسلام کی عمومی تعلیم اسپرٹ اور عصری تقاضوں سے قریب ہوگی اس کو اسی اعتبار سے قبول کیا جائے گا۔ ایک ہے پڑھا لکھا اور صاحب علم و فہم ہونا اور ایک ہے صادق القول اور صاحب کردار ہونا۔ معاملات کی گواہی میں جہاں ایک شخص کے علم وفہم کا اعتبار کیا جائے گا وہیں اس کی اخلاقی حیثیت کی بھی پرکھ ہوگی۔ اگر اس کی اخلاقی حیثیت مجہول ہوگی تو اس کے علم وفہم کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا محض مرد ہونا کسی شخص کو گواہی کا حق دار نہیں بناتا اور عورت ہونا کسی عورت کو گواہی کے نا قابل نہیں بناتی۔

اصل چیز اس کا صادق و عادل ہونا ہے۔علم وفہم کا معاملہ اس کے بعد آتا ہے۔ بہرحال اس بات سے یہ دلیل نہیں دی جاسکتی کہ قرآن نے عورتوں کا مردوں کا نصف یعنی Half Human مانا ہے۔ اس بات کا تعلق محض نفس معاملہ سے ہے۔ اس کا کوئی تعلق عورت کی حیثیت سے نہیں ہے۔ مردوں سے الگ اور آزاد عورتوں کا اپنا مستقل وجود ہے اور اس حیثیت میں وہ یکساں محترم ہیں بلکہ بعض حیثیتوں میں مردوں سے برتر ہیں۔

اسلام میں جو شہادت کا قانون بنایا گیا ہے وہ ہر معاملہ میں یکساں نہیں ہے۔ مثلاً عورتوں کے مخصوص معاملات میں مردوں کی شہادت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اس معاملہ میں صرف عورتوں کی ہی شہادت تسلیم کی جائے گی۔

اسی طرح عام معاملات میں دو آدمی کی شہادت کافی ہے، مگر معاملہ اگر زنا کا ہوتو اس وقت چار مردوں کی شہادت ضروری ہے۔ ایک دو یا تین مردوں کی شہادت سزا کے نفاذ کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نفس مسئلہ کی رعایت کرتے ہوئے قرآن نے شہادت کے الگ الگ ضابطہ بیان کیے ہیں۔ لہٰذا اس کو عورت کی کم تر حیثیت کے لیے دلیل نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ کتب احادیث میں بہت ساری حدیثیں صحابیات سے منقول ہیں جن کو ہر دور کے فقہا اور محدثین نے معتبر مانا ہے اور اس کی بنیاد پر فتوے دیے ہیں اور احکامات صادر کیے ہیں۔ جب حدیث کے بیان میں اور اس کی روایت میں عورتوں کو معتبر مانا گیا ہے تو وہ کون سی چیز ہے جو ان کے اعتبار کو زائل کرسکتی ہے۔ لہٰذا صرف اس بنیاد پر کہ بعض معاملات میں ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنانے کی بات کہی گئی ہے اس سے عورت کی حیثیت عرفی پر کوئی ضرب نہیں پڑتی۔ قرآن کے الفاظ میں اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے محض نفس واقع کو متحقق کرنے کے لیے ہے۔ لیکن جب دینی معاملات میں کوئی فیصلہ ہوگا تو قرآن کے اس اصول کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ اس کا تعلق نفس مسئلہ سے ہے عورت کی حیثیت سے نہیں ہے۔

■❖■

(2) دوسرا مسئلہ: باپ کی جائداد میں بیٹے کے مقابلے بیٹی کے آدھے حصے کا ہے

یہ بھی قرآنی نص سے ثابت ہے۔ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ قرآن نے حقوق کے تعین میں فرائض کو اہمیت دی ہے۔ اور جس کی جتنی زیادہ ذمہ داری ہے اس کا حق اسی تناسب سے زیادہ ہے تاکہ وہ اپنے فرائض اچھی طرح ادا کرسکے۔ ماں باپ کی اخلاقی ذمہ داری تو تمام اولاد پر ہے خواہ بیٹا ہو یا بیٹی۔ مگر ماں باپ کی کفالت اور دیگر معاملات کی قانونی ذمہ داری صرف بیٹے کی ہے۔ بیٹی پر کوئی مالی بوجھ نہیں ڈالا گیا ہے۔ اس کے باوجود قرآن نے باپ کی جائداد میں بیٹی کو محروم نہیں کیا ہے بلکہ بیٹے کے نصف کا حق دیا ہے۔ مسئلہ اس لیے پیدا ہوگیا ہے جدید قوانین میں بیٹے اور بیٹی کی برابر کا حق دیا گیا ہے۔ اس لیے لوگ قرآنی تقسیم وراثت پر سوال اٹھاتے ہیں۔ مگر قرآن نے جس فریم ورک میں یہ اصول وضع کیا ہے اس کو دھیان میں رکھا جائے تو وہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس مسئلے کا تعلق بھی عورت کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری سے ہے۔ اس لیے اس بات کو سماج میں عورت کی کم تر حیثیت کی دلیل کے طور پر نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ عورت کا آدھا حصہ ہے بلکہ موجودہ مسلم سماج کا مسئلہ یہ ہے کہ شریعت نے بیٹی کو جو حق

دیا ہے وہ اس کو نہیں ملتا ہے اور بسا اوقات معاملہ مار پیٹ اور کیس مقدمہ تک پہنچتا ہے۔ جس میں دونوں طرف سے زیادتیاں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے معاشرے میں عورت کی قانونی اور اخلاقی حیثیت مجروح ہوتی ہے اور جو لوگ اس دین کے معاند ہیں ان کو ہنسنے اور مذاق اڑانے کا موقع مل جاتا ہے۔ مسلمان معاشرے کو چاہیے کہ قرآنی احکامات پر ایماندارانہ عمل کر کے اپنی شبیہ سدھارے اور دوسرے معاشرے کے لیے نمونہ بنے، جس معاشرے میں بیٹا بیٹی دونوں کو برابر کا حق دیا گیا، اس کا سچ یہ ہے کہ یہ چیز صرف قانون کی کتابوں میں ہے عملاً لڑکی کو کچھ نہیں ملتا کم از کم ہندوستان کے ہندو سماج میں جہاں ہندو کو ڈبل نافذ ہے، یہی صورتحال ہے۔

اس لیے قانون کی کتاب میں محض کسی کا حق اندراج کر دینے سے حق حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کو نافذ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے علم میں ایسی سینکڑوں مثالیں ہیں جبکہ بیٹی کو حق سے محروم کر دینے کے لیے باپ نے اپنی زندگی میں ہی ساری جائداد بیٹے کے نام کر دی ہے تاکہ بعد میں بیٹی ایسا کوئی مطالبہ نہ کر سکے۔ اس معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ جو لوگ وارث ہیں یعنی جن کا حق مرنے کے بعد باپ یا ماں کی جائداد میں ہوگا اولاً ان کے حق میں وصیت نہیں کی جاسکتی ہے۔ ایسا اگر کوئی کرے گا تو وہ قانوناً اور اخلاقاً غلط ہوگا اور اس کو عدالت میں چیلنج کیا جاسکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صاحب مال اپنی جائداد کا ایک تہائی حصہ سے زیادہ کسی کے حق میں وصیت نہیں کرسکتا ہے۔ یہ اصول اس لیے بیان کیا گیا ہے تاکہ کسی حال میں وارث کا حق نہ مارا جائے۔ لہٰذا اسلام نے چاروں طرف سے ایسا انتظام کیا ہے جس سے وارث چاہے بیٹا ہو یا بیٹی اس کا حق تلف نہ ہو۔ اگر آپ اسلام کے قانون وراثت کو غور سے پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس کا نزول حق تلفیوں کو روکنے، کمزوروں کو ان کا حق دلانے اور ناداروں کی مدد کرنے کی غرض سے ہوا ہے۔ صرف قدیم معاشرے میں ہی نہیں جہاں عورت کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا تھا اور اسے ہر طرح کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے آج کے جدید معاشرے میں بھی اس کو پورا

حق نہیں دیا جاتا ہے اور تمام تر ذمہ داریاں عائد کرنے کے باوجود اس کو اس کی محنت کی پوری اجرت نہیں دی جاتی ہے۔ نام نہاد مہذب متمدن اور ترقی یافتہ دنیا میں جہاں عورت اور مرد کے مساوات کا نعرہ بہت زوروں سے بلند کیا جاتا ہے وہاں عورتوں کو مردوں کے مقابلے کم اجرت دی جاتی ہے بلکہ ان سے مردوں کے مساوی بلکہ بسا اوقات ان سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس وقت عورتوں کی بہت ساری تنظیمیں دنیا بھر میں اس کے خلاف قانونی جنگ لڑ رہی ہیں۔ یہاں تک کہ فلم انڈسٹری جہاں عورتوں کو صرف لباس اتارنے کی پوری آزادی ہے ان کا ہر سطح پر اور ہر طرح سے استحصال کیا جاتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ جدید تہذیب کے حاملین عورتوں کی عصمت و آزادی پر جس طرح شب خون مار رہے ہیں ان کو بے نقاب کیا جائے اور جہاں عورتیں بغیر ذمہ داری کے پورے اختیار کے ساتھ محفوظ ہیں ان کو سامنے رکھ کر تہذیب جدید کی تشکیل جدید کے لیے اقدام کیا جائے۔

■❖■

(3) تیسرا مسئلہ

عورت کی قیادت و امامت کا ہے

اس سلسلے میں اسلام کا موقف یہ ہے کہ یہ ناپسندیدہ ہے حضورؐ کا ارشاد ہے:'' وہ قوم فلاح نہیں پاسکتی جس نے اپنے معاملات کسی عورت کے سپرد کردئے ہوں۔'' (بخاری) اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام نے اسے حرام تو نہیں قرار دیا ہے، مگر اس کو ناپسند کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمومی طور پر علما اور فقہا کا موقف یہ ہے کہ عورت کسی اسلامی ملک کی سربراہ نہیں ہوسکتی ہے یا اس کو سربراہ نہیں بنایا جانا چاہیے۔ دراصل اسلام نے عورتوں کے لیے جو دائرہ کار طے کیا ہے وہ امامت و سربراہی سے میل نہیں کھاتا ہے۔ یہاں پر ایک بات واضح کرنا ضروری ہے، سوال اس کی اہلیت کا نہیں ہے بلکہ اس کی ترجیح کا ہے۔ترجیحی طور پر یہ پسندیدہ نہیں ہے۔

ایک دوسرا مسئلہ نماز میں عورت کی امامت کا ہے۔ یہ معاملہ مسلمان فقہاء کے درمیان ما بہ النزاع ہے۔ ہمارے سامنے قرآن و حدیث میں ایسی کوئی نص نہیں ہے جس میں اس کی نفی کی گئی ہے۔ مگر شروع سے اسلامی معاشرہ میں اس کا چلن نہیں رہا ہے۔ حضورﷺ کے زمانے میں کبھی بھی عورتوں کو نماز کی امامت نہیں دی گئی ہے۔ اس سے یہ

نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ عورت نماز کی امامت نہیں کرسکتی ہے مگر امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ اگر جماعت صرف عورتوں کی ہو تو ان کی امامت وہ کرسکتی ہے۔ ابوثور اور طبری نے عورت کی امامت کو مطلقاً جائز قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مردوں کی بھی امامت کرسکتی ہے۔ لیکن یہ ایک شاذ رائے ہے۔ جس کو اور لوگوں نے تسلیم نہیں کیا ہے۔

میرے ناقص خیال میں بعض استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر خالص اسلامی سوسائٹی میں خلافت و امامت مردوں کی ذمہ داری ہے جو اسلام کے اس اصول کے مطابق ہے کہ مرد عورت پر قوام ہے۔ لیکن آج کے جدید معاشرے میں غیر مسلم دنیا میں عورتوں کو مردوں کے مساوی درجہ دیا گیا ہے۔ اگرچہ دنیا میں ان کی تعداد بہت کم ہے تاہم مشرق و مغرب کی ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دونوں ممالک میں عورتیں عالمی اداروں اور ملکوں میں سربراہی کے منصب پر فائز ہیں اور جہاں انھوں نے اپنی اہلیت اور صلاحیت ثابت کی ہے۔ اس لیے خالص اسلامی ریاست میں نہیں جہاں اسلام دستوری اور عملی طور پر نافذ ہے ایسے ملکوں اور ریاستوں میں جہاں اسلام ریاستی اور دستوری طور پر نافذ نہیں ہے اگر کوئی عورت اپنی اہلیت کے بل پر سربراہی کے منصب پر فائز ہوتی ہے تو اسے بصورتِ دیگر گوارہ کیا جائے گا۔

آج ہم خود کو اس اعتبار سے ترقی یافتہ مانتے ہیں کہ عورتوں اور مردوں کو زندگی کے ہر میدان میں مساوی درجہ دیتے ہیں۔ مگر ماضی قدیم میں بھی عورتیں سربراہی کے منصب پر فائز رہی ہیں جنھوں نے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا ہے۔ اس وقت اتنا شور وغلغلہ ہونے کے باوجود آج بھی بہت کم عورتیں سربراہی کے منصب پر فائز ہیں اور مغربی اور مشرقی دنیا کے مفکرین و مدبرین عورتوں کی سربراہی کے اصولی طور پر قائل ہونے کے باوجود عملی طور پر اس کے حق میں نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں بہت مشکل سے کسی عورت کا سربراہی کے منصب پر انتخاب ہو پاتا ہے، بلکہ ایک دوسرے زاویہ سے دیکھئے تو جو ممالک غیر ترقی یافتہ یا Conservative کہے جاتے ہیں وہاں زیادہ عورتیں سربراہی کے منصب پر فائز رہی ہیں یا ہیں جیسے بھارت، نیپال، بنگلہ دیش، پاکستان، سری لنکا وغیرہ

میں۔ انگلینڈ،فرانس، جرمنی، اور دنیا کے دوسرے ممالک میں سینکڑوں برس میں اب تک اکا دکا عورتوں کو سربراہی کے منصب پر فائز ہونے کا موقع ملا ہے۔ امریکہ جیسا ترقی یافتہ ملک، اپنی لگ بھگ 270 سال کی تاریخ میں پہلی بار وہاں کی ریپبلیکن پارٹی نے ایک عورت کو اپنا امیدوار بنایا ہے، جس کو وہاں کی وہائٹ سپرمیسی پر یقین رکھنے والی میل سوسائٹی نے جیتنے نہیں دیا۔

لہٰذا نعرے اور دعوے کے باوجود دنیا کا غالب رجحان یہ ہے کہ محض استثنائی صورتوں میں ہی عورتوں کو سربراہی کا منصب دیا جاسکتا ہے۔ اس وقت دنیا کے کم و بیش 200 ممالک میں سے صرف سات یا آٹھ ممالک ہیں جہاں عورت سربراہی کے منصب پر فائز ہے۔ لہٰذا یہ صرف اسلام اور مسلمانوں کا موقف نہیں ہے بلکہ دنیا کا غالب رجحان ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسلام نے اپنی ناپسندیدگی واضح طور پر بیان کردی ہے اور ان کے حدود کا کھلے الفاظ میں ذکر کیا ہے، جبکہ دنیا کہتی کچھ ہے اور کرتی کچھ ہے۔ میں آخیر میں یہ واضح کردوں کہ اسلام نے اہلیت پر سوال نہیں اٹھایا ہے بلکہ عورت کی خصوصی حیثیت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس پر ایسی ذمہ داری ڈالنا پسند نہیں کیا ہے۔ اب کوئی اگر اس جواب اور موقف سے مطمئن نہیں ہے تو یہ اس کا معاملہ ہے۔ اسلام کا موقف اس سلسلے میں واضح ہے جس کی کچھ ٹھوس بنیادیں ہیں جو تحقیق اور گہرے مطالعے کے نتیجے میں واضح طور پر سمجھ میں آئے گی۔ اس پر سطحی طور پر تبصرہ کرنا علم کی نہیں جہالت کی دلیل ہے۔

عہد حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے مسلمان ممالک میں عورتیں اسمبلی اور پارلیامنٹ میں چن کر آرہی ہیں۔ حال کے برسوں میں یہ رجحان بڑھا ہے۔ جیسے جیسے عورتیں تعلیم یافتہ ہورہی ہیں اور ان کی سمجھ اور شعور میں اضافہ ہورہا ہے ان کی ذمہ داریاں اور رول میں وسعت پیدا ہورہی ہے۔ عورتیں نہ صرف عوامی نمائندگی کے منصب پر فائز ہورہی ہیں بلکہ اسلامی تنظیموں کی مجلس شوریٰ کی رکن بھی بن رہی ہیں اور ان کی آراء کو اتنی ہی اہمیت دی جاتی ہے جتنی مردوں کی رائے کو۔ اس کے علاوہ وہ

عورتوں کے ونگ کی سربراہی بھی کرتی ہیں مقامی یونٹ سے لے کر مرکزی سطح تک باقاعدہ ان کی تنظیم ہے اور وہ ہر سطح پر قائدانہ رول ادا کرتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم ملت، اس کی جماعتیں اور ادارے وقت کے رجحان کو محسوس کرتے ہوئے اپنے موقف میں شرعی ضابطوں کا لحاظ کرتے ہوئے لچک پیدا کررہی ہیں۔ اس طرح ہر سطح پر اور ہر جگہ عورتوں کی نمائندگی بڑھ رہی ہے۔

ان نظری اور اصولی باتوں کے علاوہ ہندوستان کے مخصوص تناظر میں اس مسئلہ میں نئی طرح سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ ہندوستان میں نہ تو مسلمانوں کی حکومت ہے، نہ یہ اسلامی ملک ہے اور نہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مسلمان اس ملک میں اقلیت میں ہیں جو غالب اکثریت سے چھ گنا کم تعداد میں ہیں اور بعض تاریخی اور سیاسی وجوہات سے مسلسل مسلمانوں کو پچھڑا رکھنے اور حاشیہ پر رکھنے کی سازش چل رہی ہے جس کی وجہ سے مسلمان اس وقت ایک پسماندہ کمزور اقلیت شمار کیے جاتے ہیں۔

دستوری لحاظ سے ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے جہاں بلا لحاظ مذہب، عقیدہ، نسل اور جنس تمام شہریوں کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔ ہندوستان کی ویمن رائٹس تحریکوں کے دباؤ میں اور عالمی رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے ہندوستان کے منتخب اداروں میں خواتین کی نمائندگی بڑھانے کا پرزور مطالبہ ہورہا ہے۔ اسمبلی اور پارلیامنٹ میں خواتین کی 33% نمائندگی کا بل زیر التوا ہے۔ ملک کی دو بڑی پارٹیاں بغیر کسی رزرویشن کے 33% نمائندگی کے حق میں ہیں تو سماجی انصاف کی حامل پارٹیوں کی رائے اس 33% میں دیگر پسماندہ برادریوں کو ملنے والا حصہ متعین کرنے کا ہے۔ تاکہ کمزور طبقات کی نمائندگی یقینی بنائی جاسکے۔ بات یہیں پر آکر رکی ہے، جس دن پارٹیوں کے درمیان مفاہمت ہوجائے گی یہ بل پاس ہوجائے گا۔ تاہم مختلف ریاستوں میں لوکل سلف گورنمنٹ میں کہیں 33% اور کہیں 50% سیٹ عورتوں کے لیے مختص کردی گئی ہیں۔ یعنی پنچایت اور میونسپل کارپوریشن میں عورتوں کا حصہ متعین کردیا گیا ہے جہاں صرف عورتیں ہی امیدوار ہوسکتی ہیں اور ان کا

ہی انتخاب ہوگا۔ اس حلقے سے کوئی مرد امیدوار خواہ وہ کسی ذات اور فرقہ سے تعلق رکھتا ہے کھڑا نہیں ہوسکتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمان اپنے وجود کی جنگ لڑرہے ہیں۔ ان کے سامنے اپنی ذلت و پسماندگی سے لڑنے کا مسئلہ ہے۔ ان کے سماجی، معاشی، تعلیمی اور سیاسی امپاورمنٹ کا مسئلہ ہے اور فیصلے کے عمل میں مؤثر شرکت اور حصہ داری کا مسئلہ ہے۔ جمہوری عمل میں منتخب نمائندوں کے ذریعے ہی یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اگر مسلمان اسی عمل سے خود کو الگ تھلگ رکھیں گے تو یہ ان کی خودکشی کے مترادف ہوگا۔ بہت سے گاؤں، پنچایت، وارڈ اور میونسپلٹی میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد ہے جہاں سے ان کی جیت یقینی ہے۔ اگر وہ خود اپنا امیدوار کھڑا نہیں کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے، دوسری ذات برادری کو واک اوور مل جائے گا جو کسی طرح صحیح فیصلہ نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس لیے ہندوستان کے مخصوص حالات میں یہاں کے قانون دستور اور ضابطے کا لحاظ کرتے ہوئے ایک عملی رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ملت کو اپنے خواتین کی نمائندگی بڑھانے پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر سی بات ہے اسلام نے جو اصول دیے ہیں وہ غلط نہیں ہیں، مگر جس طرح حالت اضطرار میں بعض ناجائز اور حرام چیزیں جائز ہوجاتی ہیں، بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کے تحت ہمیں شرعی حدود و قیود کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے عورتوں کی نمائندگی کے بارے میں وسعت نظری سے کام لینا ہوگا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے، میں اپنی رائے کا اظہار تو کرسکتا ہوں لیکن اس کو ملت پر تھوپ نہیں سکتا ہوں۔ بہرحال یہ غور طلب مسئلہ ہے جس پر تمام پہلوؤں پر دھیان دیتے ہوئے فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے۔

■❖■

(4) چوتھا مسئلہ

تین طلاق، کفالت اور حلالہ کا ہے

آج کل یہ مسئلہ بہت نزاعی بنا ہوا ہے اور اس کو بنیاد بنا کر لوگ اسلامی شریعت کو کالعدم قرار دے کر یکساں سول کوڈ کی وکالت کرتے ہیں۔ جو لوگ یکساں سول کوڈ کی وکالت کرتے ہیں ان کی نیت صاف نہیں ہے۔ یہ کام وہ مسلمان عورتوں کی ہمدردی میں نہیں کررہے ہیں بلکہ اسلام کی دشمنی میں کرنا چاہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں سیکولر، کمیونل لبرل اور ہندو انتہا پسند گروہ یک زبان ہے۔ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کا رخ بھی اسی طرف ہے چنانچہ آئے دن ایسے فیصلے آتے رہتے ہیں جس سے مسلم پرسنل لا کو بدلنے کی کوشش نظر آتی ہے۔

دوسری طرف ملک کا دستور ہے جس نے اپنے بنیادی حقوق کے باب میں مذہبی اقلیتوں کو اپنے عقیدے، طریقۂ عبادت اور پرسنل لاء کی گارنٹی دی ہے۔ مگر دستور کے رہنما اصول میں یکساں سول کوڈ کی بات بھی کہی گئی ہے، قانونی طور پر بنیادی حقوق اور رہنما اصول میں واضح فرق ہے۔ بنیادی حقوق کے باب میں جو حقوق درج ہیں اس کی خلاف ورزی کی صورت میں عدالت کے ذریعے اس کو نافذ کرایا جائے گا جبکہ رہنما اصول محض

مشاورتی حکم ہے جو عدالت کے ذریعہ نافذ نہیں کرایا جا سکتا۔ مگر خود سپریم کورٹ نے اس اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شاہ بانو معاملے میں ایسا فیصلہ دیا تھا جس کے خلاف مسلمانوں نے پرزور احتجاج کیا جس کے نتیجہ میں حکومت کو پارلیامنٹ میں ایک نیا بل لاکر اس کو کالعدم کرنا پڑا۔

مگر یہ مسئلہ ختم نہیں ہوا ہے۔ مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار اس کو چیلنج کیا جاتا ہے اور عدالتیں مستقل مداخلت کی پالیسی پر قائم ہیں جس کی وجہ سے اس مسئلہ پر مسلمانوں کو واضح موقف اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندو فرقہ پرست عناصر کی دلیل یہ ہے کہ جب ہندو کوڈ بل میں اصلاح ہوسکتی ہے تو مسلمانوں کے پرسنل لاء میں پارلیامنٹ کے ذریعہ تبدیلی کیوں نہیں لائی جا سکتی۔ دوسری طرف جو لبرل اور سیکولر طبقہ ہے وہ اس کو Gender Justice کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور اس کی رائے ہے کہ دستور عورت اور مرد کو مساوی درجہ دیا ہے جبکہ پرسنل لاء میں عورت کی حیثیت غیر مساوی ہے۔ لہٰذا دستوری طور پر اس کو برابر کا درجہ ملنا چاہیے لہٰذا اس میں تبدیلی ضروری ہے۔

حکومت کا اب تک کا موقف یہ ہے کہ یہ مسئلہ بہت حساس ہے اور ایک کمیونٹی کی مذہبی روایات سے تعلق رکھتا ہے جس کو دستوری ضمانت ملی ہوئی ہے۔ اس لیے جب تک کمیونٹی خود آگے بڑھ کر اس کا مطالبہ نہیں کرتی اس کو جاری رکھنا چاہیے، اس بات کو ہندو فرقہ پرست اقلیت کی منہ بھرائی مانتے ہیں اور سیکولر اور لبرل طبقے مسلمانوں کے روایت پرست، رجعت پرست اور کٹر پنتھی طبقے کے سامنے حکومت کا جھکنا تصور کرتے ہیں۔

لہٰذا ہندو فرقہ پرستوں نے بھی اور لبرل اور سیکولر عناصر نے بھی باہمی اختلاف کے باوجود اپنے حلقہ اثر کی خواتین تنظیمیں بنائیں ہیں اور ان کے ذریعے پرسنل لاء میں تبدیلی کا مطالبہ کرواتی ہیں اور اس کی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اتنی زور دار تشریح کرائی جاتی ہے گویا یہ مسلمان معاشرہ کا سب سے بھیانک مسئلہ ہے اور دوسرے اب تو مسلمان

خواتین سڑکوں پر اتر کر پرسنل لاء میں تبدیلی کا مطالبہ کر رہی ہیں تو اب حکومت کو ایسی کیا مجبوری ہے۔ ان کا دباؤ ہے کہ حکومت ووٹ بینک کی پالٹکس چھوڑے اور مسلم پرسنل لاء کو بدل کر یکساں سول کوڈ میں تبدیل کردے اور بلا لحاظ مذہب ملک کے تمام مذہبی گروہوں پر ایک کوڈ نافذ کرے۔ لہٰذا یہ مسئلہ ہمارے لیے بھی قابلِ غور ہوگیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ خود مسلمان چونکہ قرآن کے ذریعہ بنائے گئے طریق طلاق سے ناواقف ہیں یا وہ طریقہ مسلمان سماج میں رائج نہیں ہے اس لیے یہ مسئلہ اتنا بھیانک نظر آتا ہے۔ اگر قرآن نے علیحدگی کے جو طریقے بتائے ہیں اس کا نفاذ ہوتو شاید یہ مسئلہ اتنا سنگین نہیں ہوگا جتنا سنگین بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ اس لیے اس صورت میں سب سے پہلا قدم طلاق کے باب میں اسلامی تعلیم کی تشریح اور تفہیم کا ہے۔ بسا اوقات جہالت اور دانستہ غلط طریقہ طلاق کی وجہ سے یہ مسئلہ اتنا سنگین اور پیچیدہ نظر آتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ طلاق کی ضرورت ہے یا نہیں ہے۔ اس کا سیدھا جواب ہے کہ اس کی ضرورت ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جن قوموں اور مذہبی اکائیوں میں جہاں ان کے مذہبی قانون یا رواج کے تحت طلاق کی اجازت نہیں تھی یعنی مرد یا عورت کوئی بھی جب ایک بار شادی کے رشتہ میں بندھ گیا تو تاعمر وہ اس سے الگ نہیں ہوسکتے ہیں۔ ان تمام سماجوں میں اپنے مذہبی ضابطے میں اصلاح کرتے ہوئے طلاق کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے اور یہ اصول عالمی طور پر تسلیم شدہ ہے۔ سول میریج ایکٹ میں بھی جہاں ایک بالغ مرد وعورت کو اپنی آزادانہ مرضی سے بغیر کسی فرق و امتیاز کے یعنی ذات، مذہب، برادری، ملک، رنگ اور نسل کی پرواہ کیے بغیر شادی کا حق دیا گیا ہے۔ ان کو بھی ایک دوسرے سے علیحدگی کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس طرح چاہے وہ مذہبی گروہ یا سول میریج کا طریقہ طلاق کی ضرورت اور اس کی گنجائش ہر جگہ موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کہیں پر اختیار ڈائرکٹ ہے اور کہیں پر انڈائرکٹ ہے یعنی عدالتوں کے ذریعہ نافذ ہوتا ہے۔ اس لیے طلاق کا حق یونیورسل ہے جو اس قانون کی ضرورت و اہمیت کی نشاندہی کرتا ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ طلاق کا صحیح طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ میں یہاں ان تمام رائج الوقت طریقوں پر بحث نہیں کروگا۔ میں یہاں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ اسلام نے یعنی قرآن نے طلاق کا کیا صحیح طریقہ بتایا ہے جس پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہی مسلمان معاشرہ میں سارا مسئلہ پیدا ہورہا ہے جس کے حل کے طور پر لوگ یکساں سول کوڈ کی وکالت کرتے ہیں۔

قرآن کی رو سے نکاح ایک سنجیدہ معاہدہ ہے جس کو قرآن نے میثاق غلیظ یعنی پختہ عہد سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کوئی وقتی اور جذباتی معاہدہ نہیں ہے بلکہ زندگی بھر ساتھ نبھانے اور ہر طرح کے نرم وگرم حالات میں ایک دوسرے سے جڑے رہنے کا معاہدہ ہے۔ چنانچہ اسلام نکاح وطلاق کے معاملے میں ہلکی سی بھی غیر سنجیدگی اور مذاق کو پسند نہیں کرتا ہے۔ یہ بہت نازک اور حساس رشتہ ہے جس کی ہر وقت خبر گیری کی ضرورت ہے اور اپنی زبان اور طرز عمل پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں عورت اور مرد دونوں کو پوری طرح حساس ہونا چاہیے اور بھول سے بھی اپنی زبان سے ایسی بات یا اپنے طرزِ عمل سے ایسا طریقہ اختیار کرنے سے گریز کرنا چاہیے جس سے دونوں کے درمیان دوری یا الگاؤ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

اس کے باوجود بعض ایسے حالات پیدا ہوسکتے ہیں جس کی وجہ سے دونوں یا دونوں میں سے کسی ایک کو ایک دوسرے سے نباہ کرنا مشکل معلوم ہوتا ہو، اس صورت میں بعض ابتدائی تدابیر کے بعد دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ کوئی مرد یا عورت اگر کسی وجہ سے اس رشتہ کو آگے بڑھانے کے حق میں نہ ہوں تو باوجود اس کے یہ نہایت ناپسندیدہ عمل ہے، لیکن دونوں کو بہت سارے مفاسد سے بچانے کے لیے طلاق کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس طرح طلاق ناپسندیدہ ہونے کے باوجود کوئی گناہ نہیں ہے۔

طلاق کیوں ہوسکتی ہے؟ اس کی بے شمار وجوہات ہوسکتی ہیں جن سب کا احاطہ کرنا

مشکل ہے۔ ایسی کوئی وجہ جس سے شوہر اس رشتہ کو نباہنا نہ چاہے طلاق کی وجہ ہوسکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب شادی پوری زندگی ایک ساتھ رہنے کے عہد نامے کے ساتھ ہوتی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ شوہر یا بیوی ساتھ رہنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ بیوی کی غلطی ہوسکتی ہے یا شوہر کی غلطی ہوسکتی ہے۔

اسلام نے شادی کا جو تصور دیا ہے اس میں میاں بیوی ایک آزاد اکائی ہونے کے باوجود ایک خاندان اور معاشرے کا حصہ ہیں۔ لہٰذا ان کے درمیان کوئی خوشی غم، نزاع ہوتا ہے تو پورے خاندان اور معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ اس میں اپنی ذمہ داری نبھائے اور بات بگڑنے نہ دے۔ اگر ان کی صلح صفائی کے بعد بھی معاملے کی اصلاح نہ ہو تو یہ دیکھے کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو اور دونوں معروف طریقے سے ایک دوسرے سے الگ ہوں۔ کوئی کسی پر جھوٹے اور بے بنیاد الزام نہ لگائے۔ کسی کی ناروا کردار کشی نہ کرے یا پھر کسی کی حق تلفی نہ ہو، جس کا جو حق ہے وہ اس کو پورا پورا ملے۔ کسی پر ظلم نہ ہو، جہاں خاندان اور معاشرہ اس ذمہ داری کو ادا کرنے میں ناکام ہوتا ہے یا اس کا رویہ جانب دارانہ ہوتا ہے وہیں سارے فساد پیدا ہوتے ہیں جس سے اس خاندان اور اس سماج بلکہ اس دین اور عقیدے کی جگ ہنسائی ہوتی ہے جس کے ماننے والے یہ لوگ ہوتے ہیں۔

اسلام میں شادی کا جو تصور ہے اس میں مرد فرسٹ پارٹی ہوتا ہے اور عورت سکنڈ پارٹی ہوتی ہے۔ شادی کے معاملے میں سب سے پہلے عورت کے سامنے پروپوزل رکھا جاتا ہے جب وہ اس کو منظور کرتی ہے تبھی مرد کے سامنے بعض شرائط کے ساتھ یہ پروپوزل رکھا جاتا ہے۔ جب ایک مرد ان شرائط کے ساتھ اس پروپوزل کو قبول کرتا ہے، اسی کو نکاح کہتے ہیں۔ عورت کا ولی یعنی اس کا گارجین چاہے ماں باپ ہوں یا بھائی بہن یا خاندان کے کوئی اور بزرگ قریبی رشتہ دار کسی لڑکے کا انتخاب کرتے ہیں تو لڑکی کی رضا مندی ضروری ہوتی ہے جس میں اس کو بتایا جاتا ہے کہ لڑکا کون ہے اور اس سے کن شرطوں پر نکاح کرنا طے ہوا ہے۔ لڑکی جب رضا مندی کا اظہار کرتی ہے، تبھی لڑکے کے سامنے یہ

تجویز باضابطہ قانون اور شرعی طور پر برسرِمجلس پیش کی جاتی ہے۔ ان شرائط میں مہر کے علاوہ لڑکی کے جسم وجاں، عصمت وعزت نفس کی حفاظت اس کی کفالت اور اس کی رہائش وغیرہ سے متعلق تمام تر ذمہ داری لڑکے پر ڈالی جاتی ہے۔ جب لڑکا برسرِمجلس ان باتوں کا اقرار کرتا ہے تبھی دونوں کا نکاح ہوتا ہے۔ اس معاملے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ لڑکی پر شادی کا کوئی مالی بوجھ نہیں ہوتا۔ نہ تو شادی کے وقت اور نہ شادی کے بعد۔ لڑکی کو تحفہ دینا، مہر ادا کرنا اور دیگر اخراجات پورے کرنا لڑکے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس لیے وہ فرسٹ پارٹی یا لیڈنگ پارٹی ہوتا ہے۔ لڑکی باوجود اس کے اس پر کوئی مالی بوجھ نہیں ہوتا مگر وہ جانور کی طرح نہیں ہے کہ اس کو ایک کھونٹے سے ہٹا کر دوسرے کھونٹے میں باندھ دیا گیا۔ اس کے حقوق متعین ہیں اور اس کو حاصل کرنے کا اس کو قانونی حق ہے۔ اگر لڑکا اس کو اس کا حق ادا نہیں کرتا تو وہ قانوناً حاصل کرسکتی ہے۔ خاندان، معاشرے اور عدالت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ لڑکی کو اس کا قانونی حق ازروئے انصاف دلوائے اور اس کی عزتِ نفس کی حفاظت کرے۔

اس طرح لڑکا فرسٹ پارٹی ہوا اور اس کی ذمہ داری بھی زیادہ ہے۔ اب اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ لڑکے اور لڑکی کے درمیان بےمیل شادی ہوگئی ہے، دونوں کے مزاج میں مطابقت نہیں ہے۔ لڑکے کے علم میں لڑکی کا عیب اجاگر ہوتا ہے یا اور کوئی ایسی بات ہوتی ہے جس کی وجہ سے لڑکا لڑکی کو پسند نہیں کرتا، اس صورت میں قرآن کا حکم ہے کہ جلد بازی نہ کرو۔ اور اصلاح حال کی کوشش کرو۔ قرآن نے ایک اصولی بات بتائی ہے، کسی آدمی میں سب کچھ خراب نہیں ہوتا ہے۔ اگر کوئی بات خراب ہے تو کچھ اچھا بھی ہوگا۔ لہٰذا اچھی بات کو خراب بات پر ترجیح دی جائے اور اپنی طرف سے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ امید ہے کہ اس کی اچھائی اجاگر ہوجائے اور پھر سارا معاملہ درست ہوجائے۔ (النساء: 19)

لیکن کسی وجہ سے اصلاح کی صورت پیدا نہیں ہو، تب بھی صبر وحکمت کا دامن

ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور اصلاح کی مناسب صورت اختیار کی جائے۔ مثلاً اس کی فہمائش کی جائے، اس کو سمجھایا بجھایا جائے، اگر سمجھانے بجھانے سے بھی اصلاح کی صورت پیدا نہ ہو خواب گاہ میں اس سے الگ رہ کر یعنی زن و شو کے تعلق کو روک کر اس پر یہ باور کیا جائے کہ تم اس کے رویہ سے ناراض ہو اور جب تک وہ اپنی غلط روی نہیں چھوڑتی تم اس کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے، اتنا کرنے کے بعد بھی اصلاح کی صورت نہ نکلے تو ہلکی سرزنش تک کی جاسکتی ہے یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اصلاح نہ ہونے کی صورت میں معاملات بگڑ سکتے ہیں۔

اب اس کا مطلب ہے کہ معاملہ سنگین ہے اور میاں بیوی باہم اس معاملے کو حل نہیں کرسکتے ہیں اس صورت میں قرآن کا حکم ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں کے خاندان کے بزرگوں کو صحیح صورتحال سے واقف کراکر ان کو اصلاح حال کے لیے کوئی راستہ نکالنے کی درخواست کی جائے تاکہ رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔(النساء:35)

فرض کیجیے دونوں خاندان کے بزرگوں کی مصلحانہ کوششیں ناکام ہوجاتی ہیں۔ اب اس صورت میں رشتہ منقطع کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا ہے۔قرآن کا حکم ہے کہ میاں بیوی کے جیسے تعلقات رہے ہیں اس رشتہ کو ایک جھٹکے میں نہ توڑ دیا جائے بلکہ واپسی کا دروازہ کھلا رکھا جائے۔ اس لیے قرآن پہلا حکم یہ دیتا ہے کہ عورت کو حالت حیض میں طلاق نہ دی جائے۔ حالتِ حیض میں ہونے کی صورت میں عورت جسمانی اور نفسیاتی طور پر حالت صحت میں نہیں ہوتی اور اس دوران زن و شو کے تعلقات بھی نہیں ہوتے ہیں اس لیے جذباتی وابستگی کا فقدان ہوتا ہے لہٰذا یہ وقت قطع تعلق کا نہیں ہے۔ طلاق ہمیشہ طہر کی حالت میں دی جاسکتی ہے یعنی جس وقت حیض کی کیفیت نہ ہو۔ اس وقت قرآن کا حکم ہے کہ ایک طلاق دی جائے۔ اس کو طلاق رجعی کہتے ہیں جس میں رجوع کی گنجائش بغیر کسی ہر ہر کھٹ کھٹ کے باقی رہتی ہے۔

مرد تین مہینے سے پہلے پہلے کسی بھی وقت اپنی بیوی سے رجوع کرسکتا ہے۔ ایک

ہے رشتہ منقطع کرنا، طلاق کی دھمکی دینا، ہوسکتا ہے کہ عورت اس کو دباؤ بنانے کی ٹیکٹس سمجھے یا ڈرانے کی کوشش مانے اور ایک ہے واقعی طلاق دے دینا۔ جب اس نے طلاق دے دی اس کا مطلب ہے اس نے اپنا ارادہ پوری طرح واضح کردیا۔ اب اگر عورت واقعتاً طلاق چاہتی ہے تو وہ اپنے رویہ میں تبدیلی نہیں لائے گی۔ مگر وہ طلاق نہیں چاہتی ہے تو اس کے رویے میں واضح تبدیلی آئے گی اور وہ ان باتوں کو چھوڑنا چاہے گی جو اس کے شوہر کو ناپسند ہے۔ اب تک کی تمام کوششیں جو کسی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکیں اس ایک عمل سے کامیاب ہوسکتی ہیں۔

مگر مان لیجیے یہ صورت بھی پیدا نہیں ہوتی ہے اور عورت کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ تو مرد دوسرے طہر میں دو طلاق دے۔ اس دوران عورت اپنے شوہر کے گھر میں رہے گی، اس کا نفقہ اور تمام اخراجات مرد پہلے کی طرح برداشت کرے گا۔ اب دونوں عدت کی مدت یعنی تین ماہ انتظار کریں گے۔ اگر اس درمیان میں فریقین کے درمیان معاملات نہیں سدھرتے ہیں تو مرد تیسری طلاق دے کر عورت سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہوسکتا ہے جس کے بعد دونوں نکاح کے بندھن سے آزاد ہوجاتے ہیں اور ایک دوسرے پر حرام ہوجاتے ہیں۔

طلاق ہونے کے بعد عورت تین حیض تک اسی گھر میں رہے گی۔ اگر وہ حاملہ ہے تو وضعِ حمل تک اس کی عدت ہوگی اور اگر ایسی عورت ہے جس کو حیض نہیں آتا ہے تو اس کی عدت بھی تین مہینہ ہے۔

جب طلاق ہوگئی ہے تو مرد نے نکاح کے دن سے طلاق کی تاریخ تک جو کچھ بھی عورت کو دیا ہے زیور، مکان، کپڑا، پیسہ یا اور کوئی سامان سب اس عورت کی ملک ہوگی۔ اس کے بعد اگر مہر ادا نہیں کیا ہے تو مہر کی جو رقم طے ہے اس کو ادا کرنا ہوگا۔ اس کے بعد قرآن کا حکم ہے کہ رخصت کرتے وقت متاع للمعروف دے کر اس کو رخصت کیا جائے۔ یہی وہ بات ہے جس پر سارا فساد پیدا ہوا ہے۔ سپریم کورٹ نے اس کا مفہوم گزارہ بھتہ

نکالا جس کی وجہ سے اس نے شوہر پر اپنی مطلقہ بیوی کو گزارے کی رقم دینے کا حکم سنایا۔ جبکہ قرآن کا حکم یہ ہے کہ عورت کا مرد پر نفقہ اسی وقت تک واجب ہے جب تک وہ اس کی بیوی ہے۔ جب وہ اس کی بیوی نہیں رہی تو اس پر نفقہ واجب نہیں ہے۔ چودہ سو سالوں میں کسی فقیہ اور مفسر نے متاع معروف کا وہ مفہوم بیان نہیں کیا جو سپریم کورٹ بیان کرتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے اس کو مداخلت فی الدین مانا اور اس کو قرآن کی من مانی تشریح قرار دیا جو خلافِ شریعت ہے۔ اسی وجہ سے اتنا بڑا ہنگامہ ہوا۔ جہاں تک سوال متاع معروف کا ہے تو فقہا کی رائے میں اس کا تعین حیثیت اور حالات کے اعتبار سے ہوگا اس کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔ لہٰذا وہ دس درہم سے لے کر دس ہزار درہم یا اس سے زیادہ ہوسکتا ہے۔ بہرحال مطلقہ کے سلسلے میں پہلا حکم یہ ہے کہ اسے بھلے طریقے سے رخصت کیا جائے۔ اس کے سارے واجبات ادا کیے جائیں اور اس کو چلتے چلاتے بطور تحفہ اس کی حیثیت کے مطابق اس کو متاع معروف دیا جائے۔

یہ ہے وہ طریقہ جو قرآن نے بتایا ہے۔ اگر اس طریقے کو اختیار کیا جائے تو اولاً طلاق کے واقعات بہت کم ہوں گے اور اگر ہوں گے بھی تو اس کے انسانی اور معاشی پہلو میں وہ بھی بڑی حد تک حل ہوجائیں گے۔ اس وقت سارا مسئلہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کیونکہ لوگ قرآن کے بتائے ہوئے اس طریقے کی پیروی نہیں کرتے۔ لہٰذا اصلاح حال کی پہلی صورت تو یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن نے طلاق کا جو ضابطہ اور طریقہ بتایا ہے اس کی تفہیم و تعلیم دی جائے اور اس کو معاشرے میں عام اور مشتہر کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ وہ طریقہ ہے جس سے بہتر طریقے آج تک نہ تو کسی مذہب میں رائج ہے اور نہ دنیا بھر کے سیکولر ضابطوں میں موجود ہے جس پر ہمارے جدید اور جدت پسند لوگوں کو بڑا ناز ہے۔

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے:

(1) شادی عورت اور مرد کی آزادانہ مرضی سے دونوں خاندان کے سرپرستوں کے ذریعہ متعین شرطوں پر گواہوں کی موجودگی میں ہوتی ہے جس کو قرآن نے میثاق

غلیظ یعنی بہت مضبوط معاہدہ قرار دیا ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ زندگی بھر کا رشتہ ہے، جس کے ذریعہ ایک خاندان کی نیو پڑتی ہے اور جہاں ایک نئی نسل پروان چڑھتی ہے جو انسانی معاشرہ کی پاکیزہ نشو ونما کی ضامن ہے۔

(2) شادی میں مرد فرسٹ پارٹی ہوتا ہے اور عورت سکنڈ پارٹی ہوتی ہے۔ شادی کا تمام تر مالی بوجھ فرسٹ پارٹی یعنی مرد پر ہوتا ہے۔ عورت پر کوئی مالی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ اس لیے مرد کی حیثیت بطور فرسٹ پارٹی بلند ہوتی ہے۔ وہ قوام، محافظ اور کفیل ہوتا ہے۔

(3) طلاق تمام جائز امور میں سب سے ناپسندیدہ عمل ہے۔ یعنی اس کا استعمال اسی وقت ہونا چاہیے جب نباہ کی کوئی صورت نہ رہے۔ ورنہ جب تک نبھ سکے نباہ کرنا چاہیے۔ مرد کو خاص طور پر ہر ممکن تدبیر اختیار کرنی چاہیے تاکہ رشتہ برقرار رہے کیونکہ نکاح کے گہرے نفسیاتی اور سماجی اثرات ہوتے ہیں جو دونوں خاندانوں اور بالخصوص عورت مرد دونوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتے ہیں خاص طور پر اگر ان کے بچے ہوں، بچوں کی نفسیات پر خاندان کے ٹوٹنے کا برا اثر پڑتا ہے۔

(4) قرآن نے مرد کو سمجھایا ہے کہ اگر عورت کی کوئی بات اسے خراب لگتی ہے تو جلد بازی سے کام نہ لیے۔ اسے اصلاح کا موقع دے۔ اس کی اچھائیوں کو دیکھے اور اس کی کمزوریوں کو نظر انداز کرے۔

(5) عورت کی کوئی بات بری لگتی ہے تو اس کو سمجھائے، اچھے انداز سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اپنی پسند، ترجیحات اور دیگر چیزیں اسے کھل کر بتائے اور اس کو اپنا ہم مزاج بنانے کی کوشش کرے۔

(6) اس کی یہ کوشش عورت کے اندر مطلوبہ تبدیلی پیدا کرنے میں ناکام ہوتی ہے تو اپنی ناراضگی ظاہر کرے، اس سے بات چیت بند کرے، اس سے رشتہ زن وشو

منقطع کردے، اپنا بستر الگ کردے، ہلکی سرزنش کرے۔

(7) اگر یہ سب بھی رشتہ کو بہتر بنانے میں ناکام ہوں تو پھر دونوں خاندانوں کے بزرگ اور سرپرستوں سے مدد لی جائے اور وہ جانبین کی باتیں سن کر اصلاح کی کوشش کریں اور رشتہ کو بگڑنے سے بچائیں۔

(8) یہ صورت بھی ناکام ہوجائے تو آخری حربہ یہ ہے کہ عورت جب حیض سے فارغ ہو یعنی حالتِ طہر میں ہو تو اس کو ایک طلاق دے۔ گویا مرد نے اب یہ ارادہ ظاہر کردیا کہ حالات نہیں سدھرتے ہیں تو معاملہ رشتہ کے انقطاع تک جاسکتا ہے۔ اگر عورت اپنے رویہ میں تبدیلی لے آئے تو مرد اس درمیان رجوع کرسکتا ہے اور دونوں کے درمیان حالات معمول پر آجائیں گے۔

(9) فرض کیجیے ایک طلاق دینے کے بعد بھی اور دوسرا طہر آنے کے بعد بھی حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تو مرد دوسری بار طلاق دے۔ یہ گویا اعلان ہے کہ واپسی کے راستے بند ہورہے ہیں۔ اگر عورت راضی ہوجاتی ہے تو تین طہر سے پہلے پہلے مرد رجوع کرسکتا ہے اور اس کا رشتہ بچ جائے گا۔

(10) دو طلاق کے بعد بھی حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اس کا مطلب ہے کہ فریقین میں سے کوئی اپنے رویہ میں تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہے تو مرد تیسرے طہر کے درمیان تیسری طلاق دے۔ اس کے بعد ان دونوں کا رشتہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہوگیا۔ اب یہ دونوں میاں بیوی نہیں رہے بلکہ ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لیے حرام ہوگئے۔

(11) تین طلاق کے بعد اگر عورت حائضہ ہے تو تین مہینہ اور حائضہ نہیں ہے تو بھی تین مہینہ شوہر کے گھر میں رہے گی۔ اس دوران اس کی ضروریات حسبِ سابق پوری کی جائیں گی۔

(12) تین ماہ کے بعد اس کے تمام واجبات مع متاع معروف کے دے کر اس کو عزت

کے ساتھ رخصت کیا جائے گا۔ عورت اس وقت اپنے سابق شوہر کے گھر سے اٹھ کر اپنے ولی کے گھر آجائے گی۔ بچوں کی ذمہ داری حسبِ سابق باپ پر رہے گی۔

یہ ہے وہ طریقہ جو قرآن نے سکھایا ہے۔ دقت یہ ہے کہ لوگ اس طریقے پر عمل نہیں کرتے ہیں جس کی وجہ سے سارا فساد پیدا ہوتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں جو لوگ عورت کو تنگ کرنے کے لیے ایک یا دو طلاق دیتے تھے اور اس سے نہ رجوع کرتے تھے اور نہ اس کو چھوڑتے تھے، جس کی وجہ سے وہ نہ تو منکوحہ ہوتی تھی اور نہ مطلقہ۔ قرآن نے تین ماہ کی قید لگا کر یہ حد مقرر کردی کہ جو بھی فیصلہ کرنا ہے اسی درمیان کرلیا جائے تاکہ دونوں آزاد ہوجائیں اور اپنے بارے میں خود کوئی فیصلہ لے سکیں۔

اب ایک دوسری زیادتی یہ ہورہی ہے کہ لوگ ایک ہی مجلس میں تین طلاق کا اعلان کردیتے ہیں اور تمام ضابطوں کو نظر انداز کرکے بہ یک قلم اس رشتہ کو ختم کردیتے ہیں جس نے اس وقت معاشرے میں فساد برپا کررکھا ہے۔ فقہا اس طلاق کو طلاقِ بدعت مانتے ہیں کیونکہ یہ قرآن وسنت کے بتائے طریقے سے الگ ہے۔ مگر چونکہ یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے اس لیے وہ اس میں کوئی ہلکا پن نہیں لانا چاہتے اس لیے اس کو نافذ العمل مانتے ہیں۔ احناف یعنی حنفی فقہ میں یہ رائج ہے۔ ہندوستان میں چونکہ سنّی مسلمانوں کی غالب اکثریت لگ بھگ اسی فیصد حنفی فقہ کی ماننے والی ہے اس لیے یہ بہت پیچیدہ مسئلہ ہوگیا ہے۔ اہلِ حدیث اور شافعی فقہ کے ماننے والے ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق کو ایک ہی مانتے ہیں۔ لہٰذا وہاں اگر کسی نے تین طلاق دی بھی دی تو وہ اگر اپنے طرزِ عمل پر نادم ہوکر رجوع کرنا چاہتا ہے تو اس کو رجوع کا اختیار دیتے ہیں۔ مگر احناف کے یہاں یہ مسئلہ پیچیدہ ہوجاتا ہے۔ وہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق کو طلاق بائن مانتے ہیں جس میں رجوع کا اختیار نہیں ہے۔ ان کے نزدیک رجوع کی ایک ہی صورت ہے وہ حلالہ ہے۔ مجھے سخت تعجب ہے کہ مفتی صاحبان اپنے منہ سے ایسی بات کیسے نکالتے ہیں۔ کتنا بے غیرت ہے وہ

مفتی جو یہ طریقہ بتاتا ہے اور کتنا بے غیرت ہے وہ مرد اور عورت اور اس کا خاندان جو اس طریقے کو قبول کرتا ہے۔ یہ شریعت الٰہی کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ اس کو زنا کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔ علامہ اقبال نے شاید ایسے ہی فقہا اور مفتیان کو دیکھ کر یہ کہا ہوگا کہ

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

حلالہ سیدھے طریقے سے یہ ہے کہ عورت کو جب طلاق ہوگئی تو اس نے کسی دوسرے مرد سے شادی کرلی۔ اب وہ شوہر مرگیا یا اس نے اس کو پھر طلاق دے دی۔ اس کے بعد اگر وہ عورت اور اس کا پہلا شوہر باہمی رضا مندی سے پھر ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہیں تو یہ جائز ہے۔ اس کو حلالہ کہتے ہیں۔ نہ کہ ڈرامہ اسٹیج کیا جائے عورت کی کسی مرد سے اس شرط کے ساتھ شادی کردی جائے کہ وہ اس کے ساتھ ایک رات گزارے زن وشو کے تعلق قائم کرے پھر اس کو طلاق دے اور عدت کی مدت کے بعد وہ اپنے سابق شوہر کی طرف لوٹ جائے۔ وہ معاشرہ کتنا گندہ، گھٹیا، ناپاک، قابلِ نفرت اور گھناؤنا ہے جو اس قبیح شکل کو قبول کرتا ہے اور اس کو شریعت کا نام دیتا ہے۔ جس میں تبدیلی لانے پر جہاد کرنے کو تیار ہے۔ اگر یہی شریعت ہے تو اس کو جلد سے جلد بدل دینا چاہیے۔ خدا کی شریعت اور حضورﷺ کا لایا دین اتنا گندہ، ناپاک اور گھناؤنا نہیں ہوسکتا ہے۔ اس میں عورت کے حقوق اور عزت نفس کی جیسی پامالی ہوتی ہے وہ کسی جنگلی اور مویشی سماج میں بھی نہیں ہوگا کجا کہ اسلامی معاشرے میں ہونے کی بات کی جائے، مگر صد افسوس یہ آج کے مسلم معاشرے کی حقیقت ہے جس پر ساری دنیا آج ہنس رہی ہے۔

ہمارے یہاں فقہ کے جتنے مکاتب ہیں، وہ سب جائز ہیں اور دین میں وسعت اور تنوع پیدا کرتے ہیں۔ کوئی فقہ آسمان سے نازل نہیں ہوا ہے، یہ سب کی سب انسانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا فقہا نے ایسے متعدد امور میں ایک دوسرے کی رائے کو تسلیم کیا ہے۔ خود مفقود الخبر والے معاملہ میں فقہ حنفی کے ماننے والوں نے امام مالک کے فتوے کی بنیاد پر

فیصلہ دیا ہے۔ اس لیے تین طلاق کی بدعت کو روکنے اور اس کے برے اثرات سے سماج کو محفوظ رکھنے کے لیے اگر فقہ شافعی کی تین طلاق کو ایک طلاق مان لیا جائے تو بہت سے فتنوں سے بچا جاسکتا ہے۔

اس وقت ہمارے علماء اور فقہاء اور خود مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سامنے یہ سوال ہے کہ وہ تمام رائج فقہ میں جو گنجائشیں موجود ہیں اُن کی روشنی میں وہ اپنے موقف میں لچک پیدا کرتے ہیں اور ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق کو ایک مانتے ہیں یا پھر سرے سے پورے شرعی نظام کو کالعدم قرار دے کر یکساں سول کوڈ کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ اس وقت نہ اسلام بچے گا اور نہ اس کے مکاتب فقہ بچیں گے۔

میں کوئی فقیہ، عالم دین یا ماہر قانون نہیں ہوں۔ اس لیے میں کوئی آخری اور حتمی رائے نہیں دے سکتا۔ ایسے بہت سے امور ہیں جو کسی فیصلے تک پہنچنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے شرعی نظام میں جو گنجائشیں موجود ہیں ان کا غیر متعصّبانہ اور معروضی انداز سے جائزہ لینا چاہیے اور کوئی ایسا حل ضرور نکالنا چاہیے جو وقت کے تقاضے اور شریعت کی اسپرٹ کے مطابق ہو۔ اسلام اگر قیامت تک کا دین ہے اور ہر معاشرے، ہر زمانے اور ہر حالت میں ہماری رہنمائی کا مادہ رکھتا ہے تو ہمیں مومنانہ بصارت اور بصیرت سے کام لے کر ایسا حل ڈھونڈنا چاہیے جو عورتوں کے لیے، مردوں کے لیے، پورے مسلم سماج کے لیے، اسلامی شریعت کے لیے اور عام انسانی برادری کے لیے خیروفلاح کا ضامن ہو۔ یہ وہ گزارشیں ہیں جو میں یہاں پوری دردمندی کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ مسلمان عورتیں اسلام کے دائرے سے نکل کر کہیں کفر کا دامن نہ تھام لیں۔ہمیں اپنی عورتوں کو Enmass، بے دینی اور ارتداد کی گود میں جانے سے بچانا ہے۔

ان گزارشوں کے ساتھ ساتھ میں کچھ اور باتیں تمام لوگوں کے غور اور توجہ کے لیے کہنا چاہتا ہوں۔ ہمارے معاشرے میں خواہ کوئی پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ دینی جہالت

عام ہے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے دین کے ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں، اسی لیے ان کا غلط طرزِ عمل بیشتر دین کو نہ جاننے اور نہ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ روایتی طور پر جس چیز کا چلن دیکھتے ہیں اسی کو دین مان کر عمل کرنا شروع کردیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بیشتر رائج بدعات اور غلط طریقوں کی یہی وجہ ہے۔

بہت سے لوگ ایک مجلس میں تین طلاق اس وجہ سے دیتے ہیں کہ ان کو معلوم ہے کہ طلاق کا صرف یہی طریقہ ہے۔ لہٰذا اسلام نے طلاق کے جو طریقے بتلائے ہیں، اُن کے سلسلے میں بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر لوگ اس طریقے کو جان لیں اور اس پر عمل کریں تو اس مسئلہ میں جو پیچیدگی اور انسانی حقوق کی پامالی کا جو پہلو ہے، وہ بہت حد تک دور ہوسکتا ہے۔

ہمارے فقہاء اور علماء کہتے ہیں کہ ایک شخص نے تین طلاق دے کر ایک غلط کام کیا ہے۔ لہٰذا اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ مگر ہمارے سماج میں ایسے کسی شخص کو سزا کون دے گا۔ ہمارے شرعی اداروں کے پاس کوئی قوت نافذہ نہیں ہے اور عام عدالتیں سزا کا جواز نہیں رکھتیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتی ہیں کہ اس طلاق کو تسلیم نہ کریں اور عورت کو مرد کے ساتھ رہنے کی اجازت دیں۔

تین طلاق کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ لہٰذا اس کو معروضی طور پر دیکھنے کی ضرورت ہوگی اور الگ الگ حالات میں الگ الگ طریقے سے غور و فیصلہ کرنا ہوگا۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ مرد اپنی شرارت نفس، غصہ اور دیگر غیر اخلاقی وجوہات سے عورت کو طلاق دیتا ہے۔ تو یہ معاملہ بالکل جدا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عورت میں بعض ایسی خرابی ہے جس کو برداشت کرنا مرد کے لیے مشکل ہے لہٰذا وہ بغیر کسی لیت ولعل کے اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے اور یہ صورت پہلی صورت سے بالکل مختلف ہے۔ قانون کو ہر صورت کو سامنے رکھنا چاہیے اور از روئے انصاف فیصلہ کرنا چاہیے۔

پہلی صورت میں شوہر کو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے جبکہ دوسری

صورت میں اس کو جلد سے جلد الگ کرنا ہی بہتر ہے۔

طلاق ناخوشگواری کی انتہا کی علامت ہے۔ جب کسی وجہ سے نباہ ممکن نہ ہو تو طلاق کی نوبت آتی ہے۔ شوہر اگر اپنی بیوی سے شعوری علیحدگی چاہتا ہے اور اس وجہ سے اس نے طلاق دی ہے تو گویا واپسی کی راہیں مسدود ہیں۔ اس صورت میں اگر اس پر جبر کیا جائے تو خاندانی نظام بہتر ہونے کے بجائے خراب ہی ہوگا۔

ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ غصے میں، نشے کی حالت میں یا کسی وقتی جذباتی مسئلے سے متاثر ہوکر پھٹ پھٹ تین طلاق دے دیتے ہیں اور جب نشہ یا غصہ اترتا ہے، چھوٹے بچوں کے معصوم چہرے سامنے آتے ہیں، پھر عورت کی خوبیاں سمجھ میں آتی ہیں تو وہ رجوع کرنا چاہتے ہیں، میری رائے میں ایسے لوگوں کے لیے رجوع کا دروازہ کھلا رکھنا چاہیے۔

دراصل ہمارا ہندوستانی معاشرہ عرب اور یوروپ کے معاشرے سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارے معاشرے میں کنواری لڑکیوں کی شادی ایک بڑا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے ماں باپ ادھیڑ عمر میں دوبھر ہوجاتے ہیں، بیوہ اور مطلقہ کے بارے میں سماج کی سوچ بہت ہی خراب ہے اس لیے ہندوستان میں اس مسئلہ کی پیچیدگی بہت زیادہ ہے۔ جبکہ عرب اور یوروپ کے معاشرے میں لڑکیوں کی شادی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ساتھ ہی بیوہ اور مطلقہ کی دوبارہ شادی اس آسانی سے ہوجاتی ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب ان کے شوہر کا انتقال ہوا یا کب کسی نے طلاق دے دی، اس معاشرے میں تعدد ازدواج کا بھی عام چلن ہے۔ لڑکا لڑکی اور اس کے خاندان والے بڑی خندہ پیشانی سے ان چیزوں کو قبول کرتے ہیں۔ ہمارے بیشتر فقہا اسی معاشرے سے آئے ہیں۔ لہٰذا ان کے سامنے اس مسئلہ کی ہندوستان میں جو پیچیدگی ہے وہ کبھی ابھر کر آئی ہی نہیں اس لیے انھوں نے ان حالات کی سنگینی پر کبھی نہیں سوچا۔ لیکن ہندوستانی معاشرے میں یہ مسئلہ جتنا پیچیدہ اور سنگین بن کر ابھرا ہے اس پر نئے سرے سے سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کہتے ہیں کہ احوال وظروف کے

بدلنے سے احکامات کی نوعیت اس کا اطلاق وانطباق تبدیل ہوجاتا ہے۔ لہٰذا ہندوستان کی صورتحال اس مسئلہ پر نئے سرے سے غور کرنے کی متقاضی ہے۔

ہمارے معاشرے میں زیادہ تر لڑکیاں پڑھی لکھی نہیں ہوتی ہیں یا کم پڑھی لکھی ہوتی ہیں۔ جن کے پاس معاش کے متبادل راستے بہت محدود ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ میں لین دین کا چلن اتنا ہے کہ ایک شادی کے بعد لڑکی والوں کی معاشی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ اس صورت میں اگر طلاق ہوجائے تو اس پر دوہری مار پڑتی ہے، اکثر طلاق کے بعد لڑکے والے مہر اور کفالت تو بہت دور کی بات ہے جہیز میں دیا گیا سامان بھی واپس نہیں کرتے اور اگر واپس کرتے ہیں تو اس طرح کے دوبارہ اس کا استعمال نہیں ہوسکتا۔ مسلمان عام طور پر معاشی اعتبار سے خستہ حال ہیں اس صورت میں شادی ٹوٹنا لڑکی والوں پر تباہی کا سامان لے کر آتا ہے۔ لڑکی کی دوبارہ شادی قریب قریب ناممکن ہوتی ہے۔ ان حالات میں اور معاشرے میں طلاق کے مروجہ ضابطوں کو آنکھ بند کرکے تسلیم کرنا انصاف اور شریعت کی روح کے منافی ہے۔ اس سلسلے میں میں ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ جن دنوں شاہ بانو معاملہ چل رہا تھا میں نے تحفظ شریعت تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ مظفر پور شہر میں پچاس ہزار مسلمانوں کے جلوس کی قیادت کی تھی اور کلکٹر کو بہت ہی تفصیلی اور دلائل سے بھرپور میمورنڈم دیا تھا۔ اس تحریک کی وجہ سے مجھے بہت شہرت حاصل ہوئی اور بہار کے مختلف مقامات کے لوگ مجھے جلسوں اور جلوسوں میں بلانے لگے اور شہروں اور دیہاتوں ہر جگہ جاکر میں نے لوگوں کو بیدار کیا۔ اس سلسلے میں ہمارے دلائل عام لوگوں سے ذرا مختلف تھے جس کا ذکر اوپر کے ایک مضمون میں کرچکا ہوں۔ دربھنگہ (بہار) کے ایک دیہات میں ایسی ہی ایک مجلس تھی، ایک صاحب سارے انتظامات میں بہت پیش پیش تھے اور ان کی کوششوں سے وہ جلسہ کافی کامیاب ہوا۔ پروگرام ختم کرنے کے بعد ہم لوگ بس پکڑنے سڑک پر آئے، بس آنے میں دیر تھی اس لیے پاس کی چائے کی دوکان میں بیٹھ گئے۔ یہاں انھوں نے بہت غمگین لہجے میں کہا کہ ہم لوگ شریعت کی حفاظت چاہتے ہیں اور سرکار اس

میں کوئی مداخلت نہ کرے، اس کے لیے اس مہم میں ہر طرح ساتھ دے رہے ہیں۔ لیکن عملی مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور یہ کہہ کر وہ روتے ہوئے گویا ہوئے کہ میں تین بہن ایک بھائی ہوں۔ میرے والد نے جو گاؤں کے اسکول میں ٹیچر تھے اپنی جائداد بیچ بیچ کر اپنی تینوں بیٹیوں کی شادی کردی۔ نتیجہ کے طور پر گھر کے علاوہ بہت تھوڑی سی زمین ہم لوگوں کے پاس ہے۔ والد کا انتقال ہو چکا ہے، میں بھی شادی شدہ ہوں۔ میرے بھی بیٹے بیٹیاں ہیں بہت چھوٹا سا کاروبار ہے جس سے مشکل سے اپنے بچوں کی کفالت کر پاتا ہوں۔

ہماری ایک بہن کی شادی ایک عالم دین کے بیٹے سے جو خود ایک عالم دین ہے، سے ہوئی۔ اس وقت ان لوگوں نے بہت سارے مطالبات کیے جسے میرے والد نے زمین بیچ کر اور اپنی جمع شدہ پونجی سے کردی۔ والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ میری بیوہ ماں ہیں جو بیمار رہتی ہیں اور میرے ساتھ ہیں۔ شومیٔ قسمت ان عالم صاحب نے ہماری بہن کو طلاق دے دی ہے۔ انھوں نے نہ مہر دیا، نہ نفقہ دیا اور نہ نقد اور جہیز کا سامان لوٹایا۔ اب ہمارے سامنے مسئلہ ہے کہ میں اپنی بچیوں کی کفالت اور شادی کے بارے میں سوچوں یا بہن کی کفالت کروں۔ اگر مہر کی بات ہے تو بہت تھوڑی رقم ہوگی جو ایک مہینے کے گزارے کے لیے بھی کافی نہیں ہے اور اگر اس نے نفقہ دیا تو صرف تین مہینہ تک کا ہوگا جبکہ وہ کچھ بھی دینے کو تیار نہیں ہے۔ کئی بار پنچایت ہو چکی ہے، مگر وہ کوئی بات ماننے کو تیار نہیں ہے۔

یہ معاملہ ایسا تھا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ تب میں نے اس مسئلے کی شدت کو پوری طرح محسوس کیا اور اس کے بعد سے پھر میں کسی جلسے اور جلوس میں شریک نہیں ہوا۔ میرے سامنے جب تک اس مسئلہ کا کافی شافی حل نہیں نکالا جاتا اس مسئلہ پر یک طرفہ انداز میں بولنا ظلم کا ساتھ دینا ہوگا جو شریعت کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ لہٰذا کفالت کے مسئلہ پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں ہمیں معروضی انداز میں اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے جس کے متعدد متبادل ہو سکتے ہیں:

(1) پہلی صورت تو یہ ہے کہ تین طلاق کو ایک مان لیا جائے اور رجوع کا دروازہ کھلا

رکھا جائے تو کفالت کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔

(2) دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اگر عورت کو بغیر کسی اخلاقی جرم کے ظلماً طلاق دی گئی ہے تو مرد کی یہ سزا ہے کہ اس کو بطور تاوان جب تک اس کی شادی نہیں ہوجاتی یا کوئی متبادل معاشی کفالت کا راستہ پیدا نہیں ہوجاتا اس کو نفقہ دینا ہوگا۔

(3) تیسری صورت یہ ہے کہ مطلقہ یا بیوہ اگر پڑھی لکھی ہے تو اس کو نوکری میں ترجیح دی جائے تا کہ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے۔

(4) اگر عورت برسرِ روزگار ہے اور اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے قابل ہے تو اس صورت میں اس کو گزارہ بھتہ دینا ضروری نہیں ہوگا۔

(5) عورت کو اگر اخلاقی جرم میں ملوث ہونے کی وجہ سے طلاق دی گئی ہے تو اس صورت میں بھی گزارہ بھتہ نہیں دیا جائے گا۔

(6) مرد اگر اخلاقی جرم کی وجہ سے طلاق دیتا ہے تو اس کو گزارہ بھتہ دینا ہوگا۔

(7) آخری صورت یہ ہے کہ سوشل انشورنس میں مطلقہ اور بیوہ عورتوں کو بھی شامل کیا جائے اگر وہ جہالت، بیماری، کبرسنی یا کسی اور وجہ سے اپنا آزادانہ معاش تلاش کرنے میں ناکام ہیں تو ملک میں ایک عام آدمی کو جو Reasonable Standard ہے اس کے مطابق اس کو سوشل سیکوریٹی فراہم کرتے ہوئے اسٹیٹ ایسے لوگوں بالخصوص مطلقہ، متروکہ اور بیوہ عورتوں کی کفالت کا ایک وسیع نیٹ ورک تشکیل دے تا کہ اس طرح کی تمام عورتوں کی کفالت ہو سکے۔ اس میں صرف مسلمان عورتیں ہی نہیں ہوں گی بلکہ تمام مذاہب اور برادریوں کی عورتیں ہوں گی۔

میرے خیال سے اس پورے مسئلے کو شرعی نقطہ نظر سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کے نقطہ نظر سے بھی دیکھا جانا چاہیے۔ بالآخر شریعت کا مقصد عدل و انصاف کا قیام اور ظلم و جور کا خاتمہ ہے۔ لہٰذا شریعت کی اسپرٹ کو ملحوظ رکھتے ہوئے عصرِ حاضر کے مسائل کا حل ڈھونڈ نا ہی اس دور کے علماء اور فقہاء کے سامنے بڑا چیلنج ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ

ہمارے علماء، فقہاء اور دانش ور ان مسائل کا کیا حل نکالتے ہیں جس سے غیر مسلم دنیا، مسلمان عورتوں، عدالت، حکومت اور عام عوام سبھوں کو مطمئن کیا جاسکے اور سب سے زیادہ اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو۔ حضورﷺ نے بڑے مصالح کی خاطر صلح کی دستاویز پر اپنے رسول ہونے کی جو اللہ کے ذریعہ تفویض کی گئی حیثیت تھی اس کو نظرانداز کر کے بعض ایسی شرطوں کو مان لیا تھا جو بظاہر تھوڑا دب کر اور یکطرفہ تھے۔ لیکن اس کے دور رس نتائج سامنے آئے اور قرآن نے اس کو فتح مبین سے تعبیر کیا۔ کیا ہم نبوی بصیرت سے کام لے کر اس مسئلہ کا ایسا حل نہیں نکال سکتے جس سے شریعت بھی محفوظ رہے اور انصاف کے تقاضے بھی پورے ہوں۔ ہمارے سامنے یہی بڑا مسئلہ ہے جس پر اجتماعی غور وفکر کی ضرورت ہے۔

■❖■

(5) پانچواں مسئلہ تعدد ازدواج کا ہے

اسلام نے بعض مصالح کے تحت بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے۔ عہد جاہلیت میں اس کی کوئی حد متعین نہیں تھی، اسلام نے ایک وقت میں چار کی تحدید کی ہے۔ یعنی کوئی مرد ایک وقت میں چار شادیاں کرسکتا ہے۔ یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ یہ اجازت ہے، حکم یا فرض نہیں ہے۔ یعنی ایسا کرنا ہر مرد کے لیے ضروری نہیں ہے۔ ایسا آدمی جس کی اتنی استطاعت ہو کہ وہ ایک وقت میں ایک سے زائد بیویوں کی کفالت کرسکتا ہو، اگر وہ بعض مجبوری یا ضرورت کے تحت ایک سے زائد شادی کرتا ہے تو اس پر منہ آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسا کرنا کوئی جرم اور گناہ نہیں ہے، بلکہ جائز ہے۔

تعدد ازدواج کا چلن ہر سماج میں رہا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی آئی ہے اور آج کل یک زوجیت کا ہی چلن ہے۔ لہٰذا بہت سے ملکوں میں قانون بنا کر ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کو ممنوع قرار دیا ہے۔

یوروپ اور امریکی معاشرے میں بظاہر تو یک زوجیت کا ہی چلن پایا جاتا ہے، مگر وہاں کے کھلے سماج میں اکسٹرا میریٹل ریلیشن اور نن میریٹیل ریلیشن عام ہے۔ ایک مرد کے کئی عورتوں سے اور ایک عورت کے کئی مردوں سے رشتے ہوتے ہیں۔ خاندانی نظام

پوری طرح درہم برہم ہے۔ اگر اسٹیٹ ماں باپ کا رول ادا نہ کرے تو وہ ملک اور معاشرہ کب کا تباہ ہو چکا ہوتا۔ مگر چونکہ خوشحالی ہے اس لیے اس معاشرے کی قباحت اور گندگی آج کل فیشن بن کر سر چڑھ کر بول رہی ہے اور لوگ اس معاشرے کو ہی اپنا معیار سمجھتے ہیں، جبکہ اس معاشرے سے پاکیزگی، حیا، عصمت وعفت کب کی ختم ہوچکی ہے۔

عربی معاشرے میں تعدد ازدواج کا چلن آج بھی قائم ہے۔ وہاں کے معاشرے میں عورت اور مرد دونوں اس بات کو بہت آسانی سے قبول کرتے ہیں جس کی وجہ سے اس معاشرے میں لڑکیوں کی شادی یہاں تک کہ بیوہ اور مطلقہ کی شادی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن اس معاشرے میں بھی دھیرے دھیرے تعدد ازدواج کا رواج کم ہورہا ہے۔

ہندوستان کا مسلمان معاشرہ ہو یا غیر مسلم معاشرہ وہ تعدد ازدواج کو پسند نہیں کرتا۔ لوگ تعدد ازدواج کے معاملے میں مسلمانوں پر منہ آتے ہیں جبکہ اعداد وشمار یہ بتاتے ہیں کہ ہندوسماج میں اس کا چلن مسلمان سماج سے زیادہ ہے۔ ہندوستان میں جو ہندو کوڈ بل نافذ ہے اس میں ایک وقت میں ایک ہی شادی کی اجازت ہے۔ خاص طور پر جو لوگ سرکاری نوکریوں میں ہیں ان پر یہ پابندی زائد ہے۔ لیکن جو لوگ سرکاری نوکری میں نہیں ہیں ان پر اس پابندی کا زیادہ اثر نہیں ہے۔ سرکاری نوکریوں میں رہنے والے ایسے سینکڑوں ہزاروں لوگ ہیں جنھوں نے دو شادیاں کررکھی ہیں، ان کے متعدد مقدمات عدالتوں میں ہیں۔ ابتداً عدالتیں دوسری شادی کو تسلیم نہیں کرتی تھیں اور دوسری بیوی اور اس کی اولاد کو کوئی حق نہیں دیتی تھیں۔ مگر اب اس کی کثرت اتنی ہوگئی ہے کہ عدالتوں نے اپنا نظریہ تبدیل کرلیا ہے اور اس نے دوسری شادی کو غیر قانونی مانتے ہوئے بھی دوسری بیوی اور اس کے بچے کو حق دلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مگر شوروغوغا کچھ اس طرح کا ہے گویا ہر مسلمان چار شادی کرتا ہے۔ مسلمانوں کی آبادی میں جو تھوڑا سا اضافہ ہوتا نظر آرہا ہے اس کو تعدد ازدواج سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ لوگوں کو ذرائع ابلاغ اور مختلف ذرائع سے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ چونکہ مسلمان چار چار شادیاں کرتے ہیں اور چالیس چالیس بچے پیدا

کرتے ہیں اس لیے ان کی آبادی بڑھ رہی ہیں۔ مسلمان یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کررہے ہیں تاکہ ہندوستان میں ان کی آبادی ہندوؤں سے زیادہ ہوجائے گویا ہندوستان کو مسلمانستان بنانے کی سازش کا یہ حصہ ہے۔ اس لیے تعدد ازدواج کو غیر قانون بنانے کی مانگ ہورہی ہے اور مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی بات کی جارہی ہے۔ یہ ایسی بیہودہ اور بے بنیاد بات ہے کہ ان ہفوات کا جواب دینا ضروری نہیں ہے۔

تعدد ازدواج کے جواز اور عدم جواز پر لمبی چوڑی بحث کی جاسکتی ہے۔ ہمیں اس کے جواز اور عدم جواز پر کچھ نہیں کہنا ہے۔ قرآن نے تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے۔ لہٰذا یہ جائز ہے اور بعض ہنگامی حالات میں ضروری بھی۔ ہم اس مسئلہ کو حقوق انسانی کے نقطہ نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

قرآن نے سورہ النساء آیت نمبر 4 میں ایک سے زائد شادیوں کی اجازت دی ہے۔ لیکن یہ اجازت مطلق نہیں ہے بلکہ ایک Rider کے ساتھ ہے اور وہ Rider یعنی شرط یہ ہے کہ ان کے ساتھ انصاف کرو اور اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم انصاف نہ کرسکو گے تو ایک عورت پر اکتفا کرو۔ اسی سورہ کی آیت نمبر 129 میں قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ تم چاہ کر بھی پورا پورا عدل نہیں کرسکتے، اس صورت میں ایک کو بالکل نظر انداز کرکے دوسری کا ہورہنا مناسب نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ایک سے زائد شادی اپنے ساتھ بہت سے آزمائشی حالات لاتی ہے جو شوہر اور بیوی دونوں کو مختلف اعصاب اور نفسیاتی دباؤ میں مبتلا رکھ سکتی ہے۔ لہٰذا تعدد ازدواج کی کھلی اور بلا شرط اجازت دینا مناسب نہیں ہے۔ جواز جواز ہے جو شرطوں کے ساتھ نافذ ہوگا۔ اگر شرط پوری نہیں ہوتی ہے تو جواز بھی کالعدم کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا پہلی بیوی اگر موجود ہے تو اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر دوسری شادی کی اجازت دینا مناسب نہیں ہے۔ اگر یہ معاملہ چوری چھپے نہیں ہورہا ہے تو اس کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے کیونکہ اس سے اس کے حقوق پر اثر پڑے گا۔ جس پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا اس کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ قیام عدل کوئی آسان کام نہیں ہے لہٰذا اس کو پوری طرح

مشروط اور متعین ہونا چاہیے ورنہ عموماً پہلی بیوی اور اس کے بچوں پر ظلم ہوگا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں نے دو شادیاں کررکھی ہیں صرف یہی نہیں کہ پہلی بیوی نظر انداز ہوتی ہے بلکہ اس کے بچے بھی بڑی حد تک باپ کی محبت وشفقت اور خبر گیری سے محروم ہوجاتے ہیں۔لہٰذا یہ کسی شخص کے ذاتی اختیار کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کے متعلقین کے حقوق کا مسئلہ ہے۔

ظاہرسی بات ہے جس چیز کی شریعت نے اجازت دی ہے اس کو ختم تو نہیں کیا جاسکتا ہے،مگر جن شرطوں کے ساتھ شریعت نے اس کی اجازت دی ہے اس کو متعین کر کے تمام لوگوں کے حقوق کو متحقق کر کے ہی اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

لہٰذا تعدد ازدواج کے جواز کی حد تک تو معاملہ صحیح ہے مگر اس کا نفاذ مشروط ہونا چاہیے، یہ وقت، انصاف، شریعت اور حقوق انسان کا تقاضہ ہے۔ اگر کوئی شخص ان شرائط کو پورا کرنے کا اہل نہیں ہے تو اسے اس اجازت سے فائدہ اٹھانے کا اختیار بھی نہیں ملنا چاہیے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے اس پر اہلِ علم وفکر اور علماء وفقہاء کو غور کرنا چاہیے۔

■❖■

(6) مسجد اور مزار میں داخلے کا مسئلہ

اس وقت ایک اہم سوال جو بالخصوص الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں بحث کا موضوع بنا ہوا ہے وہ مسلمان عورت کے مسجد اور مزار میں جانے کا ہے۔ دراصل ہندوستان کے بعض مقامات پر مندروں میں ہندو عورتوں کے داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ جس کے خلاف کئی ہندو عورتوں اور ان کی حامی تنظیموں نے مہم چھیڑ رکھی ہے اور یہ معاملات عدالت تک پہنچ گئے ہیں جس میں عدالت نے اس بے جا پابندی پر اعتراض کیا ہے اور عورتوں کو داخلے کی اجازت دی ہے۔ جس کے نتیجے میں روایت پرست مذہبی گروہ کی مخالفت کے باوجود عورتیں زبردستی مندروں میں داخلے کی کوشش کررہی ہیں جس میں انھیں جزوی کامیابی بھی ملی ہے۔

اس مسئلہ کی سنگینی سے توجہ ہٹانے کے لیے اور اس کو فرقہ وارانہ رنگ دیتے ہوئے نیز عورتوں کے حقوق سے جوڑتے ہوئے مسلمان عورتوں کے مسجد اور مزار پر داخلے کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ہندوستان میں بعض ایسے مزارات ہیں جہاں صاحبِ قبر کے پاس عورتوں کو جانے سے روکا جاتا ہے جبکہ مرد اس جگہ پر بلا روک ٹوک جاتے ہیں۔ بعض ایسی خواتین ہیں جو بظاہر پڑھی لکھی اور ماڈرن ہیں جو اسلام کے فرائض نماز، روزہ وغیرہ کا اہتمام نہیں کرتی ہیں اور نہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اسلامی شعائر کی پابند ہیں اور نہ اس کا

احترام کرتی ہیں۔مگر وہ بعض مزارات سے عقیدت رکھتی ہیں اور وہاں جانا اور صاحبِ مزار سے دعا مانگنا ایک جائز اور ضروری عمل جانتی ہیں، ان کو بعض مزارات میں صاحبِ مزار کے قبر تک جانے کی اجازت نہیں دی جاتی جیسا کہ ممبئی میں حاجی پیر علی کے مزار کے بارے میں سننے کو ملتا ہے۔

سب سے پہلا سوال ہے کہ کسی بھی مزار پر جانے کی غرض و غایت کیا ہے؟ قبرخواہ کسی کی بھی ہو وہ درس عبرت کی جگہ ہے چاہے وہ بادشاہ کی قبر ہو یا کسی کی فقیر کی۔ موت کسی کو نہیں بخشتی۔ ہر ذی روح چاہے وہ پیر و پیمبر ہو یا عام آدمی موت آنی ہے اور موت آتی ہے۔ اور ہر شخص اپنے ایمان اور عمل کے عوض خدا کے حضور گروی ہے جس کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا کہ واقعی کون کس مرتبے کا ہے الاّ یہ کہ جس کا علم اللہ یا اللہ کے رسول نے پہلے دے دیا ہے۔ بزرگانِ دین اور صلحائے امت اللہ کی نشانیاں ہیں جن سے لوگوں کو ہدایت بھی ملتی ہے اور خلق اللہ کو فیض بھی حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا مزار پر جانے کا ایک دوسرا مقصد ان بزرگوں کے حق میں دعائے خیر کرنا ہے۔ یہ نیکی اور ثواب کا کام ہے۔ تیسرا مقصد ان کی سیرت اور اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنا ہے تا کہ ہماری زندگی بھی اللہ کی رضا اور خلق اللہ کی خدمت میں گزرے۔ بزرگوں سے عقیدت رکھنا، ان سے محبت کرنا، ان کے مشن کو آگے بڑھانا یہ سب مستحسن ہیں۔ اگر کوئی مرد وعورت اس مقصد سے مزاروں کی زیارت کرتا ہے تو یہ ایک پسندیدہ عمل قرار دیا جائے گا۔لیکن آج ایک افسوسناک صورتحال یہ دیکھنے کوملتی ہے کہ لوگوں نے مزارات کوتجارت کا مال بنالیا ہے اور لوگوں کی دینی جہالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں ایسے اعمال انجام دیے جاتے ہیں جو شرک اور کفر کی تعریف میں آتے ہیں۔ مزاروں پر بالعموم آج کل غیر مسلم حضرات کی تعداد زیادہ دیکھنے کوملتی ہے اور اس کو قومی یکجہتی، سیکولرزم اور ہندو مسلم ایکتا کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ چونکہ ہندوؤں کے یہاں ہر چیز کی پوجا ہوتی ہے اس لیے وہ اگر مزاروں پر آکر سجدہ کرتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں یا وہاں اپنے انداز سے عبادت کرتے ہیں، تو اس سے ان کے دین اور

عقیدے پر فرق نہیں پڑتا۔ وہ محض کچھ مادی فائدے کے لیے اسی طرح کا عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ جبکہ ایک مسلمان کو صرف ایک خدا کی بندگی کے علاوہ کسی اور کی بندگی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی مسلمان ایسا کوئی عمل کرتا ہے جس کی قرآن وسنت میں اجازت نہیں ہے تو چاہے جس مفتی نے یہ فتویٰ دیا ہو یا جس عالم کا یہ طرزِ عمل رہا ہو اس کو قرآن وسنت کی روشنی میں جائز نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ اس میں کسی مرد اور عورت کے درمیان فرق نہیں ہے۔ جو چیز عورتوں کے لیے حرام ہے وہ مردوں کے لیے بھی حرام ہے۔ لہٰذا اگر مزار پر صاحبِ مزار کی قبر تک مردوں کو جانے کی اجازت ہے تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہاں تک عورتوں کو جانے کی اجازت کیوں نہیں دی جائے گی۔ مرد وعورت میں اس طرح کا فرق وامتیاز کرنا میرے خیال میں اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہے۔ اس لیے جو لوگ اس پر روک لگاتے ہیں ان کو اپنے طرزِ عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

صاحب مزار کوئی بزرگ ہیں تو ان سے عقیدت رکھنا، ان سے محبت کرنا، ان کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں اتارنا، ایمان اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرنا، خلق اللہ کی خدمت کرنا، ان کی عزت کرنا واحترام کرنا، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرنا، ان کی نیکیوں اور حسنات کے حوالے سے اللہ سے دعا کرنا میری رائے میں جائز اور پسندیدہ عمل ہے جس میں عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن صاحب مزار کو براہِ راست حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنا اور خدا کو چھوڑ کر ان کو پکارنا ان سے مدد طلب کرنا، یا ان کو خدائی میں کسی درجہ میں شریک سمجھنا قرآن وسنت کی تعلیمات کے خلاف ہے جس پر لوگوں کو متنبہ کرنے کی ضرورت ہے اس کے لیے قرآن وسنت کی تعلیم کو عام کرنے کی ضرورت ہے اور مزارات پر حاضری کے آداب سے لوگوں کو واقف کرانے کی ضرورت ہے تاکہ لوگ جہالت میں کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں جو ان کے ایمان کے منافی ہے اس لیے میرے خیال میں عورتوں کو مزار پر جانے سے روکنا یا صاحبِ مزار کے قبر تک جانے سے منع کرنا اس کا کوئی جواز نہیں ہے، اس لیے حدود اور آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے وہاں تک جانے میں

کوئی حرج نہیں ہے۔

جہاں تک مسجد میں عورتوں کے جانے کا سوال ہے۔ یہ مزار پر جانے سے بالکل دوسری نوعیت کا معاملہ ہے۔ مسجد عبادت کی جگہ ہے جہاں پنج گانہ نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے۔ لہٰذا عبادت کی غرض سے عورت اور مرد بلا روک ٹوک مسجد میں جاسکتے ہیں۔ ہاں مسجد میں عورتوں کے نماز پڑھنے کی جگہ الگ ہوگی اور مردوں کے نماز پڑھنے کی جگہ الگ ہوگی۔ کوشش کی جائے گی کہ دونوں کے درمیان اختلاط نہ ہو۔ دونوں کے لیے الگ الگ دروازے ہوسکتے ہیں اور الگ الگ جائے نمازیں بھی ہوں گی۔

دراصل حضورﷺ کے زمانے میں اور بعض روایات کے مطابق حضرت عمرؓ کے زمانے تک عورتیں باضابطہ پنج وقتہ نمازوں میں مسجد آیا کرتی تھیں اور جماعت سے نماز ادا کرتی تھیں۔ عورتوں کی صف مردوں سے الگ ان کے پیچھے لگتی تھی تاکہ وہ آسانی سے آجاسکیں۔ جمعہ اور عیدین کی نماز بھی ساتھ پڑھتی تھیں، اس زمانے میں دور تک آواز پہنچانے کا ذریعہ نہیں تھا اس لیے حضور مردوں کو خطاب کرنے کے بعد عورتوں کی صف کے قریب جاتے اور ان کو بھی خطاب فرماتے۔ اس موقع پر عورتیں حضورﷺ سے سوال بھی پوچھتیں اور آپؐ ان کا جواب بھی دیتے۔

دھیرے دھیرے مسلمانوں کی آبادی بڑھنے لگی اور دور دراز کے لوگ مدینہ آنے لگے۔ جس میں زیادہ تر اجنبی لوگ تھے۔ یہ پتہ لگانا مشکل تھا کہ کون کس نیت اور ارادے سے آرہا ہے۔ اس لیے یہ محسوس کیا گیا کہ عورتوں کو پانچوں وقت مردوں کی طرح مسجد میں باجماعت نماز کے لیے آنے کا پابند بنانا مناسب نہیں ہوگا، عورتوں کی مخصوص دقتوں کی وجہ سے ان کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ گھروں میں ہی نماز ادا کریں بلکہ گھر میں نماز ادا کرنا زیادہ مستحسن قرار دیا گیا۔ اس طرح پنج وقتہ نمازوں میں ان کا مسجد آنا ضروری نہیں رہا۔ تاہم ان کو اس سے روکا نہیں گیا اور بہت ساری عورتیں مسجد میں آکر نماز ادا کرتی رہیں۔ چونکہ حضورؐ نے اس کی اجازت دے رکھی تھی اس لیے کوئی ان کو روک نہیں سکتا تھا۔ یہ سلسلہ

حضرت ابوبکرؓ تک یونہی چلا۔ مگر حضرت عمرؓ کے زمانے میں مدینے کی بڑھتی آبادی اور دیگر وجوہات کے باعث حضرت عمرؓ نے عورتوں کو گھر پر ہی نماز ادا کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد پنج وقتہ نمازوں میں عورتوں کا آنا کم ہوگیا۔ تاہم جمعہ اور عیدین میں یہ سلسلہ باقی رہا۔

اسلام جب خطہ عرب سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گیا، اس درمیان فقہ کے مختلف اسکول قائم ہوگئے جنھوں نے قرآن، سنت، آثار اور قیاس کی بنیاد پر مسائل کا استنباط شروع کیا جس میں صحابہ کے عمل کو بھی ایک زبردست مآخذ کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ کم وبیش تمام فقہاء نے اس بات کو ترجیح دی کہ عورتوں کو پنج گانہ نماز گھر کے اندر ہی ادا کرنا چاہیے لیکن چونکہ حضورؐ کے عہد میں اس کی اجازت تھی، اس لیے کسی نے اس سے روکا یا منع نہیں کیا۔ مگر مسلمان معاشرے میں دھیرے دھیرے عورتوں کا مسجد میں آکر نماز ادا کرنا قریب قریب بند ہوگیا۔ جس کی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ عورتوں کا مسجد میں آنا منع ہے۔ منع نہیں ہے تاہم حالات کی وجہ سے قابلِ ترجیح عمل نہیں ہے۔

فقہا میں امام ابوحنیفہؒ نے حضرت عمرؓ کے عمل کو دلیل مان کر عورتوں کا مسجدوں میں نماز کی غرض سے آنا قابل ترجیح نہیں مانا چنانچہ جہاں جہاں امام ابوحنیفہ کے اثرات تھے یعنی حنفی مسلک کے لوگ تھے ان کی عورتیں مسجدوں کے بجائے گھر میں نماز پڑھنا پسند کرتی ہیں، اس لیے وہ مسجد نہیں آتی ہیں۔ یہ عمل پنج گانہ نماز سے شروع ہوا یہاں تک کہ جمعہ اور عیدین کی نماز بھی عورتیں جماعت کے ساتھ مسجد یا عیدگاہ میں جا کر ادا نہیں کرتی ہیں۔ جبکہ دوسرے فقہا مثلاً امام شافعی اور دیگر نے حضور کے عمل سے سند لیتے ہوئے عورتوں کا مسجد میں آنا جاری رکھا۔ چنانچہ آج بھی مسلک شافعی اور غیر مقلد حضرات کے یہاں عورتیں مسجد میں آکر نماز ادا کرتی ہیں اور جمعہ اور عیدین کی نماز میں حصہ لیتی ہیں۔

برصغیر ہندوپاک میں چونکہ غالب اکثریت فقہ حنفی کے ماننے والوں کی ہے اس لیے عام طور پر عورتیں مسجد میں نماز ادا نہیں کرتی ہیں لیکن یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ ایسا کرنا حرام یا ممنوع نہیں ہے۔ یوروپ اور امریکہ جہاں اسلامی شناخت کو زبردست خطرہ

لاحق ہے، کسی بھی مسلک کے مسلمان اپنی عورتوں کے ساتھ مسجد میں جاتے ہیں اور باجماعت نماز ادا کرتے ہیں۔ اس طرح عورتیں بھی ان ممالک میں اسلامی مین اسٹریم کا حصہ بنتی ہیں جس سے ان کو اپنی دینی شناخت بنائے رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

اس وقت جس طرح کے حالات پیدا ہورہے ہیں اور برصغیر ہندوپاک میں کفر وشرک دروازے اور فصیل توڑ کر ہمارے گھروں میں داخل ہوگیا ہے، ہماری عورتوں میں دین سے جیسی بے خبری اور دوری پائی جاتی ہے اور جس طرح وہ غیر اسلامی تہذیب اور اخلاق سے متاثر ہوکر اپنے شعائر اور شناخت سے دور ہوتی جارہی ہیں ان کے اندر صحیح اسلامی شعور پیدا کرنے کے لیے ان کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جس میں مسجد کا اہم کردار ہوسکتا ہے۔ لہٰذا عورتوں کو مسجد تک لانا وقت کا اہم تقاضہ ہے۔

آج کے حالات ماضی کے حالات سے بالکل مختلف ہیں۔ ماضی میں مسلمان معاشرہ دو واضح حصوں میں تقسیم تھا ایک شرفاء کا طبقہ تھا جن کی عورتیں پردے میں رہتی تھیں اور گھروں سے باہر نکلنا قریب قریب نہیں ہوتا تھا جبکہ عام عوام بالخصوص غرباء کو یہ تعیش حاصل نہیں تھا، لہٰذا ان کی عورتیں مختلف کاموں سے گھر سے نکلتی تھیں، وہ کھیتی باڑی، مزدوری اور چھوٹی موٹی تجارت یا گھروں میں کام کرکے اپنی زندگی گزارتی تھیں۔ ہمیشہ سے اور ہر زمانے میں غرباء کی اکثریت رہی ہے اس لیے ان عورتوں کو پردے میں رہنا اور کوئی کام نہ کرنا ممکن نہ تھا۔ اب جبکہ حالات پوری طرح بدل چکے ہیں زمینداریاں اور جاگیرداریاں ختم ہوچکی ہیں، لہٰذا بغیر کام کیے عیش کی زندگی گزارنا ناممکن ہوگیا ہے، جن گھروں میں تعلیم ہے وہ حالات کا بہتر طور پر مقابلہ کرنے کے اہل ہیں اور جہاں تعلیم نہیں ہے وہاں وہ ابھی بھی غربت وتنگ دستی کے دلدل میں پھنسے ہیں۔ اس لیے اب عام لوگوں کے اندر تعلیم کا ذوق پیدا ہوا ہے۔ ابتداً لوگ صرف مردوں اورلڑکوں کی تعلیم پر زور دیتے تھے مگر جب سے لڑکیوں کو نوکری اور دیگر چیزوں میں سہولت ملنی شروع ہوئی ہے تو حالات سے مجبور ہوکر لوگوں نے لڑکیوں کو بھی پڑھانا شروع کیا ہے۔ پہلے تو لڑکیوں کو ناقص العقل

اور نہ جانے کیا کیا سمجھ کر بہت معمولی تعلیم دی جاتی تھی۔ مگر جیسے جیسے انھوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت دینا شروع کیا تو اب لوگ بڑی تعداد میں ان کو ٹیکنیکل اور پروفیشنل تعلیم دلوارہے ہیں اور بسا اوقات لڑکیاں لڑکوں پر سبقت لے جارہی ہیں جو ثابت کرتا ہے کہ ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے وہ لڑکوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اس طرح بہت ساری لڑکیاں اچھی تعلیم وتربیت حاصل کرکے ہر طرح کی نوکریوں میں آرہی ہیں۔ اس بحث سے صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ حالات کے تقاضے کے طور پر اب لڑکیاں تعلیم کے لیے، نوکری کے لیے، روزگار کے لیے، دوا علاج اور روز مرہ کی دیگر ضروریات کے لیے بڑی تعداد میں گھروں سے باہر آرہی ہیں، اسکول کالج، ورک پلیس، بازار، بس اسٹینڈ، ریلوے اسٹیشن، ایئرپورٹ، ہسپتال، تفریح گاہ، مال اور دیگر تجارتی مراکز پر اکیلے یا کسی کے ساتھ جارہی ہیں۔ اس طرح گھروں سے باہر آنا اور اپنی ضروریات کے لیے روز مرہ کے کاموں کو انجام دینا ایک معمول سا بن گیا ہے۔ جب عورتیں اپنے کام کے لیے ہر جگہ آجاسکتی ہیں اور اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی تو صرف مسجد میں آنے سے ان کو روکنا کس طرح مناسب اور صحیح ہوگا جبکہ وہ مسجد میں نماز ادا کرنے اور عبادت کرنے کی غرض سے آئیں گی۔ ظاہر سی بات ہے مسجد میں حاضری جب ہوگی اس وقت وہ عام طور پر بازار یا دیگر جگہوں پر جیسے جاتی ہیں اس سے مختلف ہوگی۔ ساتر لباس میں ہوں گی، سر اور جسم کے اعضا پوری طرح ڈھکے ہوئے ہوں گے، شائستگی اور متانت کے ساتھ آئیں گی اور مسجد کے پاکیزہ ماحول کا احترام کرتے ہوئے عبادت کریں گی۔ مسجد میں ان کے آنے اور نکلنے کا راستہ مردوں سے مختلف ہوگا اور ان کی صف بھی مردوں سے الگ اور دور ہوگی۔ عبادت کے علاوہ مسجد میں جمعہ اور عیدین کے موقع پر جو خطاب ہوتا ہے یا دیگر اجتماعات ہوتے ہیں اس میں ایمان، عبادت، اخلاق، تعلق باللہ، خوفِ آخرت اور حقوق کے باب میں جو گفتگو ہوتی ہے اس سے ان کی سوچ اور سیرت و کردار پر مثبت اثر پڑے گا اور ایک بہتر معاشرہ بنانے میں اس سے مدد ملے گی۔

ابھی چونکہ عورتیں مسجد میں نہیں آتی ہیں اس لیے مسجدوں میں بالکل ایک طرفہ گفتگو ہوتی ہے۔ ہمارے علماء اور امام جب گفتگو کرتے ہیں تو صرف مردوں سے خطاب کرتے ہیں، عورتوں کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات کا پورا حصہ نظر انداز ہوجاتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام صرف مردوں کا دین ہے۔ عورتوں کو اس نے مخاطب نہیں بنایا ہے۔ جبکہ قرآن پاک کا خطاب عورتوں اور مردوں سے یکساں ہے۔

ایمانیات، عبادات، اخلاقیات، حقوق کے باب میں جو ہدایات دی گئی ہیں اُن میں عورتوں اور مردوں دونو ں سے خطاب کیا گیا ہے۔ چندمخصوص باتیں ہیں جن میں بعض معاملات میں صرف عورتوں کو خطاب کیا گیا ہے اور بعض میں مردوں کو۔ ورنہ اسلام جس طرح مردوں کا دین ہے اسی طرح عورتوں کا دین ہے۔ اس لیے عورتوں کو بھی دینی امور میں حصہ داری کا پورا پورا موقعہ ملنا چاہیے چونکہ عورتیں مسجدوں میں نہیں آتی ہیں اس لیے اکثر ہمارے علمائے کرام عورتو ں کے باب میں بہت بھونڈی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جو ان کی دین کی ناقص سمجھ کی علامت ہے۔ لہٰذا اگر عورتیں مسجدوں میں آئیں گی تو گفتگو نہ صرف ہمہ جہت ہوگی، سبھوں کو مخاطب کرکے کی جائے گی بلکہ اس میں توازان اور اعتدال کے ساتھ شائستگی بھی آئے گی۔ اور اس طرح اسلامی تعلیمات کی وسعت و جامعیت ابھر کر لوگوں کے سامنے آئے گی۔ اس لیے میری رائے ہے کہ ہماری مسجدوں کے نظام میں ایسی تبدیلی لانی چاہیے جہاں عورتیں باآسانی نماز ادا کرسکیں۔ اس غرض کے لیے مسجدوں کی تعمیر کا نقشہ موجودہ تعمیر سے مختلف ہوگا جہاں عورتوں کے لیے استنجاخانہ، وضو خانہ اور نماز کی جگہ مردوں سے بالکل الگ ہوگی اور ایسی بنائی جائے گی جہاں ان کی privacy کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا اور مسجدوں کے اندر مرد وعورت کا اختلاط بالکل نہ ہوگا۔ عورتوں کی الگ مسجد بھی بنائی جاسکتی ہے جہاں عورتیں ہی نماز ادا کریں اور کوئی عورت ہی امامت کرے۔ وقت آ گیا ہے کہ امت کے علماء اور فقہاء کو حالات کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ عورتوں کو مساجد میں لانے کا انتظام کرنا چاہیے بلکہ اس کے لیے مہم چلانی چاہیے تاکہ ہم

اپنے گھروں میں چلنے والے کفر وشکر، بدعات وخرافات، غیر اسلامی رسوم و عادات اور بے دینی و ارتداد کا مقابلہ کرسکیں۔عورتیں اگر مسلمان ہوں گی تو ان کی گود میں پلنے والی نسل بھی مسلمان ہوگی۔ اس لیے عورتوں کو اسلام پر قائم و عامل رکھنا اپنی نسلوں کو دین پر قائم رکھنے کا عمل ہے۔ اس لیے اس وقت سب سے زیادہ خواتین کی ذہنی اور دینی تربیت پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے مسجد سے بہتر کوئی دوسرا ادارہ نہیں ہوسکتا تھا۔ جن اندیشوں سے بچنے کے لیے کل ان کو مسجد میں آنے سے منع کیا گیا تھا انہیں اندیشوں سے بچنے کے لیے آج انھیں مسجد میں آنے کی اجازت دینی ہوگی اور اس کے نظام کو اس طرح ترتیب دینا ہوگا تاکہ ہماری خواتین پوری پاکیزگی نفس کے اور رازداری کے ساتھ مسجد کے پاکیزہ ماحول سے فیضاب ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملت کے علماء وفقہاء اور دیگر ارباب حال وعقد اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے مثبت فیصلہ لیں گے اور عورتوں کو مسجد میں نماز ادا کرنے کا معقول انتظام کریں گے۔

کم از کم جمعہ اور عیدین کی نماز میں ان کو ضرور شامل کرنے پر غور کریں گے۔ میں اس مسئلہ کو مسلمان علماء وفقہا اور دیگر ارباب حل وعقد کی صوابدید پر چھوڑتا ہوں۔ امید ہے وہ ضرور نئے حالات کی روشنی میں ملت کی ایسی رہنمائی کریں گے جو عورتوں کی عصمت اور دین کی حفاظت میں مددگار ہوگا۔ اس معاملہ میں امت کو اجتہادی فکر کی ضرورت ہے۔ لہٰذا پوری قوم تمام مسالک کے علمائے دین کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے کہ وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں؟

■❖■

(7) پردہ اور حجاب کا مسئلہ

پردہ چادر اور چہار دیواری میں عورتوں کو قید کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ عورتوں اور مردوں کے درمیان ایک فطری تقسیم کار کی علامت ہے۔ عورت اور مرد دونوں انسان ہیں، دونوں کو خلافت عطا ہوئی ہے، دونوں محترم اور قابلِ تکریم ہیں، دونوں کو بے پناہ طاقت و صلاحیت دی گئی ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ عورت کیا کرسکتی ہے اور مرد کیا کرسکتا ہے؟ ایسا کوئی کام نہیں جو مرد کرسکتا ہے عورت نہیں کرسکتی ہے۔ مگر عورت کی ساخت، جسمانی اور ذہنی صلاحیت اور مخصوص نسوانی خصوصیات کے اعتبار سے یہ سوال اہم ہے کہ عورت کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

فطری نظام کار اور فطری نظام تقسیم کی رو سے جس کے اندر جس چیز کی مخصوص صلاحیت ہے اگر وہ اپنی فطری خصوصیات کے مطابق اس کام کو انجام دے تو زیادہ بہتر طور پر وہ کام کرسکتا ہے۔ ایک مرد مزدور بھی ہوسکتا ہے اور منیجر بھی۔ اگر وہ پڑھا لکھا نہیں ہے، اس کو علم اور تجربہ حاصل نہیں ہے، اس کی جانکاری اور سمجھ داری ایسی نہیں ہے تو اسے منیجر نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ ایسا کرنا غیر منطقی اور غیر عقلی ہوگا، وہ آدمی ایک مزدور کی ذمہ داری جس ڈھنگ سے انجام دے سکتا ہے ایک منیجر کی نہیں۔ اسی طرح ایک شخص جس نے کسی بھی اسکول سے تعلیم حاصل کی ہے وہ منیجر کے رول اور ذمہ داری کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔

اس سے اگر آپ مزدور کا کام لیں گے تو اس پر ظلم کریں گے اور وہ اس کام کو کبھی اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا ہے گرچہ دونوں کو اگر جبراً ان کے کاموں پر مامور کردیا جائے تو دونوں اپنے اپنے دائرے میں اپنی حد تک اس کام کو انجام دیں گے مگر دونوں مس فٹ ہوں گے اور یہ دونوں پر ظلم ہوگا۔

بہت سے لوگ جب عورت او رمرد کے درمیان بحث چھیڑتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ عورت باہر کا کام کرنے کی اہل نہیں ہے۔ اس کا علم، اس کی جسمانی اور ذہنی صلاحیت اور دیگر خصوصیات اس کو ایک ناقص وجود بناتے ہیں اس لیے وہ عورت کے رول کو محدود کرکے دیکھتے ہیں۔ جبکہ آج عملاً یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فی زمانہ ایسا کوئی کام نہیں ہے جو مرد کرسکتا ہے عورت نہیں کرسکتی ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ اہلیت اور صلاحیت کا نہیں ہے بلکہ عورت کی اہلیت کے Optimum Use کا ہے۔ معاشیات کا ایک عام سوال ہے کہ دنیا کا ہر ملک اپنی ضرورت کی ہر چیز بناسکتا ہے، مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ علم معاشیات میں ایک Comprative Cost advantage theory ہے۔ ایک ملک A,B,C,D چاروں اشیا بناسکتا ہے، مگر وہ A,C بنانے میں زیادہ مہارت رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ A اور C خود بناتا ہے اور B اور D دوسرے ملکوں سے منگاتا ہے۔ کیونکہ A اور C بناکر وہ اتنا کمالیتا ہے جس سے کم میں وہ B اور D کہیں اور سے خریدتا ہے۔ اس طرح جس میں اس کو زیادہ مہارت حاصل ہے، جس کی پیداوار کرنا زیادہ نفع بخش، جس میں اس کو زیادہ Cost Advantage حاصل ہوتا ہے وہ اس کو بناتا ہے اور باقی چیزوں کو باہر سے منگاتا ہے۔ یہ کام ترقی یافتہ ملک بھی کرتے ہیں اور یہ کام ترقی پذیر ملک بھی کرتے ہیں۔ یہ اصول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ کام کرنا زیادہ بہتر ہے جس میں Comparative Advantage زیادہ ہے اور وہ کام کرنا بہتر نہیں ہے جس میں Comparative Advantage کم ہے۔

اب اس اصول کا اطلاق اس پر کریں کہ عورت کس کام کو زیادہ اچھی طرح کرسکتی ہے اور کس کام کو کرنے میں اس کا Comparative Advantage کم ہے۔ جب سے انسانی

سوسائٹی قائم ہے عورت اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے امورِ خانہ داری میں ماہر رہی ہے اور اس نے مملکت خانہ کی اچھی طرح نگرانی کی ہے جس کی وجہ سے قوموں کو عروج و تمکن حاصل ہوا ہے۔ کل تک لوگ سمجھتے تھے کہ یہ چھوٹا اور حقیر کام ہے۔ بلا اجرت کی جانے والی خدمت ہے۔ اس لیے جو لوگ اس کو مادی پیمانے سے تولتے تھے اس کو ایک حقیر ادنیٰ اور غیر معاشی عمل مانتے تھے۔

تمدن کے ارتقا کے ساتھ جب عورتوں کو گھر سے نکال کر بازار اور دفتر میں لادیا گیا تو گھر کا پورا نظام تہ و بالا ہوگیا۔ اس کی بھرپائی کے لیے جو متبادل نظم کیا گیا اس پر جو Economic Cost آیا تو لوگوں کو سمجھ میں آ گیا کہ گھر میں عورتوں کے ذریعہ کیا گیا کام غیر معاشی عمل نہیں ہے بلکہ ایک بڑا معاشی عمل ہے۔ لہٰذا عورتوں کی خدمات کو کم کر کے دیکھنا بے عقلی اور نادانی ہے۔ اس لیے گھریلو عورتوں کو اب سیدھے سیدھے Non-earning member نہیں مان کر ان کو Home Maker مانا جاتا ہے اور ان کی خدمات کو بھی اتنی ہی اہمیت دی جاتی ہے جتنی باہر کام کرنے والی خواتین کی۔

بہرحال یہ بحث طویل ہے، جس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ہمیں پردہ اور حجاب سے متعلق اسلام کے احکام اور آج کے دور میں اس کے انطباق پر غور کرنا ہے۔

سماج ایک زندہ ادارہ ہے۔ لہٰذا کسی زندہ اور متحرک ادارے کے لیے کوئی منجمد ضابطہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے وقت اور حالات کے تحت احکامات کے انطباق میں فرق آئے گا اور ضرورت کے لحاظ سے اس میں تبدیلی ضروری ہوگی۔

پردہ اور حجاب عورت کو قید میں رکھنے یا اس کی شخصی آزادی کو سلب کرنے کی کوشش نہیں ہے بلکہ اس کو گھر سے باہر جا کر اپنی ذمہ داری کیسے ادا کرنی ہے، اس کا ڈسپلن سکھانے کا عمل ہے۔ عورت کی سب سے قیمتی چیز اس کی عفت و عصمت، اس کی حیا اور پاکدامنی ہے۔ اگر یہ لٹ گئی تو مانو اس کی ساری کائنات لٹ گئی۔ لہٰذا اندر اور باہر اس کے

رول پر غور کرنے سے پہلے یہ دیکھنا اور جاننا بے حد ضروری ہے کہ اس کی عفت و پاکدامنی پر آنچ نہیں آنی چاہیے۔ اس کے رول و کردار کو متعین کرنے سے پہلے اس کی حیا اور پاکدامنی کی حفاظت کو یقینی بنانا ہوگا۔ کوئی ایسا طرزِ عمل جو اس کی پاکدامنی کو تار تار کرتا ہے اور مردوں کی ہوسنا کی میں اضافہ کرتا ہے، اسے عورت کی آزادی یا امپاورمنٹ نہیں بلکہ اس کی بے حرمتی اور کمزوری مانا جائے گا۔

عورت گھر کے اندر اپنے باپ بھائی، خاوند اور اس کے گھر والوں کے درمیان اپنی زیب و زینت کا اظہار کر سکتی ہے بلکہ پوری بے تکلفی کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ مگر جب گھر سے باہر نکلے تو قرآن نے اس کے کچھ آداب بتائے ہیں۔ قرآن کا حکم ہے کہ اپنے بدن کو ساتر لباس میں ملبوس رکھیں اور پورے بدن کو ڈھک کر نکلیں۔ (الاحزاب: 59) تاکہ دور سے ہی پہچان لی جائیں کہ ایک شریف اور عزت مآب عورت جا رہی ہے۔ اس کا یہ رویہ خود بخود دوسروں کو اس کا احترام کرنے پر مجبور کرے گا اور لوگ اس کے ساتھ زیادتی کرنے کی ہمت نہیں کریں گے۔ مردوں اور عورتوں سے اختلاط کم سے کم ہو اور صرف ضروری کاموں کی حد تک ہو، نظریں نیچی رکھیں، لب و لہجے میں ایسی لوچ اور مداہنت نہ اختیار کریں جس سے کسی کے دل میں غلط وسوسہ پیدا ہو، اور سڑکوں، بازاروں، اسکول، کالج، دفتروں اور دیگر جگہوں پر اپنے زیب و زینت کی نمائش سے بچیں۔ اسی میں عورت ذات کی اور پوری سوسائٹی کی بھلائی ہے۔

آج کے حالات، ماضی کے حالات سے بالکل مختلف ہیں۔ اس کے باوجود کہ اسلام نے عورتوں اور مردوں دونوں کے لیے تعلیم حاصل کرنا فرض قرار دیا ہے۔ مگر بعض تمدنی وجوہات سے مسلمان سماج میں عورتوں کی تعلیم کو ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا ان کی پوری ذہنی نشوونما نہیں ہو پاتی تھی، جس کی وجہ سے لوگوں نے عورتوں کو مرد سے کم تر اور ناقص العقل مان لیا تھا۔ لہٰذا انہیں تمدنی اور اجتماعی معاملات میں بالکل الگ تھلگ رکھا جاتا تھا۔ اس وقت مسلم سماج کی پسماندگی کی جو سب سے بڑی وجہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ سماج

صرف ایک ٹانگ پر چل رہا ہے۔ جبکہ دوسری ٹانگ پوری طرح سے سالم اور سلامت ہے مگر اس نے اپنی نادانی سے اس کا استعمال روک دیا تھا۔ اب جب عورتوں کے اندر تعلیم آتی ہے اور انھوں نے اپنی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں سے یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ مردوں سے کسی طور فروتر نہیں ہیں تو لوگوں کے اندر عورتوں کی تعلیم اور ان کو اجتماعی، تمدنی اور معاشی عمل میں حصہ دار بنانے کا عمل شروع ہوگیا ہے۔ لیکن کل جب مرد عورت کے دائرۂ عمل کو محدود کیے ہوئے تھا اس وقت بھی اس کی عقل پر پردہ پڑا ہوا تھا اور اب جبکہ عورت گھر کی چہار دیواری سے باہر آگئی ہے اس وقت بھی اس کی عقل پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

مردوں کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ وہ عورتوں کو گھر سے باہر تو نکال لایا ہے مگر اس کو اجتماعی، تمدنی، تعلیمی اور معاشی عمل میں کس طرح شریک اور حصہ دار بنائے۔

یوروپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد جو تمدنی بے داری آئی، پھر صنعتی انقلاب نے جو سیاسی اور معاشی امکانات پیدا کیے، بعد ازاں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کی وجہ سے یوروپ کے زعما اور فلاسفہ کو یہ بات سمجھ میں آگئی کہ صرف مردوں کے بل بوتے پر تمدنی اور ترقی کی گاڑی کو آگے نہیں بڑھایا جاسکتا ہے لہٰذا انھوں نے گھر سے باہر آکر عورتوں کو زندگی کے مختلف میدانوں میں اپنی خدمات دینے کے لیے ابھارا۔ یوروپ کی جدید تہذیب چونکہ چرچ سے بغاوت کے نتیجے میں وجود آئی تھی۔ لہٰذا اس نے تمام اقدار و روایات کو طاق پر رکھ ایک مشینی اور لذاتی تمدن کی بنیاد ڈالی جس میں معاشی اور مادی مفاد کو قدر اول مانا گیا اور ہر وہ کام جس سے پیسہ کمایا جاسکتا ہے اور زیادہ پیسہ کمایا جاسکتا ہے اس کو جائز، مفید، لیگل اور پسندیدہ قرار دیا گیا جس نے عورت کی عصمت وعفت، اس کی حیا اور پاکیزگی کو بھی بازار کی جنس بنادیا گیا۔ اس کو لوگ معیوب اور برا نہ مانیں اس لیے اس کو آزادیٔ نسواں اور ویمن امپاورمنٹ کا نام دیا گیا۔ اس طرح اس کے حسن کو، زیب و زینت کو، اس کے جسم کے تراش وخراش کو نمایاں، عریاں کرکے پیش کیا گیا اور اس کو فیشن اور جدیدیت کا خوبصورت نام دیا گیا۔

دنیا کے سامنے چونکہ کوئی دوسرا متبادل ماڈل نہیں تھا اس لیے مشرق ومغرب میں جو بھی قومیں جدید بننا چاہتی تھیں اور ترقی کرنا چاہتی تھیں انھوں نے اس ماڈل کو اختیار کیا۔ لہٰذا آج عریانی، فحاشی، اباحیت ایک عالمی تہذیب بن گئی ہے۔ کل کی دنیا بھی مردوں کی بنائی دنیا تھی اور آج کی دنیا بھی مردوں کی بنائی دنیا ہے مگر عورت کی یہ خام خیالی ہے کہ اس دنیا کے بنانے میں اس کا کچھ حصہ ہے۔ جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس وقت عورتوں کا جس طرح استعمال بلکہ استحصال آج کیا جارہا ہے۔ شاید ماضی میں ویسا استحصال کبھی نہیں کیا گیا ہوگا۔ آج دنیا بھر میں عورتوں کی برابری، ان کے امپاورمنٹ کی بات کی جاتی ہے اس کے باوجود ایک طرح کی صلاحیت اور قابلیت رکھنے کے باوجود اور ایک طرح کا کام کرنے کے باوجود مرد کی اجرت زیادہ ہے اور عورت کی اجرت کم ہے۔ پوری فلم انڈسٹری، فیشن انڈسٹری، اشتہاری انڈسٹری عورت کے دم قدم سے چلتی ہے جہاں اس کا کھلے عام جنسی استحصال کیا جاتا ہے اس کی عصمت وعزت کو بازار کا مال بناکر بیچا اور خریدا جاتا ہے، مگر وہاں بھی عورت کو کم اجرت ملتی ہے اور مرد کو زیادہ اجرت ملتی ہے۔

اس لیے یہ محض ایک دھوکہ اور ڈھکوسلا ہے کہ عورت اور مرد برابر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی عورتوں کے ساتھ وہی تعصب، تنگ نظری، بھید بھاؤ پایا جاتا ہے جو زمانہ قدیم میں رائج تھا۔ فرق یہ ہے کہ اس کی صورت تھوڑی بدل گئی ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے اور عورت کو برابری کا درجہ حاصل ہے۔ میں اس بات کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ بڑی بڑی کمپنیوں کے سی او کا آن ریکارڈ یہ بیان موجود ہے کہ عورت کے ذہن سے زیادہ اس کا جنس مرد کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ لہٰذا وہ اس کا استحصال کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتے۔

پہلے عورتوں کے ساتھ زنا اور زنا بالجبر کے واردات شاذ و نادر ہوتے تھے اور اس پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ مگر جیسے جیسے آج عورتوں کی آزادی اور امپاورمنٹ میں اضافہ ہوا ہے زنا اور زنا بالجبر ہماری جدید تہذیب وتمدن کی ایسی سچائی بن گیا ہے گویا یہ ایک

معمول بہ چیز ہے۔ چنانچہ جب کوئی لڑکی یا عورت گھر سے نکلتی ہے تو عزیز واقارب سے لے کر ہم سایہ، ساتھی اور اجنبی لوگ اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ایک گدھ مردار کو دیکھتا ہے اور پہلی فرصت میں اس کو چیر پھاڑ کر کھاجانا چاہتا ہے۔ یہ ہوسنا کی اب اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ چھوٹی چھوٹی معصوم بچیاں بھی اس سے محفوظ نہیں ہیں۔ تمام مقدس رشتے تار تار ہورہے ہیں۔ عورتوں کو صرف گھریلو تشدد ہی نہیں گھریلو جنسی استحصال کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔

لہٰذا اس ماحول میں وہ متبادل ماڈل کون سا ہوسکتا ہے جس میں عورتوں کو گھر سے باہر عزت اور آزادی کے ساتھ اپنے رول کو ادا کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے اور اس کی عزت نفس، حیا اور پاک دامنی پر کوئی آنچ نہ آئے۔ میری رائے میں اسلام نے اس معاملے میں واضح اور تفصیلی رہنمائی کی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس کو سائنٹفک ڈھنگ سے خود اپنی ملت کے سامنے پیش کریں اور پھر اس کے ذریعے سے ساری دنیا کے سامنے ایک متبادل کے طور پر لائیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر ہم نے عصری ضرورتوں کے لحاظ سے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک متبادل قابل کار ماڈل تیار کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تو یقیناً یہ ملت کے لیے بھی مفید ہوگا اور انسانیت عامہ کو بھی اس کے اختیار کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا۔

اس ماڈل کا کوئی تفصیلی خاکہ پیش کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے اجتماعی فکر وعمل کی ضرورت ہے نیز اس کام کو مردوں کے بجائے عورتوں کو کرنا چاہیے، ورنہ پھر یہ سوال اٹھے گا کہ وہ مردوں کی فکر ونظر کی غلام ہیں۔

میں اپنے علم وفہم اور جدید تقاضوں کی روشنی میں کچھ بڑے خطوط کی نشاندہی کرسکتا ہوں۔ یہ کوئی حتمی رائے نہیں ہے بلکہ غور وخوض کے لیے کچھ نکات یا اشارات ہیں۔ اس سے بہتر اور قابل عمل چیزیں بھی سوچی جاسکتی ہیں۔ لہٰذا اس پر کھلی بحث اور غور وفکر کی ضرورت ہے۔ تمدنی مسائل اور معاملات کو محض فتوؤں اور قانون سازی کے ذریعہ حل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے سماجی اور اصلاحی تحریک چلانے کی ضرورت ہوگی اور لوگوں کے ذہن ومزاج میں تبدیلی لاکر ہی اس کو قابلِ قبول بنایا جاسکتا ہے۔

میری نظر میں عورت کی حیا، اس کی غیرت نفس اور عصمت و عفت کی حفاظت ہر چیز پر مقدم ہے۔ زمانہ قدیم میں اس کے تحفظ کے لیے عورتوں کو گھر سے نکلنا منع کر دیا گیا تھا، اور اگر نکلنا ضروری تھا تو خود کو سر سے پیر تک چادر میں لپیٹ کر اور کسی مرد کی نگرانی میں نکلنا ہوتا تھا۔ اس چیز نے جہاں ایک طرف عورتوں کی عزت نفس کی حفاظت میں مدد کی مگر دوسری طرف ان کے رول و کردار کو اتنا محدود کر دیا کہ وہ انسانی ارتقا کے عمل میں محض ایک ضمیمہ بن کر رہ گئیں۔ دوسرے یہ کہ یہ ایک Elitist Culture تھا جو کچھ محدود اور مخصوص لوگوں کے درمیان ہی رائج تھا جو خود کو شرفا کہتے تھے۔ عام عوام کے لیے اس کلچر کو اختیار کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ ان کے پاس وہ وسائل میسر نہیں تھے جس کے تحت وہ یہ تعیش (Luxury) کر سکتے تھے۔ لہٰذا ہر دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ بڑے دینی گھرانوں اور مخصوص طبقوں مثلاً زمیندار، جاگیردار اور نام نہاد رؤسا اور شرفاء کے یہاں ہی یہ رائج تھا جبکہ عام لوگوں کو تن ڈھانکنے کے لیے ڈھنگ کے کپڑے بھی میسر نہیں تھے۔

اس تہذیبی پس منظر کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ فرصت اور فراغت کے باوجود عورتوں کی تعلیم کی اہمیت محسوس نہیں کی گئی اور انہیں محض خواندہ بنا کر چھوڑ دیا گیا۔ لہٰذا ملت کی علمی اور ذہنی ترقی میں عورتوں کا حصہ بہت محدود ہے۔

اس کلچر کی تیسری خرابی یہ تھی کہ کام کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مرد بھی جب کام نہیں کرتے تھے تو عورتوں کے کام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کے نتیجے میں ایک Parasite Economy پروان چڑھی جو دوسروں کی محنت پر جیتا تھا اور اس میں ظلم و استحصال لازمی عنصر تھا، جس کی شکار عورتیں بھی ہوتی تھیں۔

لہٰذا ایسی کسی تہذیب کو گلوری فائی کرنا ذہنی دیوالیہ پن ہے۔ آج زمانہ اور حالات بدل چکے ہیں۔ زمینداری اور جاگیرداری ختم ہو چکی ہے۔ مسلم اقتدار کا سورج ڈوب گیا ہے۔ مسلمان ایک سخت نفسیاتی تشنج کے دور سے گزر رہے ہیں۔ اس دور میں ہمیں ایک نئی حکمت عملی چارٹر کرنی ہے جس میں عورتوں کو بھی شامل کرنا ضروری ہوگا۔ لہٰذا یہ سوچنا اور دیکھنا

ضروری ہے کہ اپنی بہن بیٹیوں کی عصمت وعفت کی حفاظت کرتے ہوئے کیسے ان کے رول کو متعین کیا جائے تا کہ ایک محفوظ ماحول میں وہ اپنا فطری کردار پوری آزادی اور اعتماد کے ساتھ ادا کرسکیں۔

اس کے لیے سب سے پہلی ضرورت عورتوں میں تعلیم کو عام کرنا ہوگا اور عصری، فنّی، تکنیکی اور پروفیشنل تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی، تمدنی، جذباتی تربیت بھی کرنی ہوگی نیز ان کو اپنے ایمانی اور تہذیبی اساس سے واقف کرانا ہوگا تا کہ وہ مضبوط ذہن و کردار کے ساتھ عام سوسائٹی سے اختلاط کریں اور ان کے اندر خوف ، احساسِ کمتری، دبوپنا، بزدلی، بے چارگی کی کیفیت پیدا نہ ہو بلکہ وہ پورے اعتماد اور شعوری احساس کے ساتھ اپنی پہچان کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی صلاحیتوں اور مسابقتی اہمیت کا لوہا منوانے میں کامیاب ہوں۔ اس سے ان کے اندر جو خود اعتمادی پیدا ہوگی وہ ایک ایسی نسل کی آبیاری کرے گی جو پہاڑ کاٹ کر نیا راستہ بنانے کا حوصلہ رکھے گا اور شاید یہیں سے ملت میں ایک نئی بے داری اور نئے عروج کی راہ نکلے گی۔

ہم جو بھی متبادل ماڈل تجویز کررہے ہیں ان میں تین باتیں لازمی ہونی چاہئیں۔ پہلی عورت کی ذہنی، فکری اور عملی صلاحیتوں پر کوئی قدغن نہیں لگنی چاہیے۔ دوسری ان کی موبلیٹی متاثر نہیں ہونی چاہیے، تیسری ان کی عزت و آزادی، حقوق و اختیار پر آنچ نہیں آنی چاہیے۔ جب تک ان تینوں باتوں کی ضمانت نہیں دی جاتی اس وقت تک جدید معاشرے میں عورت کے کردار کو متعین نہیں کیا جاسکتا۔

ہم جدید تہذیب میں عورتوں کو جس طرح بازار کی جنس بنادیا گیا ہے اور جس طرح کھلے عام ان کی عصمت وعفت کا سودا ہوتا ہے، کیا پڑھی لکھی، کیا اَن پڑھ، کیا شہری کیا دیہاتی یہاں تک کہ جو عورتیں اسکول کالج، دفتر، سیاست اور دیگر میدانوں میں ہیں ان کے ساتھ جو سلوک ہورہا ہے اور جس طرح ان کا استحصال کیا جارہا ہے وہ کسی طرح قابل قبول نہیں ہے اور مسلمان عورت کے لیے یہ ماحول اور یہ ماڈل کسی طرح قابلِ تقلید

نہیں ہوسکتا۔

اس وقت اللہ کے فضل سے مسلمانوں میں جدید تعلیم یافتہ خواتین کی ایک بڑی تعداد ہے جو مختلف شعبوں میں کام کررہی ہیں۔ دینی حلقوں اور جماعتوں میں بھی عورتوں کے حقوق کے سلسلے میں نئی بیداری آئی ہے اور اس جانب بڑے پیمانے پر علمی اور عملی کوششیں ہورہی ہیں۔ بہت سی تعلیم یافتہ مسلمان خواتین یوروپ اور امریکہ جیسے ملکوں میں اپنی تہذیبی شناخت کے ساتھ اپنا کردار ادا کررہی ہیں جس سے اس معاشرے میں ایک عجیب سی بے چینی دیکھنے کو ملتی ہے اور ایک تہذیبی کشمکش کا ماحول بن گیا ہے۔ اس وقت دہشت گردی کے نام پر جو جنگ جاری ہے اس کے نتیجے میں یوروپ نے جس تہذیبی دہشت گردی اور عدم رواداری کی فضا بنائی ہے اس نے اس تہذیب کے دیوالیہ پن کو پوری طرح اجاگر کردیا ہے۔ لہٰذا انھوں نے عورتوں کو خاص طور پر اپنا ہدف بنایا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان عورت اپنے اقدار کے خلاف کھڑی ہوجائیں، ہمارے لیے اس وقت سب سے بڑا چیلنج ہے کہ ہم کس طرح اپنے تہذیبی اقدار، عصمت وعفت، حیا اور پاکدامنی کو محفوظ اور مستحکم رکھتے ہوئے اپنا تعمیری اور ترقیاتی کردارادا کریں تاکہ وہ لوگ جو مسلمان عورت کی پسماندگی اور مسلمان معاشرے میں عورتوں کے حقوق کا رونا روتے ہیں، ان کی زبان بند ہو اور ان کو معلوم ہوسکے کہ جدید مسلمان عورت کس طرح جدید جاہلی تہذیب کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا تعمیری اور ترقیاتی کردار ان سے بڑھ چڑھ کر اور بہتر ڈھنگ سے ادا کررہی ہے۔

یہ اس وقت کا سب سے بڑا تہذیبی مسئلہ ہے جس پر پوری ملت کو، اس کے مردو خواتین کو، علماء اور دانشوروں کو سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا اور اپنی حکمت و دانائی سے ایسا ماڈل وضع کرنا ہوگا جو اپنے تہذیبی اقدار کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں کی تکمیل کرسکے اگر ہمارے مردوں اور عورتوں کی عقل پر پردہ نہیں پڑا ہوا ہے تو انہیں ایک قابل عمل متبادل ماڈل کے ساتھ دنیا کے سامنے آنا ہوگا۔

■❖■

(8) آٹھواں مسئلہ گھریلو تشدد

گھریلو تشدد ایک بڑا مسئلہ ہے جس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلہ کی سنگینی کو محسوس کیا جائے اور اس کے تدارک کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔ یہ معاملہ خاندانی امن و سلامتی کے ساتھ ساتھ بنیادی انسانی اخلاقیات اور بنیادی انسانی حقوق سے جڑا ہوا ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ گھریلو تشدد کا مفہوم کیا ہے۔ اقوامِ متحدہ نے 1993 میں عورتوں کے خلاف انسداد تشدد اعلامیہ میں گھریلو تشدد کی تعریف اس طرح کی ہے:

> "Physical, sexual and psychological violence occurring in the family, including battering, sexual abuse of female children in the household, dowry related violence, marital rape, female genital mutilation and other traditional practices harmful to women, non- spousal violence and violence related to expliotation."

''گھر میں ہونے والی جسمانی جنسی اور نفسیاتی تشدد، جس میں مار پیٹ، گھر

کی چھوٹی بچیوں کا جنسی استحصال، جہیز سے متعلق تشدد، شادی شدہ لوگوں کا جبراً جنسی رشتہ عورتوں کے اعضائے تناسل کو نقصان پہنچانا، اور دیگر رسم و رواج جو عورتوں کے لیے نقصاندہ ہو، جو میاں بیوی نہیں ہیں ان کے ساتھ تشدد اور استحصال کی غرض سے تشدد۔''

گھریلو تشدد کے دائرے میں بچوں کے ساتھ تشدد، بڑوں کے ساتھ تشدد اور خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ تشدد شامل ہے۔

اگر اس تعریف کو دیکھا جائے تو گھریلو تشدد کی مندرجہ ذیل مختلف شکلیں ابھر کر سامنے آتی ہیں:

(1) گھر میں عورت خاص طور پر بیوی کے ساتھ بدسلوکی اور تشدد گھریلو تشدد کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ جس میں اس کو جسمانی طور پر ایذا پہنچانا یعنی مار پیٹ کرنا، گالی گلوج کرنا اس کو جنسی اور نفسیاتی طور پر تکلیف دینا وغیرہ شامل ہے۔ اس کو کھانا خرچہ نہیں دینا یا اس کو چھوڑ رکھنا یہ ساری چیزیں گھریلو تشدد کے دائرے میں آتی ہیں۔

(2) آج کے پُرفتن اور اخلاقی دیوالیہ پن کے دور میں رشتوں کا احترام اور اس کا تقدس ختم ہوتا جارہا ہے اور چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں اپنے خاندان کے قریبی اور بڑے لوگوں کی ہوس کا شکار ہورہے ہیں چنانچہ قریبی رشتہ داروں کے ذریعہ چھوٹی اور نابالغ بچیوں کا جنسی استحصال ایک عام بات ہوگئی ہے۔ چونکہ یہ واقعات منظر عام پر نہیں آتے اس لیے لوگ اس کی سنگینی کو محسوس نہیں کرتے ہیں جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ بیماری بہت تیزی سے پھیل رہی ہے۔

(3) گھریلو تشدد کی تیسری وجہ جہیز ہے۔ لڑکی اگر کم جہیز لے کر آتی ہے یا لڑکے والوں کا مسلسل مطالبہ پورا نہیں ہورہا تو نئی شادی شدہ لڑکی پر نہ صرف اس کے شوہر کی طرف سے بلکہ اس کے تمام سسرال والوں کی طرف سے طرح طرح

کے تشدد اور ظلم ڈھائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اسے جلا کر مار ڈالا جاتا ہے۔ یہ گھریلو تشدد کی سب سے بدترین مثال ہے۔

(4) شادی کے بعد جبراً جنسی رشتہ، جس کو Marital Rape کہا جاتا ہے، اس کو بھی گھریلو تشدد مانا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ مغربی ملکوں میں بہت تیزی سے ابھرا ہے اور بعض ملکوں نے اس کو قابلِ تعزیر جرم مانا ہے جبکہ ہندوستان اور دنیا کے مسلمان ملکوں میں اس کو جرم تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ مغرب میں لوگ اس کو انسانی حقوق اور عورتوں کے حقوق سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت چاہے شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ وہ اپنے جسم کی خود مالک ہے۔ لہٰذا کوئی اس کی مرضی اور خواہش کے بغیر اس کے جسم کو چاہے وہ شوہر ہی کیوں نہ ہو چھو نہیں سکتا ہے۔ ہاں عورت اجازت دے تو پھر دونوں لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

مشرقی اخلاقیات میں عورت اگر بیمار ہے یا کوئی اور جسمانی اور نفسیاتی وجوہ سے تمتع کے لیے تیار نہیں تو مرد کو صبر سے کام لینا چاہیے۔ مگر مرد اپنی خواہش پر کنٹرول نہ کر سکے اور جبراً جنسی تعلق بنائے تو اسے صحیح نہیں مانا جائے گا مگر اسے قابلِ تعزیر جرم نہیں قرار دیا جاتا ہے۔ خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والے بہت سے ادارے اور افراد اس کو قابلِ تعزیر جرم کی فہرست میں لانے پر اصرار کر رہے ہیں۔ دراصل یہ مسئلہ پیدا کیوں ہوا ہے؟ مغرب میں عورت اور مرد دونوں کام کرتے ہیں۔ وہاں اکسٹرا میریٹل اور نان مریٹل ریلیشن کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ بہت سے مرد و عورت لِو اِن ریلیشن شپ میں رہتے ہیں۔ لہٰذا دونوں آزاد بھی ہیں اور ساتھ بھی ہیں۔ ان کے درمیان آپسی وفاداری لازم نہیں ہے۔ ایسی صورت میں شادی بیاہ دو انسانوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہے جو محض قانونی حیثیت رکھتا ہے اس کا کوئی اخلاقی، روحانی اور سماجی پہلو نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی مرد اپنی شادی شدہ بیوی سے زبردستی جنسی تعلق استوار

نہیں کرسکتا ہے، مگر ایک غیر عورت اگر راضی ہو تو اس سے جنسی تعلق استوار کرنے میں نہ تو اخلاقی طور پر کوئی گناہ ہے اور نہ سماجی طور پر کوئی برائی ہے اور نہ قانونی طور پر کوئی جرم۔ ایسی صورت میں عورت کی مرضی اور خواہش کے بغیر جنسی تعلق اس کے حق خودداری کی نفی مانی جاتی ہے۔ اس لیے اس کو گھریلو تشدد کے باب میں رکھا گیا ہے۔ بہرحال مشرق میں یہ بحث چل رہی ہے اور یہاں شادی شدہ جوڑے کے درمیان جبراً جنسی تعلق جبراً زنا کے ضمن میں نہیں آتا اس لیے اس کو تشدد قرار دینا رشتہ کی قانونی نوعیت کے خلاف ہے۔

(5) بعض ملکوں میں عورتوں کے اعضائے مخصوص سے روایتی طور پر ایسی چھیڑ چھاڑ کی جاتی ہے جو اس کے لیے نقصاندہ ہے لہٰذا یہ بھی گھریلو تشدد کی ایک قسم ہے۔

(6) گھر میں چھوٹے بچوں کے ساتھ مار پیٹ، ان کی ٹھیک سے دیکھ بھال میں کوتاہی جس کی وجہ سے ان کی جسمانی، اخلاقی اور نفسیاتی صحت متاثر ہوتی ہے، گھریلو تشدد کی بڑی علامت ہے۔ جن گھروں میں بیوہ اور یتیم بچے ہیں اور گھر کے لوگ ان کا ٹھیک سے خیال نہیں رکھتے، یا ان کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں، یہ سب گھریلو تشدد کے دائرے میں آتا ہے۔

(7) گھر میں چونکہ سینئر سٹی زن بوڑھے اور بزرگ میں ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی، اگر ان کا ٹھیک سے خیال نہیں رکھا جاتا یا ان کے ساتھ بدسلوکی ہوتی ہے تو یہ سب گھریلو تشدد شمار کیا جاتا ہے۔

مگر گھریلو تشدد کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ گھر کی عورتوں بالخصوص بیوی کے ساتھ مار پیٹ، بدسلوکی اور اس کو جسمانی یا نفسیاتی ایذا رسانی یہ گھریلو تشدد کی سب سے بڑی علامت ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں جہاں غربت اور جہالت عام ہے اور بالعموم مرد منشیات کے شکار ہوتے ہیں گھر میں بیوی بچوں کو پیٹنا اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرنا عام بات ہے۔

گاؤں دیہات میں یہ منظر اکثر دیکھنے کو ملتا ہے۔

شہری اور دیہی علاقوں میں جو لوگ خوشحال اور تعلیم یافتہ ہیں ان گھروں میں عورتوں کے ساتھ مار پیٹ کے واقعات کم ہوتے ہیں۔ مگر مشترکہ خاندانوں میں جو افراد کمزور ہیں ان کے بیوی بچوں کا بڑے پیمانے پر استحصال ہوتا ہے اور وہ گھٹ گھٹ کر جیتے ہیں۔ ان خاندانوں میں جہیز اور دوسری قبیح رسموں کی وجہ سے عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہے۔

شہروں میں بڑھتی ہوئی خواہشات اور امنگوں کی عدم تکمیل کی وجہ سے مڈل کلاس خاندانوں میں اکثر تناؤ کی فضا دیکھی جاتی ہے جس سے شوہر بیوی کے تعلقات کشیدہ دیکھے جاتے ہیں جو بعض اوقات جسمانی اور نفسیاتی تشدد کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

اس وقت اخلاق باختگی کا جو عالم ہے اس کے نتیجے میں اکثر شوہر کو اپنی بیوی پر اور بیوی کو اپنے شوہر پر شک ہوتا ہے اور کبھی کبھی یہ شک تلخی اور ترشی میں بدل جاتا ہے جہاں سے سب وشتم کا دور شروع ہو جاتا ہے اگر یہ شک صحیح نکلا تو رشتہ ٹوٹنے کے کگار پر پہنچ جاتا ہے۔

اس طرح گھریلو تشدد کی بہت سے علامتیں اور وجوہات ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مغربی معاشرہ ہو یا مشرقی معاشرہ، غیر مسلم سوسائٹی ہو یا مسلم سوسائٹی ہو گھریلو تشدد سب جگہ عام ہے۔ لہٰذا اس پر روک تھام ضروری ہے۔

جہاں تک اسلامی شریعت کا تعلق ہے اس نے گھر کی پاکیزگی اور میاں بیوی کے درمیان بہتر تعلقات کو گھر کے جملہ مسائل کے حل کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ بلکہ گھریلو جھگڑے کو اس نے شیطان کی ایسی چال قرار دیا ہے جو نسل وتہذیب دونوں کو برباد کر کے رکھ دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے گھریلو فرائض کی ادائیگی میں عورت سے زیادہ مرد کو ذمہ دار بنایا ہے اور اپنے گھر والوں بالخصوص اپنے بیوی بچوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی ہے۔

اسلامی تعلیمات کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

اقوامِ متحدہ نے جو گھریلو تشدد کی تعریف بیان کی ہے اس میں جسمانی، جنسی اور نفسیاتی ایذا رسانی کے ساتھ ساتھ مار پیٹ اور جہیز سے متعلق تشدد اور دیگر روایتی طریقوں سے گھر کی عورتوں کو نقصان پہنچانا وغیرہ چند اہم پہلو ہیں۔

اسلام کی رو سے عورت ایک آزاد وجود ہے اور مرد ایک آزاد وجود ہے۔ شادی دو آزاد وجود کے درمیان باہمی رضا مندی سے کیا گیا ایک ایسا مقدس معاہدہ ہے جس کا احترام دونوں پر واجب ہے۔ دونوں کے متعین حقوق اور فرائض ہیں جن کا خوش دلی اور خوش اخلاقی سے نباہ پر ہی اس رشتہ میں حسن و استقرار پیدا ہوتا ہے۔ اس رشتہ کی خوبصورتی سے ہی ایک خوشگوار گھر اور ایک خوشگوار معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا تشدد اور حقوق تلفی سے نہ صرف رشتہ کا حسن بگڑتا ہے بلکہ یہ شر و فساد کے ایسے دروازے کو کھولتا ہے جس سے خاندان کی عزت، چین، بچوں کا مستقبل سب داؤ پر لگ جاتا ہے۔ چنانچہ اسلام نے مردوں اور عورتوں دونوں کو گھریلو امن و سلامتی بنائے رکھنے کی تلقین کی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے کے حقوق کا نگراں بنایا ہے۔ بلکہ انصاف سے دیکھا جائے تو اسلام نے عورت کے مقابلے مرد پر زیادہ ذمہ داری ڈالی ہے اور چونکہ وہ قوام بنایا گیا ہے اس لیے اس پر لازم ہے کہ گھر میں امن و محبت کی فضا بنائے رکھے اور گھر کے افراد کے ساتھ عفو و درگذر اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرے۔ قرآن نے مردوں کو حکم دیا ہے: **وعاشروهن بالمعروف.** (النساء: 19) یعنی ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی گزارو۔

عورتوں کی کفالت، ان کے ساتھ حسن سلوک، ان کے ساتھ نرمی سے پیش آنا، ان کی دلجوئی کرنا، ان کی ناپسندیدہ باتوں کو درگزر کرنا، ان کی خامیوں کے بجائے ان کی خوبیوں پر دھیان دینا اوران کے مزاج و ذہن کی رعایت کرتے ہوئے ان کے ساتھ نباہ کرنا چند ایسی ہدایتیں ہیں جو ازدواجی زندگی کے رہنما اصول کے طور پر بالخصوص مردوں کو دیے گئے ہیں تاکہ ان کی جانب سے کوئی زیادتی نہ ہو۔

حضورؐ کا ایک قیمتی ارشاد ہے:''کامل ایمان والے مومن وہ ہیں جو اپنے اخلاق میں سب سے اچھے ہیں اور تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں، جو اپنی بیویوں کے حق میں سب سے اچھے ہیں۔''

بعض استثنائی معاملات ہوسکتے ہیں جس میں ایک شوہر اپنی بیوی سے ناراض ہو مثلاً وہ اس کی کھلی نافرمانی کرتی ہو، بلا عذر جنسی تعلق استوار کرنے سے روکتی ہو، فرائض دینی سے غافل ہو، جبکہ اس کا شوہر اس کو پسند نہیں کرتا ہو، وہ کسی ایسے شخص سے تعلق رکھتی ہو یا اس کو اپنے گھر میں بلاتی ہو جس کا آنا اس کے شوہر کو ناگوار ہو، ان صورتوں میں مرد کو کچھ ہدایات دی گئی ہیں۔ مثلاً پہلے اس کو سمجھائے، اگر اس کے بعد بھی وہ بات نہ مانے تو اس سے اپنا بستر الگ کرلے جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس سے ناراض ہے، بعض انتہائی ناخوشگوار مواقع پر وہ اس کی ایسی سرزنش کرسکتا ہے جس سے اس کی سختی جھلکتی ہے مثلاً زور سے اس کا ہاتھ پکڑ لینا، یا ہلکے طریقے سے اس کی تادیب کرنا مگر یہ خیال رہنا چاہیے کہ اس کے جسم و اعضاء، چہرے اور نازک مقامات پر کوئی ضرب نہ آئے۔ اس کے بعد بھی بات نہ بنتی ہو تو اس کے بعد علیحدگی ہی ایک راستہ رہتا ہے۔

ازدواجی رشتہ کی حفاظت جتنا مرد پر فرض ہے اتنا عورت پر بھی فرض ہے۔ لہٰذا عورتوں کو اپنے شوہروں کا مزاج شناس ہونا چاہیے، ان کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس کی جذباتی اور جنسی آسودگی کا سامان بہم پہنچانا چاہیے۔ تمام طرح کے رشتوں اور معاملات میں نباہ کی جو حد بندی ہے وہ یہ ہے کہ خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی فرمانبرداری نہیں ہے۔ لہٰذا شوہر کسی ایسی بات کا حکم دے جو خدا اور اس کے رسولؐ کے حکم سے ٹکراتی تو عورت اس صورت میں شوہر کے حکم کو ماننے کی پابند نہیں ہے۔

بصورتِ دیگر اسے اپنی طرف سے بھی بھرپور کوشش کرنی چاہیے کہ رشتہ کا حسن برقرار رہے اور دونوں ایک خوشگوار ازدواجی زندگی کا لطف لے سکیں۔ اس باب میں مغرب کا جو طرزِ عمل ہے وہ افراط و تفریط کی نشاندہی کرتا ہے۔ اسلام نے راہ اعتدال دکھائی ہے

لہٰذا اگر شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھیں، عزت ومحبت اور باہمی معاملات کو آپس کے مشورے سے خوش اسلوبی کے ساتھ نبھانے کے لیے تیار ہوجائیں تو گھریلو تشدد جیسے واقعات پر مؤثر روک لگ سکتی ہے اور اس طرح کے معاملات شاذ و نادر ہی ہوسکتے ہیں جو دونوں یا دونوں میں سے کسی ایک کی خباثت نفس کا نتیجہ ہوسکتے ہیں۔ ایسے استثنائی معاملات کسی بھی معاشرے میں ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا اس کی بنیاد پر کوئی عمومی پالیسی نہیں بنائی جاسکتی ہے۔

آج کے جدید دور میں جبکہ بعض معاشرتی اور معاشی وجوہات سے عورت اور مرد دونوں کام کے لیے گھر سے باہر جاتے ہیں، وہ صورت اب باقی نہیں رہی کہ مرد کام کرتے ہیں اور عورت صرف گھر دیکھتی ہے۔ لہٰذا اس بدلتی ہوئی صورتحال میں رشتوں کی پاکیزگی کو برقرار رکھتے ہوئے کیسے ایک دوسرے کے حقوق ادا ہوسکتے ہیں جس سے گھر کا امن، اس کی خوشگواری اور رشتوں میں گرماہٹ باقی رہے۔ یہ مرد وعورت دونوں کو سوچنا ہوگا اور ایسا طرزِ عمل ڈیولپ کرنا ہوگا جس میں دونوں ایک دوسرے کی عزت کریں اور ایک دوسرے سے سکون پائیں نیز گھر کے بچوں کی صحت، اخلاق اور ان کی نشوونما پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔

گھریلو تشدد کا مسئلہ صرف مرد وعورت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا ڈانڈا خاندانی اور معاشرتی روایات سے بھی ملتا ہے۔ مثلاً جہیز کی وجہ سے جو تشدد ہوتا ہے اس کو اس رسم قبیح کو دور کرکے ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے قانون موجود ہے مگر سماجی برائیاں محض قانون سے دور نہیں ہوتی ہیں اس کے لیے سماجی اصلاح کی مہم چلانے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح گھر میں بچے، بزرگوں، یتیم، بیوہ اور دوسرے کمزور اور بے سہارا لوگوں کے ساتھ جو جنسی اور نفسیاتی تشدد کی واردات سامنے آرہی ہیں، اس کے روک تھام کے لیے مؤثر قانون کے علاوہ، سماجی بیداری، اخلاقی بہتری اور خبر گیری کے متبادل نظام کی تشکیل ضروری ہے، تبھی ان واقعات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

کسی مسئلہ کو قالین کے اندر دبادینے سے مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ اس مسئلہ کی نوعیت کو

سمجھنا اور اور تدارک کرنا ہی اس مسئلہ کے حل میں معاون ہوسکتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے گھروں اور ہمارے معاشرے میں گھریلو تشدد جیسی کوئی چیز نہیں پائی جاتی ہے۔ یہ ہے اور بڑے پیمانے پر ہے اس کے وجوہات کا معروضی طور پر جائزہ لے کر اس کے تدارک کے لیے مؤثر اقدام کرنا ہی اس مسئلہ کا حل ہے۔

دنیا کے ہر سماج کی طرح مسلمان سماج میں بھی یہ برائی پائی جاتی ہے جس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ دنیا بھر میں مسلمان عورت آج زیادہ مظلوم اور مقہور ہے۔ ہمارے معاشرتی نظام میں وہ اگر کسی تشدد، ناانصافی اور ظلم کا شکار ہوتی ہے تو ہمارے پاس اس کو روکنے، اس سے بچانے اور اس کی آبادکاری کا کوئی متبادل نظام نہیں ہے۔ جہالت اور غربت نے معاشرے کی ایسی تصویر بگاڑ دی ہے جس میں کسی کے حقوق محفوظ نہیں ہیں۔ اس ماحول اور معاشرے میں عورت جو پہلے سے کمزور ہے اس پر کھلے اور چھپے مختلف طرح کے ظلم ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم اپنے معاشرے کو اس ظلم و استحصال سے بچانا چاہتے ہیں تو حقیقت واقعہ کی صحیح جانکاری حاصل کرکے اس کو اسلام اور عرفِ عام کی روشنی میں اس طرح حل کرنا ہوگا جو اسلامی اور عصری تقاضوں کے عین مطابق ہو تاکہ ہم اپنے گھر اور سماج کو شیطان کے فتنوں اور اسلام دشمن قوتوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھ سکیں۔

■❖■

(9) عورتوں کی تعلیم اور نوکری کا مسئلہ

جہالت دنیا کی سب سے بڑی معذوری ہے جو سالم ذہن وجسم رکھنے کے باوجود فرد وقوم کو مفلوج و معذور کر دیتی ہے جو انسانی شرف و ارتقاء میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ عورت مرد کے ساتھ خلافت میں برابر کی شریک ہے۔ اللہ نے اس کائنات کو علم کی بنیاد پر قائم کیا ہے اور علم کی وجہ سے ہی تمام دیگر مخلوقات کے مقابلے انسان کو شرف و بزرگی سے نوازا ہے۔ قرآن کا پہلا حکم پڑھنے کا ہے اور یہ حکم تمام انسانوں کو دیا گیا ہے جس میں مرد کے ساتھ عورت بھی شامل ہے۔ حضورؐ نے تمام مسلمانوں پر علم کا حصول فرض قرار دیا ہے۔ تمام مسلمانوں میں مرد و خواتین سب سے آتے ہیں نہ معلوم کیوں اور کیسے بعد کے ادوار میں مسلمان مردوں کے علم کی ضرورت اور اہمیت تو سمجھی گئی مگر عورتوں کی تعلیم سے ملت غافل ہوگئی۔ دوسرے، لوگوں نے تعلیم کو بہت محدود معنوں میں لیا اور تعلیم سے مراد محض دینی تعلیم سمجھا یعنی دین کے بنیادی عقائد و واجبات، حرام و حلال اور چند اخلاقی تعلیمات وغیرہ، جبکہ دین پوری زندگی پر محیط ہے۔ لہٰذا اس کے دائرے میں فرد وقوم کے تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات آتے ہیں۔ تعلیم کے اس محدود تصور کی وجہ سے ملت میں یک رخا پن آیا اور دھیرے دھیرے دینی تعلیم مسلکی تعلیم کا ضمیمہ بن گئی جس نے ملت میں کبھی نہ ختم ہونے والا انتشار کا دروازہ کھول دیا۔

اس تعلیمی نظام کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اس نے بالعموم عورتوں کو اور مسلمانوں کی غالب اکثریت کو جو خواص کے بجائے عام عوام کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے ان کو اس تعلیمی نظام سے بڑی حد تک دور رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان عوام کی غالب اکثریت دین کی بنیادی باتوں سے بھی ناواقف رہی اور ان کے اندر دین کے نام پر ایسی ایسی خرافات نے راہ پائی جس کو خواص نے بنظر تحقیر دیکھا، مگر اس کی اصلاح کی کبھی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔

آج مسلمانوں کی غالب اکثریت جہالت و پسماندگی میں زندگی گزار رہی ہے، شاید یہی اس کی تاریخی وجہ ہے۔ یہ صورتحال صرف ہندوستان میں نہیں ہے بلکہ جن ملکوں میں مسلمانوں کی حکومت ہے اور جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، دینداروں اور علماء کا گہرا اثر پایا جاتا ہے، وہاں 90-80 فیصد جہالت ہے۔ نوآبادیاتی غلبہ کے دوران جونئی بیداری آئی اور خصوصاً شہروں میں جدید تعلیم کا چلن شروع ہوا تو لوگوں نے تعلیم کی اہمیت کو محسوس کیا۔ چنانچہ شہری علاقوں میں جدید تعلیم کا رجحان پیدا ہوا۔ مگر یہاں بھی سماجی سختی اور بعض ذہنی تحفظات کی وجہ سے لڑکیوں کی تعلیم پر طرح طرح کے قدغن لگائے گئے بلکہ اس رجحان کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ کچھ لڑکیوں اور خواتین نے جب مروجہ نظام سے بغاوت کرتے ہوئے جدید تعلیم حاصل کی تو انھوں نے اپنے اخلاق کردار سے جس ری ایکشنری رویہ کا ثبوت دیا اور تمام مسلمہ اخلاقی ضابطوں کو توڑ کر جس بے ہودگی کا مظاہرہ کیا اس نے رجعت پسند حلقوں کے استدلال کو تقویت پہنچائی اور اس طرح لڑکیوں کی تعلیم نہ صرف مابہ النزاع بن گئی بلکہ اس کی رفتار سست رہی۔ چنانچہ اس اکیسویں صدی میں بھی دنیا بھر کے مسلمان ملکوں اور خود ہندوستان میں جہاں سب سے زیادہ مسلم آبادی ہے، لڑکیوں میں آج بھی تعلیم کم ہے۔

بہرحال تعلیم کی اہمیت بڑی حد تک لوگوں پر واضح ہوگئی ہے اور اس باب میں عوام وخواص ہر دو طبقہ میں خاصی بیداری آئی ہے۔ مگر ابھی بھی ملت کنفیوژ ہے اور افراط و تفریط کی شکار ہے۔ ملت کے پاس ابھی تک تعلیم کا مکمل تصور (Holitistic

(Approach) ابھر کر سامنے نہیں آیا۔ حکومت اور اکثریت کی ریشہ دوانیاں اپنی جگہ ہیں جس نے حالات کو اور بھی پیچیدہ بنادیا ہے۔

لوگ جب دین کی تعلیم دیتے ہیں تو دنیوی تعلیم چھوٹتی ہے اور جب دنیوی تعلیم دیتے ہیں تو دین کی تعلیم چھوٹتی ہے۔ تعلیم کے ساتھ کچھ تہذیبی مسائل بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں جس نے پوری ملت کو پریشان کر رکھا ہے۔

بہرحال حالات کیسے بھی ہوں اور مسائل چاہے جتنے سنگین اور پیچیدہ ہوں، ان دنوں لڑکے اور لڑکیوں دونوں کی تعلیم کی طرف توجہ بڑھی ہے اور عام تعلیم کے ساتھ ساتھ لوگ فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم بھی دلوانے لگے ہیں چنانچہ اب بڑی تعداد میں لڑکیاں ڈاکٹر، انجینئر، آئی ٹی، پروفیشنل، ایم بی اے اور دیگر شعبہ جات میں آرہی ہیں۔

ہمارے یہاں دینی اور دنیوی تعلیم کی بحث میں تعلیم کا پورا فلسفہ خلط مبحث بن کر رہ گیا ہے۔ ہماری نظر میں جو دین ہے وہی دنیا ہے اور جو دنیا ہے وہی دین ہے۔ دین، دنیا برتنے کا طریقہ ہے اور دنیا دین پر چلنے کی جگہ۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل اور حریف نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق راستہ اور منزل کا ہے یا پھر مقصد و منہاج کا ہے۔ دین کو چند عقائد، عبادات، نجی اخلاقیات و معاملات تک محدود کرنا دین کا مثلہ کرنا ہے، اسی طرح دین سے بے پروا ہوکر دنیا کے لیے جدوجہد کرنا گمراہی اور ضلالت ہے جس کا انجام بھیانک ہے۔ لہٰذا ایک ایسا فلسفہ تعلیم اور نظامِ تعلیم وضع کرنے کی ضرورت ہے جو پوری طرح دین و دنیا پر محیط ہو۔ اس باب میں حدیث سے ہمیں ایک اور اصطلاح کا علم ہوتا ہے، جس کو علم نافع کہا جاتا ہے۔ یعنی اسلام نے علم کو دو بڑے خانوں میں بانٹا ہے ایک علم نافع اور دوسرا علم غیر نافع۔

ہر وہ علم جو کسی درجہ میں انسانیت کے لیے نفع بخش ہے وہ علم نافع ہے اور اس کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا محمود و مسعود ہے۔ اس اصطلاح میں جدید علوم کے تمام شعبہ علم اپنے اندر نفع کے پہلو رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان تمام علوم کا جاننا اور سیکھنا مفید ہے۔ اس میں

عورت اور مرد میں کسی طرح کی تحدید کرنا ایک خود ساختہ حد بندی ہوگی، جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ لہٰذا جوعلم مرد حاصل کرسکتا ہے وہ علم عورت بھی حاصل کرسکتی ہے اور ایک عورت کو بھی بلا روک ٹوک اپنی پسند کا علم حاصل کرنے کی اجازت اور موقع ملنا چاہیے۔ لہٰذا میں نہیں سمجھتا کہ اسلام کسی لڑکی کو حصول علم سے روکتا ہے۔ یہ باتیں میڈیا کے ذریعے بڑے پیمانے پر پھیلائی گئی ہیں کہ مسلمانوں کے بعض گروہ مثلاً افغانستان میں طالبان اور اسی قبیل کی بعض اور تنظیمیں جو دنیا کے مختلف مسلمان ملکوں میں سرگرم ہیں وہ لڑکیوں کو جبراً تعلیم حاصل کرنے سے روکتے ہیں اور نہ ماننے پر جان سے مارنے کی کوشش کرتے ہیں جیسا کہ ملالہ یوسف زئی کے معاملے میں دیکھنے کو ملا ہے۔ ان باتوں میں کتنی واقعیت اور سچائی ہے اور کتنا اس میں ملمع کاری ہے اس پر کوئی حتمی رائے دینا مشکل ہے کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسا کابل وثوق آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ذریعہ نہیں ہے جس کے ذریعے اس کی تصدیق یا تردید کی جائے۔ اس وقت میڈیا کے ذریعہ جو رپورٹیں آرہی ہیں ہم اس کو یک گونہ صحیح مانتے ہوئے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے قدامت پسند گروہ کا جو رویہ ہے وہ خود ان کی جہالت اور بند ذہنی کا غماز ہے اور شاید وہ بدلتے ہوئے حالات کا جو چیلنج ہے اس کا مقابلہ کرنے کی اپنے اندر اہلیت نہیں رکھتے ہیں اس لیے وہ اپنی ذہنی شکست خوردگی کا انتقام اس طرح کے تشدد آمیز کاررائیوں کے ذریعہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی جیت نہیں شکست ہے اور اپنی خفت مٹانے کے لیے وہ ایسی کارروائیوں میں مبتلا ہیں۔ ایسا کرکے وہ لڑکیوں میں جدید تعلیم کو نہیں روک سکتے ہیں بلکہ اس ردِعمل کے نتیجہ میں جو خواتین کا اسلام سے دور ہونے کا اندیشہ ہے وہ شاید اسلام دشمن طاقتیں یہی چاہتی ہیں۔ اگر وہ مسلمان عورتوں کو اسلام سے متنفر اور دور کرنے میں کامیاب ہوگئیں تو اس کا مطلب ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل کا رشتہ ان کے دین وتہذیب سے ٹوٹ جائے گا۔ پھر ان کو مغربی تہذیب کا گرویدہ بنا کر ان کے اندر ارتداد کا صور پھونکنا آسان ہوجائے گا۔

لہٰذا اکیسویں صدی میں مسلمان ملت ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جہاں

عورت اور مرد دین کو چھوڑ کر اس راستے پر جانے کو آمادہ ہیں جہاں اسلامی اقدار اور اسلامی شناخت کے مٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا عورتوں کی تعلیم کسی پروفیشنل کورس کی تعلیم کا مسئلہ محض نہیں ہے بلکہ اس ایک سوال کا تعلق پوری ملت کی پہچان اور اس کے مستقبل سے جڑا ہوا ہے۔ جس سے سرسری طور پر نہیں گزرا جاسکتا ہے اور نہ مسلمان عورتوں کو جاہل اور کم علم رکھ کر اس فتنے کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

میں یہاں پورے تعلیم کے مسئلہ اور فلسفہ پر گفتگو نہیں کروں گا۔ یہ کتاب اتنے وسیع وعریض موضوع کا متحمل نہیں ہے بلکہ اوپر کے پیراگراف میں میں نے جو اصولی گفتگو کی ہے اس میں غور وفکر کے واضح اشارات موجود ہیں۔

میں یہاں زور دے کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مردوں کی طرح عورتوں کی تعلیم بھی ضروری ہے لہٰذا عورتوں کو ہر طرح کی تعلیم کی اجازت اور مواقع ہونے چاہئیں۔ آج کے معاشرے میں عورتوں کی تعلیم کے باب میں جو خطرات اور اندیشے ہیں وہ واجب ہیں، اس کے لیے لڑکیوں کی ذہنی نشو ونما اور تربیت ایسی ہونی چاہیے کہ وہ پوری خود اعتمادی کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کرسکیں اور اپنی عصمت اور عزت نفس کی حفاظت کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ ان کے تحفظ کے جتنے خارجی انتظامات ہوسکتے ہیں وہ سب کرنے چاہئیں۔ عورتوں کے علیحدہ اسکول کالج کے علاوہ ان کے لیے مخصوص سواری کا نظم، قانون اور انتظام کا بہتر اور چست درست نظم، سخت قانون اور اس طرح کی تمام وہ چیزیں جو خارج میں عورتوں کو تحفظ دے سکیں، اس کو بروئے کار لانا چاہیے۔ پردہ، حجاب اور ساتر لباس کا اہتمام لڑکیوں اور خواتین کو مختلف طرح کی زیادتیوں سے بچانے میں اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔ لہٰذا ان چیزوں پر مثبت انداز سے سوچنا چاہیے اور ایسی ہوا فضا بنانی چاہیے تاکہ یہ وقت کا فیشن بن جائے۔ مغرب نے حیا کی چادر اتار دی ہے کوئی ضروری نہیں کہ ہم جب تک کپڑے نہیں اتاریں گے جدید، مہذب اور ترقی یافتہ نہیں ہوسکتے۔

حیا عورت کا زیور ہے اور عصمت وعفت اس کی سب سے قیمتی متاع۔ لہٰذا ایسی

ہر وہ چیز چھوڑی جائے جو اس کو نقصان پہنچاسکتی ہے اور ایسی ہر چیز اختیار کی جائے جو اس کی ضمانت دیتی ہے۔ ہمیں دوسروں کی نقل اتارنے کے بجائے اپنا فیشن سگنیچر خود بنانا چاہیے اور اپنا ماڈل خود تیار کرنا چاہیے جس دن ہمارے اندر یہ خود اعتمادی آجائے گی اس دن سے ایک نئے انقلاب کا آغاز ہوگا اور آپ دیکھیں گے کہ یہ دیکھتے دیکھتے کیسے وقت کا رولنگ فیشن بن جائے گا۔ ہمیں احساس کمتری سے باہر نکلنا ہے اور خود اعتمادی اور خود شناسی پیدا کرنی ہے۔ جو قوم علم اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اسی کا بول بالا ہوتا ہے۔

ان اصولی اور نظری باتوں کے بعد جبکہ یہ بات واضح ہوگئی کہ عورتوں کی تعلیم ضروری ہے اور کسی صورت میں اس سے کمپرومائز نہیں کیا جاسکتا ہے تو تعلیم کے لیے گھر سے باہر نکلنا ضروری ہوگا۔ لہٰذا اسلام نے پردے کا جو حکم دیا ہے وہ چادر اور چہار دیواری میں قید رہنے کے لیے نہیں دیا ہے بلکہ چادر کے ساتھ چہار دیواری سے کیسے باہر آیا جائے اس کے لیے دیا ہے تاکہ عورت گھر سے باہر کی دنیا سے جڑے اور اس سے متعلق جو ذمہ داری ہے چاہے وہ تعلیم کی ہو یا نوکری کی وہ اس کو پورا کر سکے۔

اس بحث کا ایک لطیف پہلو یہ بھی ہے کہ جب اللہ نے فرشتوں کے سامنے تخلیق آدم کے منصوبہ کا ذکر کیا تو فرشتوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اس سے زمین میں فساد پیدا ہوگا۔ اللہ نے فساد کے امکان سے انکار نہیں کیا بلکہ فرشتوں کو بتایا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ اس کے باوجود کہ تخلیق آدم کے سبب زمین میں فساد برپا ہوسکتا ہے تخلیق کے جو عظیم تر مصالح ہیں اس کی خاطر یہ خطرہ برداشت کیا جاسکتا ہے اور اللہ نے آدم کی تخلیق کرکے زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجا۔ کوئی گاڑی جب تیز رفتار سے چلے گی تو اس کے نتیجے میں حادثات ہوسکتے ہیں اب اگر حادثات کے ڈر سے لوگ تیز گاڑی کی تخلیق بند کردیں یا اس پر چڑھنا چھوڑ دیں تو کیا یہ معقول بات مانی جائے گی؟ ٹھیک اسی طرح لڑکیوں کی تعلیم اور نوکری کے باب میں جو اندیشے اور خطرات ہیں وہ بے بنیاد نہیں ہیں، بلکہ بعض اوقات دل دہلا دینے والے واقعات سامنے آتے ہیں، مگر ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اور قوموں

نے جو نقشہ کار طے کیا ہے اگر ہم ان میں اسلامی اقدار کو شامل کرلیں تو اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ مسئلہ ہے اور مسئلہ کی نوعیت اور سنگینی سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس کا حل لڑکیوں کو گھر میں بٹھا کر رکھنا، جاہل رکھنا، ان کو نوکری اور روزگار سے روکنا ہرگز نہیں ہے۔

کوئی فرد یا قوم یا اس کا کوئی طبقہ کام نہ کرے، کام کرنا معیوب سمجھے یا کسی کام کو چھوٹا اور حقیر سمجھے، قوم میں جو لوگ آرام طلب، تعیش پسند، کام چور، سہل انگار ہیں ان کی قدر افزائی کرے اور جو لوگ محنت کش ہیں ان کو حقیر سمجھے، مفت کی روٹی توڑنے والوں اور کسی کی دی ہوئی اعانت اور زکوۃ وصدقات پر گزارہ کرنے والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھے اور خراج وعطیات پر جینے والوں کو رشک بھری نظروں سے دیکھے تو اس قوم کا مستقبل تاریک اور غیرت مردہ قرار دی جائے گی۔ ایسی قوم کبھی عالمی برادری میں عزت وشرف کی نظر سے نہیں دیکھی جاسکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم مثال کہاں سے لائیں گے۔ ہمارے لیے عہد نبوی سے بہتر مثال نہیں ہوسکتی ہے۔ عہد نبوی میں مکہ اور مدینہ کی مسلمان خواتین گھر سے باہر نکل کر کھیتی باڑی کرتی تھیں، مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں، تجارت کرتی تھیں، بازار میں بیٹھ کر سودہ سلف بیچتی تھیں، بچوں کو پرورش، گھر کی دیکھ بھال، شوہر کی دلجوئی، تعلیم کا حصول اور معاشی عمل میں اپنے شوہروں کا تعاون، اس طرح کی بے شمار مثالیں سیرت و تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ بعد کے ادوار میں جب زمین داری اور جاگیرداری نظام رائج ہوا اس کے بعد سے عورتوں نے ہی کیا مردوں نے بھی محنت وسخت کوشی چھوڑ دی اور خراج و عطیات پر جینے کو اپنی شان بنالیا۔ چونکہ یہ سماج کا اعلیٰ طبقہ تھا، لہٰذا اس کی تہذیب ملت کی تہذیب قرار پائی۔ عوام حسبِ سابق بغیر کسی رہنمائی کے جہالت میں مبتلا رہی۔

اب حالات بدل چکے ہیں۔ تعلیم ایک عالمی تحریک بن گئی ہے۔ ہر قوم کی ضرورت ہے، ہر فرد کا مستقبل اب اس بات سے طے ہوتا ہے کہ اسے کیسی اور کتنی تعلیم حاصل ہوئی ہے۔ حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ محض ایک فرد کی کمائی سے پورے کنبہ کی ذمہ

داری پوری نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذا مردوں کے ساتھ عورتوں کو معاشی عمل میں حصہ داری کرنی پڑ رہی ہے۔ جن قوموں میں مرد ہی کماتے ہیں، وہ اپنی بہت سی ضروریات پوری نہیں کر پاتے ہیں۔ تعلیم، صحت، مکان، لباس، سواری یہاں تک کہ روز مرہ کا کھانا پینا اتنا مہنگا ہوگیا ہے کہ ایک آدمی کی آمدنی اس کی پوری کفالت نہیں کر پاتی ہے۔ اس لیے عورتوں کا تعلیم حاصل کرنا، اعلیٰ اور معیاری تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ اسے اچھی اور اعلیٰ تنخواہ کی نوکری ملے ورنہ اس کو کم تنخواہ والی نوکریوں پر اکتفا کرنا ہوگا۔ اس طرح تعلیم اور نوکری کے لیے ان کا گھر سے باہر نکلنا لازمی اور ناگزیر ہے۔

بحث یہ نہیں ہے کہ عورت کو تعلیم حاصل کرنا چاہیے یا نہیں، اس کو نوکری کرنی چاہیے یا نہیں، بحث یہ ہے کہ اس دور پرفتن میں جبکہ عورت کی عصمت وعفت بازار کی شے بن گئی ہے عریانی اور اباحیت ایک طرزِ عام ہے۔ کیا مسلمان عورت کو بھی ویسا ہی ہونا چاہیے یا اس ٹرینڈ کے برخلاف اس کو ایک ایسا ماڈل پیش کرنا چاہیے جس میں جدید دور اور تہذیب کے تمام فائدے اور برکات حاصل ہوں اور اس کے جو بھی نقصانات اور خطرات ہیں اس سے محفوظ رہا جائے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم آبرو باختگی کے اس دور میں اپنی آبرو کی حفاظت کرتے ہوئے اعتماد کے ساتھ موجودہ جہد وعمل میں حصہ لے سکیں۔

میرے خیال میں اب ملت میں یہ بحث نہیں ہے کہ عورتوں کو تعلیم حاصل کرنا چاہیے یا نہیں اور انھیں نوکری یا دیگر معاشی عمل میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں۔ اس پر اب کسی کو اعتراض نہیں ہے۔ لوگوں کے دلوں میں خوف اور اندیشے ہیں جس کے باعث ابھی بھی کچھ لوگوں میں جھجک پائی جاتی ہے۔ کچھ لوگوں نے بدلتے ہوئے حالات میں آنکھیں موند لی ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کو گوارا اور نظر انداز کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے، جو قابلِ تشویش بات ہے۔ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ اس صورتحال میں تبدیلی لائی جائے، مگر چونکہ ان کے ہاتھ میں سیاست، معیشت اور تہذیب کی کمان نہیں ہے اس لیے وہ خود کو بے دست و پا پاتے ہیں، اس لیے کبھی کبھی یہ مسئلہ تہذیبی کشمکش اور تمدنی ٹکراؤ کی شکل میں رونما ہوتا

ہے۔ علماء اور کچھ خواص کا طبقہ ایک طرف ہے تو عوام اور جدید فکر کے حاملین کا طبقہ دوسری طرف۔ بعض مسلمان عورتیں جن کی جڑیں اپنے دین وتہذیب میں گہری نہیں ہیں اور جن کے دلوں میں اسلامی اقدار وروایات کا احترام نہیں پایا جاتا وہ بہت ہی بے باک ہیں اور ہر طرح کی بے ہودگی کی بڑی ڈھٹائی سے وکالت کرتے ہیں، جبکہ کچھ لوگ معذرت خواہانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ دونوں گروہ ملت میں کنفیوزن پھیلاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حالات کا معروضی انداز سے مطالعہ کیا جائے اور ملت کے سامنے ایک ایسا قابل کار متبادل پیش کیا جائے جو جدید ضرورتوں اور امنگوں کی تکمیل میں مددگار ہو ساتھ ہی ہمارے اقدار پر مبنی ہو۔ یہ ایک چیلنج ہے اور جب تک ہم اس چیلنج کا مثبت انداز سے مقابلہ نہیں کریں گے ہم اس فکری اور عملی دلدل سے باہر نہیں نکل سکتے ہیں۔

عوام ہمیشہ خواص سے رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں۔ اگر خواص رہنمائی میں ناکام ہوں گے تو عوام میں انتشار پھیلے گا، وقت آ گیا ہے کہ ہم نوشتہ دیوار کو پڑھیں اور ملت کی ایسی رہنمائی کریں جس سے وہ اپنے دین واقدار پر قائم رہتے ہوئے جدوجہد حیات میں پوری تندہی اور شرح صدر کے ساتھ حصہ لے سکیں۔ یہی کامیابی اور ترقی کی کنجی ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ عورتوں کی تعلیم اور معاشی جدوجہد میں ان کی بھرپور حصہ داری ان کے بنیادی حقوق کا حصہ ہے جس پر قدغن نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ ان حقوق کی بازیابی میں جو رکاوٹ ہے اس کو دور کرنے کی فکر ہونی چاہیے نہ کہ ان کے بنیادی حقوق پر شب خون مارا جائے۔ ایسا کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا جو نہ ملت کے مفاد میں ہے اور نہ خواتینِ ملت کے مفاد میں۔

لہٰذا میری رائے میں عورتوں کو تعلیم اور روزگار کے محفوظ مواقع فراہم کرنا حکومت اور ملت دونوں کی ذمہ داری ہے اور دونوں کو مل کر اس فریضے کو انجام دینا چاہیے۔ تاریخ میں بعض فیصلے ایسے ہوتے ہیں جو قوموں کی تقدیر بدلنے والے ہوتے ہیں۔ عورتوں کو تعلیم اور معاشی جدوجہد میں بھرپور حصہ داری کا موقع ایک ایسا فیصلہ ہے جو ملت کی تصویر اور

تقدیر بدل دے گی بس سوچنا صرف اتنا ہے کہ ان کو ایک Safe Corridor کیسے فراہم کرائی جاسکتی ہے۔ لہٰذا بحث اس پر نہیں ہونی چاہیے کہ عورتوں کو کیا، کیسی اور کتنی تعلیم دی جانی چاہیے یا عورتوں کے لیے کون سے روزگار اور کام مناسب اور موزوں ہیں بلکہ بحث یہ ہونی چاہیے کہ ان کو جو پیش آمدہ Hazards ہیں اس سے ان کو کیسے بچایا جاسکتا ہے۔ اس معاملہ میں مغرب کا ماڈل ناکام ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں مشرق بالخصوص اسلامی دنیا کو آگے بڑھ کر ایک قابلِ عمل متبادل ماڈل پیش کرنا چاہیے۔ اسی پر عورت اور جدید تہذیب کا مستقبل منحصر ہے۔ کیا ہمارے اندر وہ فراست مومنانہ نہیں جس سے ہم ملت، ملک اور دیگر دنیائے انسانیت کی رہنمائی کرسکیں۔ اس وقت رجعت پسندی نہیں رفعت پسندی ملت کا منہاج ہونا چاہیے۔ لہٰذا یہ بڑے سوالات ہیں جن پر گہرائی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کام میں ملت کے رہنماؤں کو اپنے دانشوروں اور علماء کے ساتھ ساتھ خواتین کو اعتماد میں لے کر اور ان کے مشورے اور تعاون سے ایک بہتر متبادل ماڈل کی تشکیل میں پوری سنجیدگی سے غوروفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ فتوے بازی، جملہ بازی، چلتے پھرتے کمنٹ، تمسخر و استہزاء سے ہر حال میں بچنا ضروری ہے۔ کسی کی نیت اور ارادے پر حملہ نہ کیا جائے بلکہ لوگوں کی باتوں کو سنجیدگی سے سنا جائے اور اس میں مثبت پہلو تلاش کیا جائے۔ یہ ایک علمی اور عملی مسئلہ ہے لہٰذا اس کے لیے سائنٹفک اپروچ اختیار کرنا از بسکہ ضروری ہوگا۔ شاید اسی سے کوئی ایسا متبادل سامنے آئے جو عملی بھی ہو اور ہمارے اقدار میں فٹ بیٹھتا ہو۔ میں سمجھتا ہوں جو فرد اور گروہ بھی ایسا کرنے میں کامیاب ہوگا وہ دنیا میں نوبل پرائز کا اور آخرت میں خدا کی خوشنودی اور اس کی نعمتوں بھری جنت کا مستحق ہوگا۔ یہ مسئلہ ملت کے ظرف و ذہانت اور خودداری کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔ میں اس بحث کو یہیں روکتا ہوں آگے کی بحث مجھ سے زیادہ صاحب علم اور صاحبِ فہم لوگ کریں گے۔ میری دعا ہے کہ یہ مسئلہ ملت کی نشاۃ ثانیہ کا شاہ دروازہ بنے جہاں سے ملت کے عروج کا باب وا ہوتا ہے۔

■❖■

(10) عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط کا مسئلہ

آج کے دور میں جب کہ عورتوں کا مختلف کاموں کے لیے گھر سے باہر نکلنا ایک لازمی ضرورت بن گیا ہے، یہ سوال بہت اہم ہے کہ اسلام عورتوں اور مردوں کو کس حد تک اختلاط کی اجازت دیتا ہے؟ مسلمان معاشرہ مغرب ومشرق کے غیر مسلم معاشرہ سے بالکل مختلف ہے۔ لہٰذا مغرب ومشرق کے غیر مسلم معاشرے کا جو طرزِ عمل ہے وہ ہمارے لیے نمونہ نہیں ہوسکتا ہے۔ جو چیزیں غیر مسلم معاشرے میں جائز اور غیر اہم سمجھی جاتی ہیں ضروری نہیں مسلمان معاشرہ بھی اس کو جائز اور غیر اہم سمجھے۔

اوپر کے مباحث میں اس بات کو زور دے کر واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کی نظر میں عورت اور مرد دونوں کے لیے پاکیزگیٔ نفس ضروری ہے، ایسا نہیں ہے کہ عورت کی عزت وعصمت پر زیادہ زور ہے اور مرد کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ حدودِ شرعی سے تجاوز کرتے ہوئے کوئی مرد یا عورت اپنی جنسی تسکین کا سامان تلاش کرتی ہے تو اسلام کی نظر میں اتنا ہی بڑا گناہ اور لائق تعزیر جرم ہے۔ لہٰذا پاکیزگیٔ نفس جتنا عورت کے لیے ضروری ہے اتنا مرد کے لیے بھی ضروری ہے۔ عموماً غیر مسلم مشرقی معاشرے میں عورت اگر کسی گناہ کی مرتکب

ہوتی ہے تو اسے زیادہ برامانا جاتا ہے جبکہ مرد اگر اسی طرح کے گناہ میں ملوث ہوتا ہے تو اس کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی۔مغرب نے اس تصور گناہ کو بھی ختم کر دیا ہے اگر دونوں بالغ ہیں اور اپنی آزادانہ مرضی سے کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرتے ہیں جو شادی کے بعد ہی جائز ہے تو ان کی نظر میں نہ جرم ہے اور نہ گناہ۔ چونکہ دونوں معاشروں کا اقدار ومنہاج مختلف ہے اس لیے وہ اسلامی معاشرہ کے معیار پاکیزگی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ گھر عورت کا فطری دائرہ کار ہے اور اس کو اپنے فرائض و واجبات گھر کے دائرے میں رہ کر انجام دینا چاہیے جبکہ مرد کو گھر سے باہر کی تمام ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں مگر اس کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ضرورت پڑنے پر بھی عورت گھر سے باہر نہیں نکل سکتی ہے بلکہ حسبِ ضرورت وہ گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔ پردہ اور حجاب گھر کے اندر کی چیز نہیں ہے بلکہ گھر سے باہر نکلتے وقت اختیار کرنے کی چیز ہے۔

اسلام عورت کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے، مگر اسے آزادانہ اختلاط سے روکتا ہے۔ گھر میں، بازار میں، دفتر میں، تعلیم گاہوں میں، ریل، بس اور ہوائی جہاز میں، ہسپتال میں اور ایسی تمام جگہوں پر عورت اور مرد ایک ساتھ ہو سکتے ہیں، مگر ان کے درمیان حدود اور حجاب قائم رہنا چاہیے۔ اس طرح اختلاط آزادانہ اختلاط نہیں کہا جاسکتا ہے۔

آزادانہ اختلاط کا مطلب بے پردہ، غیر ساتر لباس میں بلا ضرورت میلے ٹھیلے، تفریح گاہوں میں جانا، ناچنا گانا اور تمام حدود و قیود کو پھلانگ کر ایک دوسرے سے اس طرح قریب آنا کہ دونوں کے جسم ایک دوسرے سے ملتے ہوں تو ایسا کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اس طرح کے عمل کو عورت کی آزادی اور اس کی خود مختاری قرار دینا ذہنی اور اخلاقی دیوالیہ پن ہے۔ ایسے ذہنی مریضوں کے لیے اسلام کے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔

اگر آپ دنیا بھر میں عورتوں کے خلاف ہونے والے جنسی جرائم کا جائزہ لیں تو صاف معلوم ہوتا کہ اس کی بڑی وجہ عورتوں اور مردوں کا اس طرح بے وجہ آزادانہ اختلاط ہے جس میں عورتوں کا قصور مردوں سے کم نہیں ہے۔

ہم عورتوں کی آزادی کے قائل ہیں، آوارگی کے نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جو عورت کھلے طور پر مردوں سے ملتی جلتی ہے لازمی طور پر وہ آوارہ ہے۔ ہم ایسی کوئی عمومی رائے نہیں رکھتے۔ ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے زیادتی کا امکان بڑھ جاتا ہے اور ہم عورتوں کو ایسی صورتحال سے بچانا چاہتے ہیں۔

لہٰذا اوپر کے مباحث کو دھیان میں رکھتے ہوئے عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا ایک لازمی ضرورت ہے اور مختلف مواقع پر ان کا مردوں سے سابقہ پڑسکتا ہے، لہٰذا وہ اگر حجاب اور حدود کے اندر یہ رابطہ رکھیں تو کوئی حرج نہیں ہے، مگر جس آن وہ حجاب اور حدود سے آزاد ہوکر اختلاط پیدا کرنے کی کوشش کریں گی، اسلام اس کی اجازت نہیں دے گا۔ اس لیے کہ ایسا کرنا عورت کے بنیادی حق یعنی عزت نفس کے ساتھ جینے کی اجازت Life with Dignity کے منافی ہے۔

My body, My right کا نعرہ مغربی تناظر میں چاہے جتنا معقول اور انقلابی نظر آتا ہو، اسلام کی نظر میں ایک غلط تصور ہے۔ انسان کی زندگی، اس کا جسم، اس کا مال سب کو اس شریعت کا پابند ہونا ہوگا جو اسلام لایا ہے تبھی کوئی مرد یا عورت مسلمان قرار دیے جاسکتے ہیں۔ جو اس بنیادی اصول سے انحراف کرے گا وہ اسلام کے دائرے سے باہر نکل جائے گا چاہے وہ خود کو مسلمان مانے یا نہ مانے۔

قرآن کا ارشاد ہے اللہ نے مسلمانوں کی جان و مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ مسلمانوں میں مسلمان مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ لہٰذا جب ایمان لاکر آپ نے اپنی جان اللہ کے حوالے کردی ہے تو My Body کا نعرہ بے معنی ہوجاتا ہے۔ اب یہ جسم اور جان اللہ کی ہے جس پر اللہ کا حکم چلے گا آپ کا حکم نہیں چلے گا۔ یہی فرق ایک مومن اور کافر میں ہے۔ کافر وہ ہے جس نے خود کو خدا کے حوالے کرنے سے انکار کردیا ہے جبکہ مومن وہ ہے جس نے خود خدا کے حوالے کردیا ہے۔ لہٰذا اب Right وہی ہے جو خدا نے متعین کیا ہے۔ اس لیے ہمیں کوئی طرزِ عمل اختیار کرنے سے پہلے یہ ضرور دیکھنا ہوگا کہ

ہمیں کس دائرے میں رہ کر کام کرنا ہے۔ اگر ہم اس کی خلاف ورزی کریں گے تو گناہ گار ہوں گے۔

لہٰذا مسلمان مرد وعورت ہر دو کو اس دائرے میں رہ کر ہی اپنے فرائض منصبی کو انجام دینا ہے۔ اسلامی شریعت اور اقدار کی رو سے مردوں اور عورتوں کے دائرہ کار الگ ہیں اس لیے جہاں تک ممکن ہو ان کو آزادنہ اختلاط سے بچایا جائے اور اگر اختلاط لازمی ہو تو ان حدود کا التزام کیا جائے تاکہ فتنہ کا امکان کم سے کم ہو اور دونوں کی عزت نفس اور معاشرہ کی پاکیزگی برقرار رہے۔

اسلام نے حجاب کا حکم دیا ہے، مگر حجاب کا کوئی الٰہی ڈیزائن نہیں ہے کہ ایسی تراش خراش ہوگی تو اسے حجاب مانا جائے گا ورنہ اسے حجاب نہیں مانا جائے گا۔ اس کا تعین ملکوں اور خطوں کے موسم، اس علاقے میں رائج لباس اور تمدن اور طرزِ معاشرت کی بنیاد پر ہوگا۔ پردہ کا مطلب جسم کے ان حصوں کو ڈھانپنا ہے جس کو ڈھانکنے کا اسلام نے حکم دیا ہے اور خود کو فتنہ سامانی سے بچانا ہے۔ اسلام جہاں مردوں کو پاکیزگیٔ نفس کا حکم دیتا ہے وہیں عورتوں کو خود اپنی عصمت کی حفاظت کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کا اولین نکتہ یہ ہے کہ عورت اس لباس میں گھر سے باہر نکلے جس سے وہ مردوں کی ہوسناکی سے محفوظ رہ سکے۔ معاشرے میں صرف پارسا اور متقی لوگ ہی نہیں رہتے ہیں، اس میں غنڈے، شہدے، آوارہ، بدچلن اور جرائم پیشہ لوگ بھی رہتے ہیں لہٰذا خود کو ان کی نظروں سے بچانا عورت کی اپنی ذمہ داری ہے۔

کچھ لوگ سوال کرسکتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ترقی کے مواقع کم اور فتار سست ہوسکتی ہے۔ وہ ایسا اس لیے ہے کہ وہ دونوں کے حیاتیاتی فرق کو نہیں سمجھتے ہیں۔ ہم تعلیم، روزگار اور دیگر کاموں سے نہیں روکتے، ہم اس بے محابہ آزادانہ، بے ہنگم اور غیر ضروری اختلاط سے روکتے ہیں جو ان کی یا ملک کی آزادی اور ترقی میں مانع نہیں بلکہ جنسی بے راہ روی اور اباحیت کا سبب بنتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم جنسی بے راہ روی اور اباحیت سے کسی قوم

یا فرد کا کیا بھلا ہوسکتا ہے۔ اگر لوگ مغرب کی ترقی کو اس کی دلیل مانتے ہیں تو یہ اس فکر وتہذیب کا بہت ہی سطحی مطالعہ ہے۔ مغرب کی ترقی کا اس طرزِ عمل سے کوئی لینا دینا نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ان کی ذہانت، سخت محنت اور ان کی خلاقانہ صلاحیت ہے۔ ہم اگر مغرب سے کچھ لے سکتے ہیں تو ان کا علم و سائنس لیں، ان کا معاشرہ تو اتنا ہی خراب ہے کہ خود مغرب کے تمام فلسفی اور دانشور حد درجہ تشویش میں ہیں کہ کب یہ معاشرہ اپنی غلاظت کے تلے دب کر دم توڑ دے۔ مغرب بازار میں بیٹھی ایک آبرو باختہ عورت کی طرح ہے جس کو کوئی شریف آدمی بیاہ کر اپنے گھر لانا پسند نہیں کرے گا۔ لہٰذا مغربی معاشرہ اور اس کے تمدنی ادارے ہمارے لیے نمونہ اور معیار نہیں بن سکتے ہیں۔

■❖■

(11)بغیر محرم کے تنہا سفر کرنا

وقت اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ افکار اور اقدار میں بھی تبدیلی ہوتی ہے اور جو چیز کبھی خوب، اچھی، پسندیدہ اور ضروری سمجھی جاتی تھی بعد میں وہی چیز غیر ضروری اور بسا اوقات ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہے۔ اسی میں ایک مسئلہ بغیر محرم کے تنہا سفر کرنا ہے۔ فقہا کی پوری جماعت عورت کو بغیر محرم کے تنہا سفر حج کی بھی اجازت نہیں دیتی ہے۔ اس کی بنیادی حکمت بہت واضح ہے۔ حج پوری دنیا کے مسلمان کرتے ہیں۔ لہٰذا دور دراز کا تنہا سفر کرنا اپنے اندر بے شمار دقتیں اور پریشانیاں رکھتا ہے اور اس میں ہر طرح کے خطرات ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا عورتوں کو کسی ایسی آزمائشی صورتحال سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کو ایک رعایت دی ہے کہ جب تک کوئی محرم یعنی شوہر، بیٹا، بھائی یا ایسا رشتہ دار جو محرم ہو موجود نہ ہو۔ اس وقت تک وہ یہ جوکھم نہ اٹھائیں۔ لوگ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا سفر حج میں عورت کی جان و مال یا عزت آبرو کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے، یا کیا عورت اتنی کمزور سمجھی جاتی ہے کہ وہ خود اپنا خیال نہیں رکھ سکتی ہے یا اپنی حفاظت خود نہیں کرسکتی ہے۔ آج آزادی نسواں کے نام پر عورتوں کی آزادی کو جس مقام تک کھینچ کر لایا جارہا ہے، اس کے باوجود کے مہذب اور غیر مہذب دونوں دنیاؤں میں روزانہ عورتوں کی عزت آبرو لٹنے کے ہزاروں واقعات سامنے آرہے ہیں، اس کے باوجود آزادئ نسواں کے حاملین ہوش کا ناخن لینے کو تیار نہیں

ہیں۔ دراصل عورت کی عصمت وعفت ان کی نظر میں اتنی محترم نہیں ہے جس کے لیے کسی امتناعی عمل کی ضرورت ہے۔ اقدار میں اس بنیادی فرق کی وجہ سے ان کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں واضح فرق دیکھنے کو ملتا ہے اور جو چیزیں سہولت، رعایت اور حفظ ماتقدم کے طور پر متعین کی گئی ہیں، انھیں رکاوٹ، بندش اور نفی آزادی سمجھا جاتا ہے۔

جہاں تک اسلام کا سوال ہے، اسلام عورت کی عزت، اس کی عصمت وعفت کی حفاظت کو دنیا کی ساری چیزوں پر مقدم مانتا ہے۔ اس معاملے میں اس نے صرف عورتوں کو ہی نہیں مردوں کو بھی کچھ حدود کا پابند کیا ہے۔ اسلام ایک ایسی انسانی سوسائٹی تشکیل دینا چاہتا ہے جو حافظ ناموس زن ہو۔ اسلام نے جس آئیڈیل لاء اینڈ آرڈر کا تصور دنیا کو دیا ہے اس کے مرکز میں عورت ہے۔

اسلام ایک ایسی سوسائٹی چاہتا ہے جس میں ایک عورت ایک لمبا طویل سفر تنہا سونا اچھالتے ہوئے کرے اور راستے میں سوائے خدا کے خوف کے کسی اور چیز کا خوف نہ ہو، یہ ایک حدیث کا مفہوم ہے جو یہاں پیش کیا گیا ہے۔

اس حدیث کا محاکمہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل نکات ابھر کر سامنے آتے ہیں:

(1) ایک عورت تنہا سفر کرتی ہے۔

(2) سفر کافی طویل ہے، راستہ لمبا ہے۔

(3) وہ مال واسباب سے بھری ہے۔

(4) راستے میں اس کی جان و مال اور عزت وآبرو دونوں پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔

(5) خود اسے بھی خدا کا خوف ہے، جس سے وہ غلط کام سے بچے گی اور راستے اور اس کے درمیان رہنے والے جو لوگ ہیں وہ سب خوفِ خدا کی وجہ سے ہر گناہ، ظلم، زیادتی اور حق تلفی سے خود کو بچاتے ہیں۔

(6) پورا راستہ اور بالعموم پورا معاشرہ جرائم پیشہ خاص طور پر ان عناصر سے پاک ہے جو ایک عورت کو تنہا دیکھ کر اس کے جان ومال اور عزت وآبرو پر حملہ کرنے سے

ڈرتے ہیں۔

(7) حکومت کا نظام، لاء اینڈ آرڈر مشنری، سماج کا اخلاق، سماجی اداروں کی گرفت اور انصاف کا نظام اتنا مضبوط ہے کہ کسی عورت کو تنہا دیکھ کر کوئی اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔

(8) پورے معاشرے کی اخلاقی حالت اتنی اچھی ہے کہ چنداں ایسی کسی چیز کا اندیشہ نہیں ہے۔

(9) معاشرے کی تطہیر و تعلیم کا مناسب انتظام موجود ہے۔

(10) قانون کے نفاذ میں صرف ضابطوں اور اداروں کے قیام پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ معاشرے کی ایمانی اور اخلاقی تربیت بھی ایسی کی گئی ہے جس سے قانون کی حکمرانی اور احترام اس درجہ قائم ہے کہ ایک تنہا عورت کو سوائے خدا کے کوئی اور خوف لاحق نہیں ہے۔

اگر ہمارا سماج اس آئیڈیل پر قائم ہو تو ایک عورت کو تنہا سفر کی اجازت دینے میں کوئی قباحت نہیں ہوسکتی ہے۔ مگر یہ ایک سچائی ہے کہ مشرقی اور مغربی دنیا کا کوئی سماج ایسا نہیں ہے جہاں یہ صورتحال پائی جاتی ہے، لہٰذا اگر عورتوں کے تحفظ کی خاطر اگر ان کو تنہا سفر نہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے تو اس کو عورتوں کی آزادی پر قدغن ماننا دراصل ذہنی اور فکری دیوالیہ پن ہے۔ آپ جب تک کسی حکم کے سیاق و سباق کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں، محض بعض ظاہری باتوں کی بنیاد پر زبان طعن دراز کرنا کوئی علمی انداز نظر نہیں مانا جاسکتا ہے۔

اس اصولی گفتگو کے بعد آیئے عملی تناظر میں اس مسئلے کے دیگر پہلوؤں پر غور کریں:

اسلام نے جس دور میں عورتوں پر اس قسم کی پابندی لگائی اس دور میں نقل و حمل کے ذرائع بہت محدود تھے، سفر بہت مشکل، تکلیف دہ اور خطرناک ہوتا تھا۔ میلوں کا سفر گھنٹوں میں نہیں بلکہ دنوں اور مہینوں میں طے ہوتا تھا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا

انتہائی جوکھم بھرا عمل ہوتا تھا۔لوگ پیدل، اونٹ، گھوڑے، خچر اور کشتیوں کے ذریعہ دور دراز کا سفر کرتے تھے۔ ایسی صورت میں جبکہ مرد بھی تنہا سفر کرنے کی ہمت نہیں کرتے تھے بلکہ قافلہ بنا کر چلتے تھے، اس صورت میں عورتوں کو تنہا سفر کی اجازت دینا مضحکہ خیز ہوتا۔ ان کو راستے میں بھوک پیاس کے علاوہ بیماریوں کا خطرہ لگا رہتا تھا، ساتھ ہی راستے میں چور اچکے، لٹیرے اور ڈاکو بھی ان کو جابجا ملتے۔ جن سے بچاؤ کے لیے اپنے تمام سامان کے ساتھ وہ اپنے ہتھیار بھی لے کر چلتے اور قافلے والوں کی ایسی تربیت اور تیاری کرتے کے راستے میں اگر اس طرح کے خطرات ہوں تو اس کا مقابلہ کیسے کریں۔ ڈاکو، قزاق اور مختلف علاقوں کے حکمراں بھی ایسے ہوتے جو مال واسباب لوٹنے کے ساتھ ساتھ قافلے کی عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے یا ان کے ساتھ زیادتیاں کرتے۔ لہٰذا اس دور میں جب تک سفر ناگزیر نہ ہو لوگ سفر کرنے سے گریز کرتے اور اپنی تمام تر ضروریات مقامی طور پر ہی پوری کرنے کا اہتمام کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں تجارت بہت محدود تھی اور معاشی عمل بہت سست تھا۔عورتیں کیا مرد بھی آج کی طرح پڑھے لکھے نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا اس معاشرے اور ماحول میں ایک فطری کمزوری تھی اور عورتیں زیادہ کمزور تھیں۔ اس لیے ان کی حفاظت کا مسئلہ زیادہ اہم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو کئی طرح کے تحفظات فراہم کرائے گئے جس میں پردہ اور تنہا سفر نہ کرنے کی ممانعت شامل ہے۔

اگر آپ کسی حکم کو اس کے صحیح تناظر میں نہیں دیکھیں گے تو اس کی معنویت کبھی سمجھ میں نہیں آئے گی۔

آج صورتحال بالکل بدل چکی ہے۔نقل وحمل اور رسل و رسائل میں جو انقلاب عظیم پیدا ہوا ہے اس نے تمام سابقہ تصورات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب زمان و مکان کا تصور قدیم دور کے تصور سے بالکل بدل چکا ہے۔ لہٰذا اس وقت فکر ونظر میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

پہلے کے شہری ریاست (City State) کے مقابلے اب قومی ریاست (Nation

State) کا دور ہے حکومت کا نظام پختہ ہے، حکومت عوام کی ضروریات، تحفظ ، ترقی اور امنگوں کا خیال رکھتی ہے۔ سول انتظامیہ، پولیس، ملٹری، انصاف اور نگرانی کا نظام سب منضبط ڈھنگ سے کام کررہے ہیں۔ مرد وخواتین میں تعلیم کا چلن ہے، معاشی عمل بہت تیز ہے۔ مرد وعورت دونوں مل کر کام کرتے ہیں۔ عورتوں، مردوں کے درمیان مساویانہ برتاؤ نظر آتا ہے۔ عورتیں مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ ہر میدان میں کام کررہی ہیں۔ تمام تر خطرات، حملوں اور زیادتیوں کے باوجود جدید عورت پورے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے اور اس صورتحال کو بدل کر رکھ دینا چاہتی ہے جو صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔

اب عورتیں ٹرین، بس، ٹیکسی، ہوائی جہاز اور دیگر سواریوں کے ذریعے دور دراز کا تنہا سفر کرتی ہیں، اپنے گھر شہر اور گاؤں سے دور کسی شہر اور قصبے میں تعلیم، نوکری، تجارت وغیرہ کے لیے نہ صرف تنہا سفر کرتی ہیں بلکہ تنہا رہتی ہیں۔ ان عورتوں کو چھوڑ دیجیے جو خود جرائم کی دنیا میں ہیں اور جن کا کردار خراب اور مشکوک ہے۔ ایسی عورتیں اور لڑکیاں جو پوری طرح پاک دامن ہیں اور اپنی عصمت وعفت کے بارے میں بہت حساس ہیں وہ بھی تعلیم اور نوکری کی غرض سے بڑے شہروں اور دیگر مقامات پر تنہا رہتی ہیں اور تنہا آتی جاتی ہیں۔ موجودہ حالات میں ان کے ساتھ کسی محرم کا ہونا عملاً مشکل ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں ان کو کیسے تحفظ دیا جائے اور ان کی مشکل کیسے آسان کی جائے یہ ایک عمرانی مسئلہ بھی ہے اور ایک تہذیبی مسئلہ بھی ہے اس کا یہ حل تو ہرگز نہیں ہوسکتا کہ عورتوں کو تعلیم، نوکری اور دیگر ذمہ داریوں سے سبکدوش کرکے پھر سے انہیں عہد قدیم میں لے جایا جائے۔ اس کا مناسب حل یہ ہے کہ اسے متبادل ضابطے، ادارے اور ان کو پختہ تحفظ فراہم کرائے جائیں تاکہ عورتیں بغیر کسی خوف اور گھٹن کے آزادی سے اپنی زندگی گزار سکیں۔

اب یہ سب سے بڑا سوال ہے کہ عورتوں کی عصمت وعفت کی حفاظت نہ صرف مردوں کی ذمہ داری ہے اور نہ حکومت اور سماج کی بلکہ اس کی سب سے بڑی ذمہ داری خود عورتوں کی اپنی ہے۔ اپنی اس ذمہ داری کو وہ محض قانون اور انتظام کی مشنری کو مضبوط کرکے

حل کرنا چاہیں گی یا سی سی ٹی وی کیمرے اور پولیس کے ذریعہ کروانا چاہیں گی تو یہ جزوی اور ناکافی قدم مانا جائے گا۔ آپ قانون چاہے جتنا سخت بنالیں، جن کے تحفظ کے لیے یہ قانون بنا ہے وہ اپنے تحفظ کے سلسلے میں خود حساس بے دار، مستعد اور چاق و چوبند نہیں ہوں گی اور خود ضروری اقدامات کو از خود اپنے اوپر نافذ کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوں گی، اس وقت تک ان کو تحفظ حاصل نہیں ہوگا۔ معاشرہ اور مردوں کا ڈسپلن کرنے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی ڈسپلن کرنا ضروری ہوگا۔

ہم اس وقت تاریخ و تہذیب کے جس موڑ پر کھڑے ہیں، یہاں سے واپس لوٹا نہیں جاسکتا ہے۔ ہمیں یہاں سے آگے بڑھنا ہے۔ لہٰذا موجودہ عہد کی ضرورتوں اور چیلنجز کو دھیان میں رکھ کر اپنی تعلیمات اور اقدار کی ایسی تدوین و تفہیم کرنے کی ضرورت ہے جو ہماری شرعی حرمت، تہذیبی خصوصیت، اخلاقی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ حافظ ناموس زن، مرد آزماد، مرد آفریں معاشرے کی تعمیر میں مددگار ہو تاکہ ہم دنیا کی قوموں میں ترقی کے دور میں پیچھے نہ رہ جائیں بلکہ اپنے اقدار، افکار اور روایات کے ساتھ اپنا مخصوص مقام بنانے میں کامیاب ہوں۔

اس وقت یہ اور ایسے بیشتر مسائل ہیں جو اجتہاد کے طالب ہیں۔ اگر ہمارے علماء فقہا قوم کی رہنمائی سے قاصر ہوں گے اور قوم مسلمہ اسلامی اقدار کو پامال کرکے آگے بڑھے گی اور اس کی ذمہ داری زعمائے ملت پر ہوگی نہ کہ عوام پر۔ لہٰذا یہ ہمارے لیے اجتماعی غور وفکر کا وقت ہے، ہم محض فتوؤں سے اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتے ہیں۔ قوم کے سامنے قابل عمل حل پیش کرنا اس وقت قوم کو اجتماعی ارتداد سے بچانے کے لیے ضروری ہے۔

میں نے عورتوں سے متعلق تمام امور کو صرف مذہبی اور شرعی نقطہ نظر سے دیکھنے کے بجائے صنفی عدل (Gender Justice)، صنفی مساوات (Gender Equality) اور عورتوں کے انسانی حقوق کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

شریعت نے عورتوں کے حقوق اور تحفظ کے باب میں جو احکامات دیے ہیں ان کا

از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور بدلتی ہوئی تمدنی ضرورتوں کے تحت اس کا اطلاق اور انطباق کیسے ہوگا اس پر سنجیدہ غور وفکر کی ضرورت ہے۔

اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ دو انتہاؤں کے درمیان بٹا ہوا ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو شریعت کی غیر حکیمانہ تعبیر کرتے ہیں اور لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو تمام اقدار کو چیلنج کرنے کے مدعی ہیں اور شریعت کو توڑ کر اور چھوڑ کر اپنی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ میری رائے میں یہ دونوں نقطہ نظر غلط ہیں۔ شریعت کا اطلاق انسانوں اور ایک جیتے جاگتے معاشرے پر ہوگا۔ اسلام اللہ کا دین ہے اور ہر ملک ہر عہد اور ہر طرح کے حالات کا دین ہے جو قیامت تک برپا ہوتے رہیں گے۔ لہٰذا ایسے کسی دائمی دین میں وقت، حالات اور مقام کے لحاظ سے ضروری لچک اس کو فطری اور قابل عمل بنائے رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ ورنہ اسلام کا حال بھی یورپ کی طرح ہوگا جہاں لوگ رسماً تو عیسائی ہیں مگر عملاً انھوں نے عیسائی شریعت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

اس وقت اسلام جس تہذیبی کشمکش کے دور سے گزر رہا ہے، وقت اور حالات کا تقاضہ ہے کہ اسلام کو ایک ایسے پروگریسیو دین کے طور پر برت کر دیکھائیں جہاں ایک طرف روح شریعت مجروح نہیں ہوتی ہے اور دوسری طرف انسانی حقوق خاص طور سے ان طبقات کے حقوق جو کمزور اور پس ماندہ ہیں محفوظ اور مستحکم طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ یہ اس وقت تحقیق اور اجتہاد کا بڑا میدان ہے جس میں ہمارے علما، دانشور، قانون دان اور علوم عمرانیات کے ماہرین کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور ایک اچھا قابل عمل ماڈل دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔

■❖■

باب سوم

مسلمان معاشرے میں بزرگوں کے حقوق

مسلمان معاشرے میں بزرگوں کے حقوق

ہندوستان کا مسلم معاشرہ کوئی ہم رنگ اور یکساں (Homogenious) معاشرہ نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی دیگر مذہبی اورتمدنی اکائیوں کی طرح متنوع (Hetrogenious) سماج ہے جہاں آپ کو سب طرح کی مثالیں ملیں گی۔ مذہبی عقائد میں فرق کے باوجود ہندوستان کا سماجی اور تمدنی ڈھانچہ کم و بیش ایک جیسا ہے اور ان کے رسم و رواج میں مقامی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں جو ملک کے ہر حصہ اور خطے میں موجود ہیں۔ ہندوؤں کی غالب اکثریت ہے جبکہ مسلمان ملک کی سب سے بڑی اقلیت اور دوسری بڑی آبادی ہیں۔ بزرگوں کے ساتھ سلوک میں دونوں قوموں کے اندر کم وبیش ایک سی صورتحال نظر آتی ہے۔

ہندوستان معاشی اعتبار سے ایک ترقی پذیر ملک ہے جہاں غربت اور جہالت سب سہارن افریقی ممالک کے علاوہ دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔غربت اور جہالت نے اس ملک کے چہرے کو داغدار اور بدنما بنادیا ہے۔ اس کا اثر لوگوں کے اخلاق و کردار اور سماجی تعلقات پر پڑتا ہے۔ ہندوستان کے ہندو سماج کو اپر کاسٹ، اوبی سی، ای بی سی اور دلت اور آدی باسی خانوں میں بانٹا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلم سماج کو اشراف، اجلاف اور ارذال خانوں میں بانٹتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان اصلاً ہندی النسل ہیں، اس لیے مسلمان

چاہے جس خانے میں ہوں وہ یہاں کی اکثریتی آبادی کے مختلف طبقے سے نکل کر آئے ہیں اور ان کی تمدنی خصوصیات ان میں پائی جاتی ہیں۔

معاشی اعتبار سے ملک میں تفاوت سماجی تفاوت سے کہیں زیادہ ہے اور وہاں سینکڑوں لیئرس دیکھنے کو ملتے ہیں۔ امیروں کی بھی مختلف کیٹگری ہیں، اسی طرح مڈل کلاس میں بھی بہت سے درجات ہیں اور غریبوں کی بھی متعدد درجہ بندی ہے۔ کہنے کی غرض یہ ہے کہ جس طبقے کی جو سماجی، تمدنی، تعلیمی اور معاشی صورتحال ہے اکا دکا مستثنیات کو چھوڑ کر اس کا سماجی، تمدنی اور اخلاقی رویہ کم وبیش ایک جیسا ہوتا ہے۔

بھارت گاؤں کا دیش ہے اور 70 فیصد آبادی گاؤں میں رہتی ہے۔ گاؤں میں رہنے والی کل آبادی میں ستر اسی فیصد آبادی غریب ہے۔ یعنی ان کے پاس آمدنی کا کوئی مستقل اور معقول ذریعہ نہیں ہے۔ رہنے کے لیے قاعدے کا گھر بھی نہیں ہے۔ جہاں وہ بنیادی سہولتوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے اہل ہوں۔ تعلیم یا تو نہیں ہے یا بہت کم ہے۔ اس لیے گھٹن اور چبھن ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ اس صورتحال میں جو لوگ بوڑھے، معذور اور بے سہارا ہیں ان کی زندگی بہت دکھ تکلیف میں گزرتی ہے اور ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ گاؤں میں انسانی حقوق کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا اس لیے لوگ اس کی پامالی پر سوال بھی نہیں اٹھاتے۔

شہروں کی صورتحال گاؤں سے تھوڑی مختلف ہے۔ یہاں گاؤں کے مقابلے معاشی عمل تھوڑا تیز ہوتا ہے اس لیے روزگار اور آمدنی کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کروڑوں لوگ گاؤں سے روزگار کی تلاش میں ہجرت کر کے شہروں میں آتے ہیں اور جھگی جھونپڑیوں، سڑک کے کنارے، ریلوے لائن کے کنارے یا سڑک کے ڈیوائڈر پر زندگی گزارتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے انسانی بنیادی اور شہری حقوق کی بات کرنا ان کے ساتھ کیا جانے والا بھدا مذاق مانا جائے گا۔ صاحب وسائل لوگ ان سے ہمدردی رکھنے کے بجائے ان کا استحصال کرتے ہیں اور ان سے بدسلوکی کرتے ہیں اور یہ تمام تر ذلت اور تکلیف سہنے

کے باوجود گاؤں اس لیے نہیں لوٹتے کہ وہاں ان کو اتنی بھی سہولت میسر نہیں ہے اور نہ دو وقت کی روٹی کی ضمانت ہے۔ لٰہذا ان کے لیے اخلاق، مذہب اور قانون اس خوبصورت عمارت کی طرح ہیں جس کو وہ دور سے دیکھ سکتے ہیں اس میں داخل نہیں ہوسکتے۔ ایسے کسی سماج اور معاشرے میں بزرگ، معذور، یتیم، بیوہ، مسکین، بیمار، محروم کی صورتحال کیا ہے۔ اس باب میں اس کا جائزہ لیں گے۔

■❖■

بزرگوں کے حقوق اور ان کی صورتحال

2011ء کی مردم شماری کے مطابق بھارت میں 60 سال اور اس سے زائد لوگوں کی کل تعداد 8 اور 10 فیصد کے درمیان ہے جو مجموعی تعداد کے اعتبار سے دس کروڑ سے اوپر ہے۔ 2025ء تک یہ تعداد 18 فیصد ہوجائے گی ایسا اندازہ ہے۔ گزشتہ پچاس سال میں بھارت کی آبادی میں تین گنا اضافہ ہوا ہے، جبکہ بزرگوں کی آبادی میں چار گنا اضافہ ہوا ہے۔ دنیا کے دیگر ملکوں میں بزرگوں کی آبادی میں سو سال میں دوگونا اضافہ ہوا ہے، جبکہ ہندوستان میں 20 گنا اضافہ ہوچکا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں عام طور پر اوسط مدت عمر (Life Expectancy) ستر سال ہوچکی ہے۔

مسلمانوں میں 60 سال سے زائد عمر کے لوگ کتنے ہیں اس کے اعداد وشمار الگ سے موجود نہیں ہیں۔ مسلمان ملک کی کل آبادی کا 13.8% ہے جن کی مجموعی تعداد 18 کروڑ ہے۔ ملکی اوسط کے لحاظ سے ایک اندازے کے مطابق مسلمانوں میں 60 سال سے زائد عمر والوں کی تعداد 2 کروڑ کے آس پاس ہوگی۔

ملک میں 78 فیصد بزرگ دیہاتی علاقوں میں رہتے ہیں اور 22 فیصد شہری علاقوں میں آباد ہیں۔ 1996 کی درمیانی مردم شماری کے جائزے کے مطابق ایک ہزار بزرگ مرد پر 928 بزرگ خواتین تھیں۔ جبکہ 2016 میں یہ فرق بڑھ گیا۔ 1031 بزرگ مردوں کے مقابلے بزرگ خواتین کی تعداد 935 تھی۔ ایسے بزرگ جو منحصر (Dependant) رہنے والے ہیں ان کی تعداد میں شہری اور دیہی دونوں علاقوں میں اصافہ ہورہا ہے۔ بزرگوں کی کل آبادی میں 50 فیصد ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں یعنی میاں بیوی دونوں حیات سے ہیں

64% بیوائیں ہیں اور 19 فیصد رنڈوا ہیں۔ 70 سال سے زائد عمر میں 80 فیصد بیوائیں جبکہ 27 فیصد رنڈوا ہیں۔

عورتوں کے مقابلے مرد بڑی عمر میں اگر وہ بیمار اور معذور نہ ہوں تو معاشی جدوجہد میں مشغول رہتے ہیں۔ 1991 کی مردم شماری کے مطابق 60 فیصد مرد کامگار تھے جبکہ صرف 11% خواتین کام کرتی ہیں۔ ساٹھ سال سے زائد عمر کے کام کرنے والوں میں 78% مرد اور 84% عورتیں کھیتی باڑی کے کام میں مشغول تھیں۔ خواتین کی مالی حالت کا سیدھا تعلق ان کی شادی شدہ زندگی سے ہے۔ لہٰذا جو خواتین بیوہ ہیں وہ معاشی طور پر زیادہ غریب ہیں۔

ہندوستان میں غربت عام ہے۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ملک میں 35 فیصد لوگ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارتے ہیں۔ ہندوستان کی وزارت انصاف اور امپاورمنٹ نے اس اعداد وشمار کو مانتے ہوئے اندازہ لگایا ہے کہ 60 سال سے زائد عمر کے لوگوں میں ایک تہائی غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں یعنی اگر ان کی مجموعی تعداد دس کروڑ ہے تو 3.5 کروڑ بزرگ غریبی کی سطح سے نیچے یعنی بے حد غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

اعداد وشمار یہ بھی بتاتے ہیں کہ 50 فیصد بزرگ پوری طرح دوسروں پر منحصر ہیں جبکہ 20% جزوی انحصار کرتے ہیں اور کم و بیش 20 فیصد کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ شہروں کے بالمقابل دیہاتوں میں جہاں نسبتاً آمدنی کم ہوتی ہے بزرگوں کی زندگی کافی تکلیف اور پریشانی میں گزرتی ہے۔

ملک میں 90% لوگ غیر منظّم شعبوں (Unorganised Sectors) میں کام کرتے ہیں، وہاں کوئی پنشن یا سماجی تحفظ کی کوئی اسکیم نہیں ہوتی۔ لہٰذا بڑھاپے میں ان کی زندگی بہت تلخ ہوتی ہے۔

طویل عمری کئی طرح کے مسائل بھی سامنے لاتی ہے، مثلاً معاشی تنگی، بیماری، دوسروں پر انحصار، اکیلاپن، اپنوں کی بے مہری و بے رخی بلکہ برا سلوک، مجبوری اور مایوسی جس کی وجہ سے کبھی کبھی وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے

بزرگ ڈپریشن، انزائی مر، سیزوفرینیا اور ڈمنیشیا وغیرہ کے شکار ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا بڑھاپے میں اولاد، خاندان، سماج اور ریاست کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ کچھ بزرگ لاولد ہوتے ہیں اور ان کا کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہیں ہوتا ہے۔

بچے اگر ناکامیاب ہوں تب بھی مسئلہ ہوتے ہیں اور کامیاب ہوں تب بھی مسئلہ ہوتے ہیں۔ ناکامیاب ہونے کی صورت میں وہ اپنی کفالت کے لیے اپنے بوڑھے والدین پر منحصر ہوتے ہیں جس سے ان کی بنیادی ضرورتیں پوری نہیں ہوتی ہیں گھر میں عموماً تناؤ اور دباؤ کا ماحول بنا رہتا ہے۔

بچے اگر کامیاب ہیں تو بڑے شہروں میں رہتے ہیں یا ملک کے باہر چلے جاتے ہیں۔ بڑے شہر میں گھر چھوٹے اور مہنگے ہوتے ہیں جہاں میاں بیوی اور بچے کے علاوہ کسی اور کی گنجائش نکالنی مشکل ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے والدین اکثر اپنے بچوں سے دور رہتے ہیں۔ اگر وہ کارپوریٹ سیکٹر میں کام کررہے ہیں تو ان کی فرصت کم ملتی ہے۔ لہٰذا خوشی، غمی، عیدتہوار میں بھی ان کا آنا مشکل ہوتا ہے۔ اور اگر وہ ملک سے باہر ہیں تو پھر دو سال چار سال پر ملاقات ہوسکتی ہے۔

شہری اور دیہاتی زندگی میں جو تمدنی فرق ہے، اس صورت میں پرانی نسل کا نئی نسل کے لوگوں سے اگر وہ کم تعلیم یافتہ ہوں تو ذہنی اور تمدنی ارتباط نہیں ہوتا۔ اس لیے ایک خاموش ناپسندیدگی ماحول میں موجود رہتی ہے۔ اگر قیام تھوڑا زیادہ وقتوں کے لیے ہوجائے تو گھر میں ناگوار صورتحال پیدا ہونے لگتی ہے جو طعن تشنیع سے آگے چل کر بے عزتی تک پہنچتی ہے۔ خاص طور سے ساس کے ساتھ سلوک اچھا نہیں ہوتا۔ جن بزرگوں کا اپنا گھر ٹھکانا نہیں ہوتا انہیں مجبوراً ذلت کی زندگی گزارنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے اور جن کا گھر ٹھکانا ہے اور آمدنی کی کوئی صورت ہے وہ اپنے مقام پر لوٹنا زیادہ پسند کرتے ہیں بلکہ لوٹ آتے ہیں۔

■❖■

بزرگوں کے ساتھ بدسلوکی

آج کے دور میں ٹوٹتے بکھرتے خاندانی نظام، اقدار سے خالی معاشرت اور حد سے بڑھی ہوئی خودغرضی نے بزرگوں کے سامنے بے شمار مسائل کھڑے کردیے ہیں اور ان سے بے اعتنائی اور لاپرواہی کے ساتھ بدسلوکی کی شکایت عام ہوگئی ہے۔ موجودہ عہد کے دانشوروں، پالیسی ساز اداروں، ماہرین قانون اور رفاہی اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے بزرگوں کے ساتھ بدسلوکی اور ان کے حقوق کی پامالی کو مندرجہ ذیل خانوں میں بانٹ کر اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ اس کو پیش کیا جاتا ہے جس سے مسئلے کی نوعیت، سنگینی اور مختلف جہتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(1) جسمانی ایذا

بزرگوں کے ساتھ بدسلوکی کی یہ عام مثال ہے۔ بہت سے بدبخت ایسے ہیں جو اپنے بوڑھے ماں باپ، دادا، دادی، نانا، نانی اور دیگر بزرگ رشتہ دار جو ان کے ساتھ رہتے ہیں یا کسی درجہ میں جن کا ان پر انحصار ہے، وہ ان کو جسمانی طور پر ایذا پہنچانے سے باز نہیں آتے۔ جسمانی طور پر ایذا کی مختلف قسمیں ہوسکتی ہیں جیسے ان کو اتنا کس کر پکڑنا جس سے ان کے ہاتھ میں یا جس مقام پر پکڑا گیا ہے، وہاں انگلیوں کے نشان ابھر آئیں جو ان کے لیے تکلیف دہ ہو۔ یا پھر ان کو تھپڑ مارنا، پیٹنا، دھکا دینا، جلانا، زور سے پکڑ کر ہلانا،

مارنے کی دھمکی دینا، یا ان سے جبراً کوئی کام کرانا یا کسی کام کو کرنے سے روکنا وغیرہ۔ کچھ دانشوروں نے ان کو دوا کے ذریعہ مسلسل عالم غنودگی میں رکھنا یا ان کو دواؤں سے محروم رکھنا، ان کا دوا علاج نہ کرنا، وقت پر ان کو دوا نہ دینا وغیرہ کو بھی جسمانی ایذا میں شمار کیا ہے۔ جسمانی ایذا کے اثرات مختلف طرح سے سامنے آتے ہیں مثلاً جسم پر مارنے پیٹنے کے نشان یا جلانے کے نشان یا فریکچر، ہاتھ پاؤں باندھنے، چھل جانے، بال گرنے، موچ آنے، کھروچ لگنے یا زخمی ہونے سے لگایا جاسکتا ہے۔

ہم جس سماج میں رہتے ہیں وہاں غربت اور جہالت کے سبب ہماری بڑی آبادی تہذیبی پسماندگی کا شکار ہے۔ لہٰذا وہ جانتے ہی نہیں ہیں کہ ماں باپ یا دیگر بزرگوں کا احترام کیا ہے اور ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟ گھر میں چھوٹی چھوٹی بات پر گالی گلوج اور لڑائی جھگڑا ایک عام سی بات ہے جس میں بوڑھے ماں باپ کے ساتھ بدسلوکی اور مار پیٹ معمولی بات مانی جاتی ہے جس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ پچھڑی اور پسماندہ ذاتوں میں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان بزرگوں کے ساتھ بدسلوکی اور جسمانی ایذا عام بات ہے۔ اس طبقہ کے بہت سے لوگ نشہ کرتے ہیں اور نشہ کی حالت میں گھر کی عورتوں کو مارنا پیٹنااور والدین کو زدوکوب کرنا چلتا رہتا ہے۔ چھوٹے بچے بچپن سے یہ چیز دیکھتے رہتے ہیں، لہٰذا بڑے ہوکر وہ بھی اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

لیکن والدین کے ساتھ بدسلوکی اور ایذا رسانی صرف غریب اور پسماندہ ذاتوں تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر سماجی گروپ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے پڑھے لکھے اور خوشحال خاندانوں بلکہ بعض نام نہاد مہذب اور با عزت گھروں میں بزرگوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے اور ان کو مارتے پیٹتے دیکھا ہے۔ یہ صورتحال شہروں اور دیہاتوں دو جگہ ہے۔ شہروں میں بدسلوکی کا انداز تھوڑا مختلف ہے جبکہ دیہاتوں میں یہ بالکل بھدے ڈھنگ سے برسرعام ہوتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ پونیتا گوئل اور سواتی گپتا نے 2016 میں اپنا تحقیقی مقالہ ''بزرگوں کے ساتھ گھریلو تشدد – بھارت کے

حالات کا ایک مطالعہ' شائع کرایا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق 77 فیصد بزرگ لوگ اپنے خاندان کے ساتھ رہتے ہیں۔ 14 فیصد میاں بیوی ایک ساتھ رہتے ہیں۔ 7 فیصد تنہا رہتے ہیں اور 2 فیصد اپنے دیگر رشتہ داروں کے ساتھ رہتے ہیں۔ 2015 کے اعداد وشمار کے مطابق 44 فیصد بزرگ جن کے ساتھ بدسلوکی ہوتی ہے اپنے اکلوتے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہتے ہیں۔ 25.1 فیصد اپنے بیٹے اور بیٹی کے خاندان کے ساتھ رہتے ہیں۔ 9.9 فیصد اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ رہتے ہیں اور 8.9 فیصد ایک بڑے مشترکہ خاندان میں رہتے ہیں۔ 7 فیصد اپنے جوڑے کے ساتھ یا اکیلے رہتے ہیں اور 2.3 فیصد یا تو بیٹے کے ساتھ رہتے ہیں یا بیٹی کے ساتھ۔ 2.3 فیصد بزرگوں کی رہائشی صورتحال کا تعین نہیں ہوسکا۔

قومی سطح پر یہ پایا گیا ہے کہ 50 فیصد بزرگ کے ساتھ ذاتی طور پر برا ہوتا ہے، جبکہ 83 فیصد بزرگوں نے بتایا کہ بزرگوں کے ساتھ برا سلوک سماج کا عام چلن ہے یعنی کسی نہ کسی درجہ میں تمام بزرگوں کو اس صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ 72 فیصد بزرگ جن کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے وہ 69-60 سال کی عمر کے ہوتے ہیں اور 25 فیصد 79-70 سال کے ہوتے ہیں۔ 3 فیصد وہ ہیں جن کی عمر 80 سال سے اوپر ہے۔ 53 فیصد بزرگ خواتین برے سلوک کی شکار ہوتی ہیں جبکہ مردوں کا تناسب 48 فیصد ہے۔ برے سلوک کی وجوہات جذباتی غیر ہم آہنگی، معاشی انحصار اور تال میل میں کمی ہیں۔ اس کے علاوہ زمین جائیداد کا جھگڑا، رویہ اور رشتہ سے جڑے معاملات، وقت اور تحمل کی کمی، بیماری اور نشہ کی لت۔ یہ سارے وجوہات مل کر بزرگوں کے لیے حالات انتہائی خراب بنادیتے ہیں۔ تحقیق کے دوران 40 فیصد سے زیادہ بزرگوں نے اپنی اور اپنے خاندان کی عزت کی خاطر برے سلوک کے بارے میں گفتگو کرنے سے انکار کردیا اور جن لوگوں نے اس کا اظہار کیا بھی تو رازداری برتنے کی درخواست کی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتنا حساس معاملہ ہے۔ 41 فیصد لوگوں نے بدتمیزی کی شکایت کی، 33 فیصد نے بے عزتی کرنے کی شکایت کی اور 29 فیصد نے لاپرواہی برتنے کی شکایت کی۔ 61 فیصد نے بہوؤں کے ذریعہ کی جانے والی

بدسلوکی کا ذکر کیا جبکہ 59 فیصد نے بیٹوں کے ذریعہ برا برتاؤ کرنے کی شکایت کی۔ 7 فیصد نے بیٹیوں کی بدسلوکی کا رونا رویا تو 6 فیصد نے داماد کے برے برتاؤ کی بات کی اور 3 فیصد نے رشتہ داروں کے برے رویہ کی نشاندہی کی اور 3 فیصد لوگوں نے دیکھ بھال کرنے والے لوگ اورنوکروں کے برے برتاؤ کا ذکر کیا۔

یہ ایک مطالعہ ہے اور اس طرح کے اور مطالعات کیے گئے ہیں جو اس امر کو متحقق کرتے ہیں بزرگوں کے ساتھ برا سلوک ہندوستانی سماج (ہندو اور مسلم سماج) کی ناقابلِ تردید سچائی ہے اور بدلتے وقت کے ساتھ یہ ناسور بڑھتا اور پھیلتا جارہا ہے۔ رشتوں کی قدر و اہمیت اور اس کا احترام ختم ہوتا جارہا ہے۔ اس مسئلہ پر آگے کے حصے میں اور تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔ فی الوقت دیگر ایذا رسانیوں پر بھی ایک نگاہ ڈالتے چلنا بہتر ہوگا۔

(2) نفسیاتی ایذا

ایذا کی دوسری قسم نفسیاتی ایذا ہے۔ جسمانی ایذا کی طرح اس کے اثرات ظاہر و باہر نہیں ہوتے جس کو دور سے دیکھا یا پتا لگایا جاسکتا ہے مگر نفسیاتی ایذا کے اثرات اندر تک ایک انسان کے روح وقلب کو مجروح کردیتے ہیں اور وہ پوری طرح ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لیے نفسیاتی ایذا کے اثرات بسا اوقات جسمانی ایذا سے زیادہ سخت اور سنگین ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ نفسیاتی ایذا کی وجہ سے خودکشی اور کہیں بھاگ جانے کو ترجیح دیتے ہیں یا پھر اپنوں کی بے اعتنائی اور برے رویہ سے مجبور ہوکر کسی بزرگ پناہ گاہ جس کو ہندی میں وردھا آشرم یا انگریزی میں شیلٹر ہوم کہتے ہیں وہاں رہنا پسند کرتے ہیں تاکہ اپنوں کے ذلت آمیز رویہ سے بچتے ہوئے اپنی باقی زندگی گزار سکیں۔

نفسیاتی ایذا میں گالی گلوج، ترش روئی، بے عزتی، ڈرانا دھمکانا، خوف زدہ رکھنا، ان سے بات چیت نہ کرنا، ان کی سنی ان سنی کرنا، ان کی ان دیکھی کرنا، ان کو نظر انداز کرنا، ان کو اکیلا چھوڑ دینا جیسی چیزیں آتی ہیں۔ ان سب چیزوں کی وجہ سے بزرگوں میں ڈپریشن، بے چارگی، مجبور محض ہونے کا احساس، نیند نہ آنا، بھوک نہ لگنا ہر وقت خوف زدہ

رہنا اورغمگین اور اداس رہنا جیسی کیفیت اور علامات پیدا ہوتی ہیں۔

انسان کا نفسیاتی وجود اس کے داخلی وجود کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جیسے جیسے انسان کی جسمانی کمزوری بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے اس کے اندر بے چارگی کی کیفیت بھی بڑھتی ہے اور دوسروں پر انحصار بڑھنے لگتا ہے۔ اس میں عملاً کبھی ان کو اگر نفسیاتی ضرب سے دوچار ہونا پڑے تو ان کی کیفیت دردناک ہوجاتی ہے۔

مالی ایذا

یہ عام شکایت ہے کہ لوگ مختلف ذرائع سے بزرگوں کے مال و جائیداد کو ہڑپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کو قتل بھی کردیتے ہیں یا کرادیتے ہیں۔ ان کا سامان چرالینا، ان کے مال واسباب خاص طور سے زیورات اور نقد رقوم چھین لینا عام بات ہے۔ ان کے پنشن کی رقم ان سے لے لینا، ان کو بہلا پھسلا کر یا ڈرا دھمکا کر غلط طریقے سے اپنے وصیت نامہ لکھوالینا، یا ان کی جائداد اپنے نام لکھوا لینا جیسی شکایتیں عام ہیں۔ بزرگوں کی کمزور بینائی یا جسمانی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو ان کی جائداد یا آمدنی سے متعلق صحیح جانکاری نہ دینا یا اس کا کچھ حصہ ناجائز طور پر روک لینا مالی ایذا کی واضح مثالیں ہیں۔ میں نے یونیورسٹی سروس میں ایسے بہت سے پروفیسران کو دیکھا ہے جن کے بیٹے اور پوتے اپنے باپ اور دادا کے پنشن کی رقم بینک سے نکالتے وقت ہی ان سے چھین لیتے ہیں اور انہیں سو دو سو کی رقم تھما کر باقی پیسے اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں۔ جن لوگوں میں جوا شراب یا دیگر منشیات کی عادت لگی ہوئی ہے وہ چوری چکاری کے علاوہ زبردستی چھین چھان سے باز نہیں آتے۔ اس وقت پڑھے لکھے نوجوانوں میں بے کاری عام ہے لیکن ان کی ضرورتیں اور خواہشات بڑھی ہوتی ہیں۔ اس صورت میں وہ اپنی بنیادی ضرورتوں کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر طرح کی ضرورت کے لیے والدین پر منحصر ہوتے ہیں اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اپنے بوڑھے والدین پر اس حد تک دباؤ ڈالتے ہیں جو ایذا رسانی کی حد میں داخل ہوجاتا ہے۔ بوڑھا شخص اس پر کھل کر احتجاج بھی نہیں

کرتا کیونکہ بدسلوکی کا اندیشہ ہوتا ہے۔

عام طور پر لوگ ایسے بزرگوں کو گھر میں اس لیے برداشت کرتے ہیں کیونکہ انہیں پنشن اور دیگر سہولیات کی شکل میں رقم ملتی ہے جو بسا اوقات کمانے والوں کی آمدنی سے زیادہ ہوتی ہے مگر ان کی کمزوری سے یہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس لیے ان کو زندہ رکھنے اور اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ان کی عزت، خدمت، پاس و لحاظ اور ان کے حقوق کی پاسداری سے گریزاں ہوتے ہیں۔

بزرگوں کے پاس مال نہ ہو تب بھی آفت ہے اور مال ہو تب بھی آفت ہے۔ مال نہ ہونے کی صورت میں ان کو نظر انداز کرنے کی شکایت عام ہے۔ مال ہونے کی صورت میں وارثان کا سارا دھیان اس مال کی تقسیم پر ہوتا ہے اور اپنے حق سے زائد لینے کی حرص میں اخلاق و دیانت سب پامال ہوتی رہتی ہے اس کی وجہ سے بزرگوں کو ذہنی کوفت کے علاوہ جسمانی اذیت سے بھی دوچار ہونا ہوتا ہے۔ مالی اذیت کی یہ چند نمایاں مثالیں ہیں جو آپ کو ہندوستانی سماج (مسلم وغیر مسلم) میں دیکھنے کو ملیں گی۔

(4) نظر انداز کرنا

بزرگوں سے بے توجہی، ان کے ساتھ بے پروائی، ان کی ضروریات سے غفلت برتنا ان کے دوا علاج سے بے پرواہی، ان کو گندے ماحول میں رکھنا، ان کی صفائی ستھرائی اور حفظانِ صحت کے امور سے لاپرواہی برتنا، ان کی غذائیت میں کمی کرنا ان کو نظر انداز کرنے کی مثالیں ہیں۔

ان کے جسم میں زخم ہوجانا، پانی کی کمی ہونا، ان کو خطرناک حالت میں چھوڑ دینا، ان کی دیکھ ریکھ میں کمی کرنا یا ان کو کہیں چھوڑ دینا جیسا اکثر بیواؤں کے ساتھ ہوتا ہے۔ خاص طور سے ہندو سوسائٹی میں بیواؤں کو ان کے بہو بیٹے یا قریبی رشتہ دار کنبھ کے میلے یا گنگا اشنان کے موقع پر بنارس، برندابن اور متھرا وغیرہ مقامات پر لے جاتے ہیں اور ان کو چپکے سے چھوڑ کر واپس آجاتے ہیں۔

جب کسی کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو اس کے اندر سے یوں بھی جینے کا حوصلہ ختم ہوجاتا ہے، ان پر یاس وقنوطیت چھا جاتی ہے اور وہ موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگتے ہیں۔ اس طرح عالم کسمپرسی میں دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔

(5) سماجی ایذا

اذیت کی ایک شکل سماجی ایذا ہے۔ ماہرین سماجیات کی رو سے جب بزرگوں کو گھریلو اور سماجی اجتماعات اور تقریبات سے الگ تھلگ رکھا جاتا ہے، ان کو باہر جانے یا لوگوں سے ملنے جلنے سے روکا جاتا ہے، تو وہ خود کو بے کار محض اور بوجھ سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمارے یہاں خاص طور سے غیر مسلم سماج میں اور اس کی دیکھا دیکھی مسلم سماج میں بیوہ عورتوں کو شادی بیاہ کی تقریبات سے الگ تھلگ رکھا جاتا ہے۔ ان کو منحوس خیال کرتے ہوئے کوشش کی جاتی ہے کہ وہ دلہن کے آس پاس نہ آئیں یا ان سے دور رہیں۔ گرچہ تعلیم کے فروغ کے نتیجے میں اس طرح کے واقعات میں کمی آئی ہے تاہم ابھی بھی بعض توہم پرست گھرانوں میں یہ رواج بالخصوص دیہاتوں میں موجود ہے۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ تکلیف دہ صورتحال اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ بھرے پرے گھر میں ان کے ساتھ بدتمیزی اور بدسلوکی ہوتی ہے۔

(6) آفات ارضی وسماوی

آفات ارضی و سماوی کے وقت بزرگ، معذور، بیمار اور کمزور لوگوں پر زیادہ مصیبت آتی ہے۔ چونکہ وہ خود چل پھر نہیں سکتے اس لیے ان کو ایسے موقعوں پر بے سہار چھوڑنے کی شکایت عام ہے۔ سیلاب، قحط، زلزلہ اور جنگی و ہنگامی حالات میں ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی ہے۔

(7) جنسی ایذا

سماجی ماہرین نے بزرگوں کے ساتھ زیادتی کے باب میں جنسی ایذا کو بھی گنایا یہ۔ مغربی ملکوں میں ان کو جنسی طور پر پریشان کرنے کی شکایت بہت ہے، ہندوستان کے

غیرمسلم اور مسلم معاشرے میں اس قسم کی شکایت کتنی ہے اس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا گیا ہے تاہم اس کے امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح سے یہ چند ظاہر و باہر علامات ہیں جن کے ذریعہ بزرگوں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس مطالعہ سے یہ ایک بات واضح ہے کہ ہندوستان کے مسلم اور غیر مسلم سماج میں بزرگوں کے ساتھ زیادتی واضح ہے جس پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم دونوں سماج میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلم سماج میں بالخصوص تین دائرے ہیں پہل کر کے اس مسئلہ پر قابو پانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

(1) بزرگوں کے باب میں اسلامی تعلیمات کو عام کر کے سماجی بیداری اور شعور پیدا کر کے ان کے ساتھ کی جانے والی بدسلوکی اور بے اعتنائی پر روک۔

(2) ایسے سماجی ادارے کا قیام جہاں انہیں تحفظ اور کفالت مہیا کرائی جائے۔

(3) سرکار کی جانب سے اس باب میں جو قوانین بنائے گئے ہیں اور جو ادارے قائم کیے گئے ہیں نیز سماجی تحفظ کا جو نظام بنایا گیا ہے ان کی واقفیت عام لوگوں تک پہنچانا اور ان سے ہونے والے فائدے کو متحقق کرانا۔

■❖■

اسلام میں بزرگوں کے حقوق

اسلام کی تعریف اگر دولفظوں میں بیان کی جائے تو اسلام حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری کا نام ہے۔ حقوق اللہ کا مطلب ہے اللہ کو ایک ماننا اور اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، صرف اور صرف اسی کی عبادت کرنا، جبکہ زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات حقوق العباد سے عبارت ہیں جن میں انسان اور انسان کے علاوہ تمام مخلوقات شامل ہیں۔

ویسے تو دنیا کے تمام انسان ایک خدا کے بندے اور ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اس لحاظ سے سب بھائی بھائی اور سب برابر ہیں اور سب کے ساتھ انصاف اور اخلاق سے پیش آنا ایک انسان اور ایک مسلمان کا فرض ہے۔ مگر دنیا کے تمام انسان رشتوں میں بندھے ہیں۔ لہٰذا رشتہ میں جو جتنا قریب ہے، اس کا حق زیادہ ہے اور جو جتنا دور ہے اس کا حق اسی ترتیب سے کم ہے۔ انسانی رشتوں میں جن لوگوں کا دودھ اور خون کا رشتہ ہے ان کا حق زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں بھی جن کا رحم و دودھ کا رشتہ ہے اس کا حق زیادہ ہے۔ اسی ترتیب سے حقوق متعین کیے گئے ہیں تاکہ پورے سماج کی صحت مند اور متوازن ارتقاء ہو سکے اور لوگ حد درجہ خودغرضی اور بخالت سے بچتے ہوئے ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کے لیے کوشاں اور مستعد رہیں۔ انسان کی ساخت اور حاجات ایسی بنائی گئی ہیں کہ

ایک صحت مند، با اختیار اور صاحب وسائل انسان بھی ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کے بغیر اپنا کام نہیں کرسکتا۔ اس طرح پوری انسانی دنیا باہمی انحصارات (Interdepence) پر قائم ہے۔ خودکفالت کا نظریہ ایک محدود تصور ہے جو انحصارات کا نظریہ ایک عالمی اور ہمہ گیر نظریہ ہے۔

ڈارون کی تھیوری تنازع للبقاء(Survical of the Fittest) کی بات کرتی ہے ممکن ہے یہ اصول حیوانات کی دنیا (Animal Kingdom) میں یا خالص مادی اداروں میں (Purely Materialistic Insttitution) جہاں گلاکٹ مسابقت (Cut Throat Competion) ہوتا ہے وہاں رائج ہو اور لوگ اس کے تحت عمل کرتے ہوں۔ مگر یہ نظام خاندان اور سماج میں لاگو نہیں ہوتا۔ کسی بھی سماج کو چلانے کے لیے اس کو انسانی، اخلاق اور قانونی ضابطوں کا پابند بنایا جاتا ہے تاکہ سماج میں جو لوگ کمزور ہیں، معذور ہیں، بے کار ہیں یا بعض وجوہات سے صحت مند مسابقت میں حصہ لینے کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں انہیں بھی عزت نفس کے ساتھ جینے کا حق حاصل ہوا اور سماج کا متناسب ارتقا اور ترقی میں وہ بھی اپنا کردار پیش کرسکیں۔ اس لیے اسلام انسان کو خالص حیوانی اور مادی وجود نہیں مانتا ہے بلکہ وہ اس کو ایک سماجی اور اخلاقی وجود بھی مانتا ہے اور ہر شخص پر فرداً فرداً اور ہر خاندان اور گروہ پر اجمالاً بعض اخلاقی ضوابط کا پابند کرتا ہے۔ ایک مہذب اور انسانیت نواز معاشرے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ معاشرہ اپنے بزرگوں اور دیگر کمزور افراد کے معاملے میں کیا رویہ رکھتا ہے اور ان سے کس طرح پیش آتا ہے۔ اسلامی تعلیمات اس باب میں بہت حساس ہے اور اس نے واضح ہدایات دی ہیں، جس کی روشنی میں اگر معاشرے کی تعلیم وتربیت کی جائے تو ایک دلنواز خبر گیری (Caring) کرنے والا معاشرہ بنایا جاسکتا ہے۔

اسلامی معاشرہ کا سب سے خوبصورت پہلو یہ ہے کہ ہر کسی کے ساتھ رحم ومروت کا معاملہ ہوتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والاتم پر رحم کرے گا۔ (الجامع الصغیر رواہ ابن مسعود) اللہ کے رسولؐ نے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ''وہ شخص ہم میں

سے نہیں ہے جو بڑوں کی عزت نہ کرے اور جو چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش نہ آئے۔ (الجامع الصغیر رواہ عبداللہ بن عمرو) اس طرح اسلامی معاشرہ رحم، عزت اور شفقت کی خمیر سے بنا ہوا معاشرہ ہوتا ہے اور یہ صرف مسلمانوں کے لیے ہی مخصوص نہیں ہوتا بلکہ تمام انسانوں اور مخلوقات کے ساتھ یہی رویہ رہتا ہے اور رہنا چاہیے۔

انسان پیدا تو تنہا ہوتا ہے لیکن وہ رشتوں اور تعلقات میں بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اور انہی رشتوں سے گھر اور خاندان بنتا ہے اور اسی کے ذریعہ قرابت کے حقوق طے ہوتے ہیں۔ پہلا حق تو ہر انسان پر اس کا اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا ہوتا ہے اس کے بعد اس کے والدین، بھائی بند اور دیگر رشتہ داروں کا ہوتا ہے۔ بھائی بند کے علاوہ جو بزرگ رشتہ دار ہوتے ہیں ان میں ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی، ساس سسر، ماموں ممانی، پھوپھا پھوپھی، خالو خالہ، وغیرہ آتے ہیں، اسکے بعد دیگر رشتہ دار اور تعلق کے لوگ آتے ہیں۔ ویسے تو ایک مسلمان کا تعلق تمام انسانوں اور پوری کائنات سے ہوتا ہے لیکن جو رشتہ اور قرابت میں جتنا قریب ہے اس کا حق فطری، اصولی، اخلاقی اور قانونی طور پر اتنا ہی زیادہ رکھا گیا ہے۔

بزرگ کی تعریف میں وہ تمام لوگ آتے ہیں جو رشتہ، عمر اور رتبہ میں بڑے ہیں۔ ان کا احترام کرنا، ان کی عزت کرنا واجب ہے الاَّ یہ کہ وہ کسی ایسی بات کا حکم دیں جو شرعاً غلط ہے، اس وقت ان کی بات نہ سننی ہے اور نہ ماننی ہے۔ یہ بات تصور احترام کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اسلام کا اصل الاصول ہے کہ خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی فرمانبرداری جائز نہیں ہے۔ ان کے ساتھ عزت کے ساتھ اختلاف (Difference with Respect) یہ اسلام کی اسپرٹ ہے، لیکن اس اختلاف کے باوجود ان کے حقوق ادا کیے جائیں گے۔

دوسری چیز کفالت اور خبر گیری ۔ خاندان میں جو بزرگ اپنی کفالت خود نہیں کر سکتے یا ان کو خبر گیری کی ضرورت ہے جو ان کے قریب ترین رشتہ دار ہیں ان پر ان کی کفالت اور خبر گیری واجب ہے۔ مثلاً ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی، ساس سسر ایسے لوگ اگر اپنی کفالت خود کرنے سے معذور ہوں تو بیٹے بیٹی، ناتی پوتے، یا بیٹی داماد پر ان کی

کفالت اور خبر گیری واجب ہے۔ یہ ایک ایسا دینی فریضہ ہے جس سے کوئی کسی حال میں روگردانی نہیں کرسکتا ہے۔

اسی طرح تیسری چیز خدمت ہے۔ اگر ہمارے خاندان میں ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی، ساس سسر بیمار اور معذور ہوں اور خود اپنی ضروریات پوری کرنے یا اپنا دوا علاج کرانے کے اہل نہ ہوں تو ان کی خدمت کرنا بھی واجب ہے۔ اس طرح ان کی عزت، کفالت، خدمت اور خبر گیری احترام کے مفہوم میں شامل ہے۔ ان اصولی باتوں کی روشنی میں ہم قرآن و حدیث میں بزرگوں کے باب میں دی گئی واضح تعلیمات پر ایک نظر ڈالتے چلیں تو اس سے پوری بات واضح ہوجائے گی اور عوامی تعلیم و تربیت نیز بے داری کے بارے میں واضح خطوط کار سامنے آجائیں گے۔

■❖■

مسلم سوسائٹی اور سینئر سٹیزن

اسلام نے جو Social Code (سماجی ضابطہ) فراہم کیا ہے اس میں پہلے نمبر پر تقویٰ، علم اور عقل و تدبر جیسی اخلاقی خوبیوں کو شرف کا معیار قرار دیا ہے۔ دوسرے درجے میں رشتہ اور عمر کو محترم مانا ہے اور اس بنیاد پر جو بڑا ہے اسے بڑا تسلیم کیا ہے۔ عہدہ اور دولت اسلام کی نظر میں شرف کا کوئی ایسا مسلمہ معیار نہیں ہے جس کا لازمی احترام کیا جائے، اگر یہ چیزیں تقویٰ کے ساتھ ہیں تو قابلِ احترام ہیں ورنہ اسلام کی نظر میں یہ اپنے آپ میں فتنہ ہیں جس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

اسلام حفظِ مراتب اور فرقِ مراتب کا قائل ہے اور اس نے عقیدے اور سماجی و اخلاقی ضابطے کے لحاظ سے (Faith, Social And Moral Code) ایک Hierarchy بنائی ہے اور اسی لحاظ سے وہ سماج میں تمام چیزوں کی حیثیت متعین کرتا ہے۔ جیسا اوپر عرض کیا گیا اسلامی سماج میں سب سے پہلا مقام اللہ وحدہ لا شریک کا ہے جس کی عبادت و اطاعت بے چوں و چرا تمام مسلمانوں پر ہر حال میں ہر وقت ہر جگہ معاملہ میں فرض ہے۔ دوسرا حق اللہ کے رسول ﷺ کا ہے جن کی محبت، اطاعت اور احترام تمام مسلمانوں کو اپنی جان، مال، اپنے ماں باپ اور اولاد سے بھی زیادہ کرنا ضروری ہے۔ رسولؐ جو دیں اسے لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔ یعنی رسول ﷺ مسلمانوں کے دائمی

ہادی اور رہبر ہیں اور ان کی پیروی، ان کا اتباع ، ان کا احترام اور ان سے حد درجہ محبت مسلمان ہونے کے لیے لازمی ہے۔

اللہ اور اس کے رسولﷺ کے بعد اس مادی کائنات میں سب سے بڑا حق ماں باپ کا ہے، اور یہ یہ حق کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا پھر اس کے بعد رشتے میں جو علی الترتیب قریب ہے اور بڑا ہے ان سبھوں کا حق عائد ہوتا ہے۔ اس وقت ملک میں جو عمر رسیدہ (Senior Citizen) لوگوں کا قانون نافذ ہے اس میں عمر کو معیار بنایا گیا ہے یعنی ایک شخص ساٹھ سال یا اس سے زائد عمر کا ہے، تو اسے عمر رسیدہ یعنی Senior Citizen مانا جائے گا۔ اسلام Seniority کو صرف عمر سے جوڑ کر نہیں دیکھتا بلکہ رشتہ میں وہ کسی مقام پر ہے اس کو دیکھتا ہے۔ ماں باپ چاہے ان کی عمر ساٹھ سال سے کم ہو وہ Senior Citizen کی تعریف میں آئیں گے جن کی خبر گیری ضروری ہے۔ پھر اسی طرح سے جو لوگ رشتہ میں قریب اور سینئر ہیں مثلاً دادا دادی، نانا نانی، چچا چچی، ماموں، خالو، پھوپھا،ممانی، خالہ، پھوپھی، بھائی بھابی وغیرہ اگر وہ مدد کے مستحق ہیں تو انہیں Senior Citizen مان کر ان کا حق ادا کیا جائے گا، چاہے ان کی عمر جو بھی ہو۔ لہٰذا اسلام نے رشتہ اور عمر دونوں کو کفالت کی بنیاد مانا ہے۔ اور ان کو Categorise کر کے تمام کے حقوق کو قربت اور وسعت کی بنیاد پر انفرادی اور اجتماعی دونوں طرف سے فراہم کرانے کا اہتمام کیا ہے۔اسلام کا کلچر احسان اور انصاف ہے اور تعاون و اشتراک (Sharing & Caring) اس کی تہذیبی خصوصیات ہیں۔

اب ہم مسلم سماج میں بڑے بزرگوں کی رشتہ اور قربت کی بنیاد پر جو متعین حقوق ہیں ان کا جائزہ لیں گے۔

انسانی سماج یا خاندان میں یا تو کوئی آپ سے عمر میں بڑا ہوگا یا پھر عمر اور رشتے میں چھوٹا ہوگا۔ لہٰذا اسلامی سماج کا ایک رہنما اصول یہ ہے کہ جو لوگ عمر اور رشتے میں بڑے ہیں ان کی عزت کی جائے اور جو لوگ عمر اور رشتے میں چھوٹے ہیں ان سے شفقت کا معاملہ کیا جائے۔ اس ضمن میں اللہ کے رسولؐ کی واضح ہدایت و تنبیہ یہ ہے کہ ”وہ شخص ہم میں

سے نہیں ہے جو اپنے بڑوں کی عزت نہ کرے اور جو اپنے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے۔''

اس طرح بڑوں کی عزت کرنا، ان سے احترام سے پیش آنا، اسلامی معاشرے کا رکن بننے کے لیے ضروری ہے ورنہ اس کا شمار محمد رسول اللہﷺ کے ماننے والوں میں نہیں ہوگا۔ یہ ہدایت و تنبیہ اسلامی معاشرے میں اس ستون کی طرح ہے جو پورے معاشرتی ڈھانچے کو نہ صرف منہدم ہونے سے بچاتا ہے بلکہ اس کو استحکام عطا کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔

ماں باپ کے حقوق

اسلام کی رو سے انسان کے طبعی رشتوں میں سب سے پہلا اور سب سے اونچا مقام ماں باپ کا ہے۔ اللہ نے ماں باپ کا حق پہچاننے بلکہ ان کا شکر بجالانے کی خود تاکید کی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

> ''دراصل ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا اور اس کا دودھ چھوٹنے میں دو سال لگے۔ (اس لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کرو اور اپنے والدین کا شکر بجالاؤ، میری ہی طرف تمہیں پلٹنا ہے، لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا۔'' (لقمان: 15-14)

ان آیتوں کے استحضار سے جو اصولی ہدایتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(1) والدین کا حق پہچاننے کی خود اللہ نے تاکید کی ہے۔

(2) باپ کے مقابلے ماں کا مرتبہ زیادہ ہے کیونکہ استقرار حمل اور رضاعت ماں کے

ذریعہ ہی ہوتی ہے۔

(3) خدا کے شکر کی تکمیل نہیں ہوسکتی جب تک کہ والدین کا شکر نہ ادا کیا جائے کیونکہ والدین طبعی کائنات میں مظہر ربوبیت کی سب سے بڑی نشانی ہیں۔

(4) والدین کا عقیدہ اولاد کے عقیدے سے مختلف ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں ان کے غلط عقیدے کی پابندی نہیں کرنی ہے، تاہم والدین اگر بے دین یعنی مشرک و کافر بھی ہوں تو بھی ان کے ساتھ حسن سلوک جاری رکھنا ہے یعنی والدین ہونے کی صورت میں ان کا جو حق ہے اسے پورے کا پورا ادا کرنا ضروری ہے۔ اس طرح والدین کے مشرک اور بے دین ہونے سے اولاد پر ان کا حق ساقط نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ بنی اسرائیل میں والدین کے حقوق کو مزید متحقق کرتے ہوئے بالخصوص اس صورت میں جبکہ وہ بوڑھے ہوچکے ہوں، بیمار ہیں اور ان پر نسیان یا چڑچڑاہٹ طاری ہے قویٰ مضمحل ہیں اور عناصر میں اعتدال باقی نہیں ہے، ان کے ساتھ شفقت، محبت، نرمی، عزت اور مستعدی سے ان کے حقوق ادا کرنے کی تلقین کی ہے اور بھولے سے بھی زبان سے اُف کرنے سے منع کیا ہے اور بچپن میں والدین کی شفقت کا حوالہ دے کر گویا اسی سکے میں ان کے احسان کا بدلہ چکانے کی تلقین کی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

> ''اور تیرے رب نے فیصلہ کردیا کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہوکر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو بلکہ احترام کے ساتھ بات کرو، اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کرو پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔'' (بنی اسرائیل:24-23)

ان آیتوں کو غور سے پڑھیں تو والدین کے سلسلہ میں ان کے حقوق کا پورا دفتر

کھل کر ہمارے سامنے آجاتا ہے جو اس طرح ہیں:

(1) ان کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے۔

(2) اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہوکر رہیں تو

(الف) اُف نہ کریں (اُف تک نہ کہیں)

(ب) انہیں نہ جھڑکیں

(ج) ان کا احترام کریں

(ہ) نرمی اور رحم کے ساتھ معاملہ کریں

(و) ان کے سامنے ہمیشہ جھک کر رہیں۔

(ز) اللہ سے رحم کی درخواست کریں

(ح) اپنا بچپنا یاد کرکے ماں باپ نے جس رحمت و شفقت سے پالا تھا، اسی رحمت و شفقت سے بڑھاپے میں ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں۔

یہ وہ منشور ہے جس کے ذریعہ والدین کے حقوق کو Define (متعین اور واضح) کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ والدین کا حق ہر حال میں ادا کرنا ہے لیکن جب وہ بوڑھے اور کمزور ہوجائیں تو ان کا احترام اور ان کا حق دونوں بڑھ جاتا ہے۔ نبی کریمﷺ نے اپنی متعدد احادیث میں ماں باپ کے حقوق بالخصوص جب وہ بوڑھے ہوں بہت کھول کر بتایا ہے۔

حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں ایک شخص نے نبیؐ سے پوچھا ''یا رسول اللہ ماں باپ کا اولاد پر کیا حق ہے؟'' آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''ماں باپ ہی تمہاری جنت ہیں اور ماں باپ ہی دوزخ۔'' (ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں نبیؐ نے فرمایا: ''خدا کی خوشنودی والد کی خوشنودی میں ہے اور خدا کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے۔'' (ترمذی، ابن حبان، حاکم)

مسلم شریف کی ایک حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا: ''وہ آدمی ذلیل ہو،

پھر ذلیل ہو، پھر ذلیل ہو، لوگوں نے پوچھا اے اللہ کے رسول کون آدمی؟ آپؐ نے فرمایا وہ آدمی جس نے اپنے ماں باپ کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، دونوں کو یا کسی ایک کو اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت میں داخل نہ ہوا۔'' (مسلم)

اسلام میں ہجرت یعنی خدا کی خوشنودی کی خاطر اپنا گھر بار اور اپنے وطن عزیز کو چھوڑنا اور جہاد خدا کی رضا کے لیے دین کے دشمنوں سے لڑنا اور اپنی جان کو نچھاور کر دینا کتنی بڑی نیکی ہے اس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مگر ان کی ادائیگی کے لیے ماں باپ کی رضا مندی ضروری ہے، خاص طور پر اس وقت جبکہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کی حالت میں ہوں اور ان کی خدمت اور خبر گیری کی ضرورت ہو اور کوئی دوسرا ان کی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہو۔ حضورؐ نے ایسے بہت سے لوگوں کو جو ہجرت اور جہاد کے لیے اجازت طلب کرنے آئے ان سے پوچھا کہ گھر پر ان کے کون کون لوگ ہیں؟ اگر کسی نے بتایا کہ ان کے ماں باپ ہیں تو پہلے یہ شرط رکھی کہ ان سے اجازت لے کر آؤ، اور اگر ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے تو کہا کہ تم ہجرت اور جہاد نہ کرو بلکہ اپنے گھر میں رہ کر اپنے ماں باپ کی خدمت کرو، ہجرت اور جہاد کا سارا ثواب ان کی خوشنودی کے ساتھ خدمت سے حاصل ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبیؐ کے پاس جہاد میں شریک ہونے کی غرض سے حاضر ہوا نبیؐ نے اس سے پوچھا کہ تمہارے ماں باپ زندہ ہیں اس نے کہا جی ہاں زندہ ہیں، آپؐ نے فرمایا جاؤ ان کی خدمت کرتے رہو، یہی جہاد ہے۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عبداللہ ہی کا بیان ہے کہ ایک آدمی ماں باپ کو روتا ہوا چھوڑ کر نبیؐ کی خدمت میں ہجرت پر بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوا تو نبیؐ نے فرمایا: ''جاؤ اپنے ماں باپ کے پاس واپس جاؤ اور ان کو اسی طرح خوش کر کے آؤ جس طرح ان کو رلا کر آئے ہو۔'' (ابوداؤد)

حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ ''یمن کا ایک آدمی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اس سے پوچھا کہ یمن میں تمہارا کوئی ہے؟ اس نے بتایا کہ میرے ماں باپ ہیں، آپؐ نے پوچھا انھوں نے تمہیں اجازت دے دی ہے تو اس نے کہا نہیں ان سے اجازت نہیں لی ہے، آپؐ نے فرمایا تم واپس جاؤ اور ماں باپ سے اجازت لو، اگر وہ اجازت دے دیں تو جہاد میں شرکت کرو ورنہ ان کی خدمت میں رہ کر ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہو۔'' (ابوداؤد)

اس سلسلے میں سب سے اعلیٰ مثال(Classic Example) حضرت اویس قرنی کی ہے۔حضرت اویس نے نبیؐ کا دور پایا مگر آپ کی ملاقات کا شرف حاصل نہ کرسکے۔ان کی ایک بوڑھی ماں تھیں جن کی خدمت میں دن رات لگے رہتے۔ نبیؐ کے دیدار کی بڑی آرزو تھی اور کون مومن ہوگا جس کے دل میں یہ تمنا نہ ہو کہ حضورؐ کا دیدار نصیب ہو۔حضرت اویس نے بہت چاہا مگر خود حضورؐ نے منع فرمایا۔فریضہ حج ادا کرنے کی بھی بڑی آرزو تھی،مگر جب تک ان کی والدہ زندہ رہیں وہ حج نہیں کرپائے۔ان کی وفات کے بعد انھوں نے فریضہ حج انجام دیا۔ (بحوالہ آداب زندگی،مولانا یوسف اصلاحی، والدین سے سلوک کے آداب،ص138-148)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی کی رو سے اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو بوڑھے والدین کا حق دین کے بنیادی تقاضوں اور بعض اہم فرائض سے بھی اعلیٰ ہے۔ بوڑھے والدین کی خاطر ہجرت، جہاد اور حج جیسی عبادات کو بھی موقوف اور مؤخر کیا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے عہد میں موجود ہونے کے باوجود حضورؐ نے خود سے ملاقات پر ماں کے حضور رہ کر خدمت کو ترجیح دی اور حضرت اویس کو مدینہ آنے سے منع کیا۔ اگر ہمارے سماج میں یہ آئیڈیل صحیح معنوں میں قائم ہوجائے تو بزرگ والدین کے لیے اس سے بہتر مؤثر اور ہمہ گیر عزت، خدمت اور کفالت کا نظام کیا ہوگا!

ماں باپ کا حق کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا

ماں باپ، ماں باپ ہیں ان کا حق اور ان کا اختیار کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا چاہے وہ کافر ومشرک ہوں یا سخت گیر اور زیادتی کرنے والے ہوں یا اولاد سے زیادہ حق وصولنا چاہتے ہوں۔

حضرت اسماءؓ کی والدہ مشرکہ تھیں اور اسلام سے نفرت کرتی تھیں ایک بار ان کے پاس آئیں تو انھوں نے حضورؐ سے جاننا چاہا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کروں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرتی رہو۔'' (بخاری)

حضرت ابن عباسؓ کی ایک حدیث کے مطابق حضورؐ نے تین بار فرمایا کہ ماں باپ اگر زیادتی کریں تب بھی خدا نے ماں باپ کے جو حقوق متعین کیے ہیں اس کی بجا آوری ضروری ہے ورنہ جس طرح ان کی خدمت و اطاعت جنت کا ضامن بناتی ہے ان کی حق تلفی جہنم میں داخلے کا سبب بن سکتی ہے۔ (مشکوٰۃ)

ایک بار حضورؐ کے پاس ایک شخص اپنے باپ کی شکایت لے کر حاضر ہوا کہ وہ جب چاہتے ہیں میرا مال لے لیتے ہیں۔ نبیؐ نے اس بوڑھے شخص کو بلایا۔ لاٹھی ٹیکتا ہوا ایک بوڑھا کمزور شخص حاضر ہوا۔ آپ نے اس شخص سے تحقیق فرمائی تو اس نے کہنا شروع کیا:

''خدا کے رسول ایک زمانہ تھا جب یہ کمزور تھا اور بے بس تھا، اور مجھ میں طاقت تھی، میں مال دار تھا، اور یہ خالی ہاتھ تھا۔ میں نے کبھی اس کو اپنی چیز لینے سے نہیں روکا۔ آج میں کمزور ہوں اور یہ تندرست وقوی ہے، میں خالی ہاتھ ہوں اور یہ مالدار ہے۔ اب یہ اپنا مال مجھ سے بچا بچا کر رکھتا ہے۔''

بوڑھے کی یہ بات سن کر حضورؐ رو پڑے اور اس شخص سے جو یہ شکایت لے کر آپ کے پاس آیا تھا کہا: تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔ لہٰذا اولاد کبھی اپنے والدین کے حقوق سے دست بردار نہیں ہوسکتی اور نہ ان کی کفالت و خدمت میں کمی کرسکتی ہے۔ اس

کے پاس اتنا مال ہے جس سے وہ ان کی ٹھیک سے خبر گیری کرسکتا ہے تو اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس میں بخل نہ کرے بلکہ دل کھول کر اپنے ماں باپ پر خرچ کرے بصورت دیگر اسٹیٹ کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ قانوناً اس کا حق دلائے۔

ماں کا حق باپ کے مقابلے زیادہ ہے

اسلام کی رو سے اولاد پر ماں اور باپ دونوں کا حق ہے مگر باپ کے مقابلے ماں کا حق چار گنا زیادہ ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں، پہلی وجہ یہ ہے کہ اولاد کی پیدائش اور پرورش میں ماں جن خطرناک مرحلوں سے گزرتی ہے اور جتنی تکلیف اور مشقت برداشت کرتی ہے باپ اتنا نہیں کرتا، دوسری وجہ یہ ہے کہ ماں کے مقابلے، باپ کے معاشی وسائل زیادہ ہوتے ہیں نیز کفالت مردوں کی ذمہ داری ہے چاہے وہ باپ کی شکل میں ہو یا بیٹے اور شوہر کی شکل میں۔ اس لیے اسلام نے ماں کی حیثیت کو باپ سے بلند رکھا ہے اس لیے اس کا حق اور اختیار باپ کے مقابلے زیادہ ہے۔ باپ کی موجودگی میں ہی ماں کا حق زیادہ ہوجاتا ہے خدانخواستہ باپ کا انتقال ہوجائے اور ماں زندہ ہو تو اس صورت میں ماں کا حق اور زیادہ اس لیے ہوجاتا ہے کہ اس کی خبر گیری اور کفالت کا ذمہ دار شوہر نہیں رہا اس لیے بیٹے کو یہ حق ادا کرنا ہوگا اور اس کو وہ جتنی خوشدلی اور فراخ دلی سے کرے گا یہ اس کے لیے خدا کی خوشنودی اور جنت میں داخلے کا ذریعہ بنیں گی۔ اس سے اس کے عمر اور رزق دونوں میں برکت ہوگی۔

حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت بہز بن حکیم سے دو حدیثیں جو بخاری و مسلم، ابوداؤد اور ترمذی میں منقول ہیں اس میں جب حضورؐ سے پوچھا گیا کہ سب سے زیادہ حسن سلوک اور خدمت کا کون مستحق ہے تو آپؐ نے تین بار فرمایا تمہاری ماں اور پھر پوچھا گیا تو چوتھی بار فرمایا تمہارا باپ۔ اس طرح ماں کو باپ پر چار گنا فضیلت حاصل ہے۔

اگر اس آئیڈیل کو تسلیم کرلیا جائے تو کوئی آدمی بقید ہوش و ایمان ماں باپ بالخصوص ماں کے ساتھ حسن سلوک سے پہلو تہی نہیں کرے گا بلکہ ان کی خدمت میں ہر

وقت پوری فروتنی کے ساتھ مستعد رہے گا جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے اور زبان پر ایک لفظ بھی حرف شکایت نہیں لائے گا، بلکہ اُف تک نہیں کرے گا، اس وقت مسلم معاشرے کو اس انداز سے تربیت یافتہ بنانے کی ضرورت ہے تا کہ آج کے مادہ پرستانہ دور میں بچے ماں باپ سے دور نہ ہوں اور خاص طور سے بڑھاپے میں ان کو بے یارو مددگار نہ چھوڑیں۔ مسلم سماج ابھی تک ان پیچیدگیوں سے بڑی حد تک پاک ہے تاہم وقت کی خرابی ہمارے گھروں اور معاشرے میں بھی دھیرے دھیرے در آرہی ہے جس پر بروقت نوٹس لینے کی ضرورت ہے اور عملی حالات و مسائل کی روشنی میں اسلامی اقدار پر مبنی ایک ایسا معاشرتی نظام بنانے کی ضرورت ہے جہاں کوئی بے یارومددگار، محتاج ومفلس نہ رہے بلکہ ہر کی عزت کے ساتھ کفالت، خدمت اور خبر گیری کا نظم ہو۔ یہ اس وقت کا ایک بڑا چیلنج ہے جس پر ہمارے علما، دانشوروں، سماجی علوم کے ماہرین اور سیاسی مدبروں کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اسلام کی رو سے ماں باپ کا حق کبھی اور کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا۔ لہٰذا اولاد کا ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا فرض عین ہے اور ان کے حقوق کی عدم ادائیگی کبیرہ گناہ ہے، بالخصوص اس وقت جبکہ وہ ضرورت مند ہوں۔ اسلام نے حقوق کے تعین میں شرکت کی قربت کو اہمیت دی ہے اور رشتہ میں جو جتنا قریب ہے اس کا حق اتنا ہی اوپر اور اتنا ہی زیادہ ہے۔ آپ نے بخاری و مسلم میں وارد حضرت ابوہریرہؓ سے مروی حدیث میں یہ فرمانے کے بعد ماں اور پھر اس کے بعد باپ کے حق کے بعد پھر تمہارا وہ عزیز جسے نزدیک کی قرابت حاصل ہو پھر ان کے بعد جو قریبی رشتہ دار ہوں۔ اس اعتبار سے ننیہال اور ددیہال کے رشتوں میں جو جتنا قریب ہے اس کا حق اتنا ہی زیادہ ہے۔ لہٰذا بھائی بہن، دادا دادی، نانا نانی، چچا چچی، ماموں ممانی، خالو خالہ اور دیگر رشتہ دار جو اگر مدد کے مستحق ہیں اور ان کی عمر بھی زیادہ ہے تو ان کا حق دوچند ہوجاتا ہے۔ چچا اور باپ کے دوست مثل باپ کے ہیں ان کا احترام باپ کی طرح واجب ہے۔ اسی طرح خالہ اور ماں کی سہیلیاں اور رضاعی ماں مثل ماں کے ہیں ان کا احترام ماں کی طرح کرنا چاہیے۔

عمر رسیدہ لوگوں کا احترام واجب ہے

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ اسلام میں عمر کو احترام کا ایک اہم معیار قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا جو لوگ ہمارے معاشرے میں عمر کے لحاظ سے بڑے ہیں ان کا احترام واجب ہے۔ حضرت ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ''کسی بوڑھے مسلمان کی اور ایسے حامل قرآن کی تعظیم جو قرآن میں افراط و تفریط سے کام نہ لے درحقیقت خدا کی تعظیم کرنے میں شامل ہے اور اسی طرح انصاف پسند حکمراں کی تعظیم بھی۔''
>
> (ابوداؤد، البیہقی فی شعب الایمان)

اس حدیث کی رو سے بوڑھے مسلمان کی تعظیم خدا کی تعظیم کے برابر ہے۔ اب کسی بوڑھے شخص کا درجہ اس سے زیادہ کیا بلند ہوسکتا ہے۔ اگر وہ بوڑھا شخص دادا، دادی، نانا، نانی، بڑا بھائی، بھاوج، چچا چچی، خالہ خالو، ماموں ممانی یا اسی طرح کا کوئی رشتہ دار ہو تو اس کی تعظیم و تکریم واجب ہوجاتی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق صرف بوڑھے رشتہ دار ہی کی نہیں بلکہ ان تمام بوڑھے لوگوں کی تعظیم واجب ہے جو آپ سے عمر میں بڑے ہیں اور اگر عمر اور رشتہ دونوں میں بڑے ہیں تو اس وقت ان کا احترام اور بڑھ جاتا ہے۔

ضعیف باعث خیر و برکت ہیں

اسلام نے رزق کی کمی کے ڈر سے بچوں کے قتل کو کبیرہ گناہ قرار دیا ہے، جیسا آج کے مہذب دور میں کھاتے پیتے متوسط گھرانوں میں جنین میں ہی دختر کشی کی جو رسم چل پڑی ہے اسی طرح اسے بزرگوں کو نظر انداز کرنے اور ان کو بے کار اور بوجھ سمجھنے کی ذہنیت کی بھی اصلاح کی ہے۔

> آپ نے فرمایا: ''تمہیں تمہارے ضعیفوں کی وجہ سے ہی رزق دیا جاتا ہے اور مدد کی جاتی ہے۔'' (بخاری کتاب الجہاد باب من استعان علی الضعفاء)

اگر ماں باپ کی شکل میں بڑے بزرگ گھر میں ہیں تو گویا آپ رحمت کے سائے میں ہیں، ان کی وجہ سے آپ کے رزق اور عمر میں برکت ہوگی۔ بلکہ یہ بزرگ ایک طرح کی ڈھال ہیں اور رحمت کے نقیب ہوتے ہیں، حضورﷺ کا ارشاد ہے:

''اللہ تعالیٰ اس امت کی مدد تو اس کے ضعیفوں کی بنا پر کرتا ہے، ان کی دعا ان کی نماز اور ان کے اخلاص کی وجہ ہے۔''

(نسائی، کتاب الجہاد باب الاستعاد بالضعیف)

حضورﷺ نے ضعیفوں کو تلاش کر کے اپنے پاس لانے کی ہدایت کی۔ حضرت ابودرداءؓ کی روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا:

''ضعیفوں کو تلاش کر کے میرے پاس لاؤ، اس لیے کہ تمہیں اپنے ضعیفوں کی وجہ سے ہی رزق دیا جاتا ہے اور مدد کی جاتی ہے۔''

(ابوداؤد، کتاب الجہاد، نسائی)

حضورؐ نے ضعیفوں کو جو اہمیت دی ہے، اس کا اندازہ آپ کے اس قول سے بھی لگایا جاسکتا ہے:

''مجھے اپنے ضعیفوں میں تلاش کرو اس لیے کہ ضعیفوں کی وجہ سے تمہیں رزق بھی دیا جاتا ہے اور مدد بھی کی جاتی ہے۔''

(ترمذی، باب الفضائل الجہاد)

اب آپ ان دونوں حدیثوں کو ملا کر دیکھیں ایک میں حضورﷺ نے ضعیفوں کو تلاش کر کے اپنے پاس لانے کی ہدایت کی اور دوسری میں خود کو ضعیفوں میں تلاش کرنے کی بات کہی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ امت کے ضعیفوں کا کتنا خیال رکھتا تھے اور کس طرح ان کی خبر گیری فرماتے تھے کہ گویا آپ کو اپنے گھر اور مسجد نبوی سے باہر کہیں دیکھنا ہے تو غالب گمان ہے کہ آپ کسی ضعیف اور کمزور کی مدد فرمارہے ہوں گے۔ اس سے امت کو یہ سبق ملتا ہے کہ اگر امت واقعی اسوۂ رسول کی پیروی کرنا چاہتی ہے تو اسے اپنے

ضعیفوں سے اسی طرح محبت کرنی ہوگی، اسی طرح ان کی عزت کرنی ہوگی اور اسی طرح ان کی خدمت کرنی ہوگی جس طرح حضورﷺ ضعیفوں کی کیا کرتے تھے۔ ضعیف اگر رشتہ دار ہے تو اس کا حق زیادہ ہے۔ رشتہ دار نہیں بھی ہے تب بھی اس کا احترام اور حسب توفیق کفالت و خدمت کے باب میں اس کی مدد واجب ہے۔

غیر مسلم ضعیفوں کا حق

ہم ایک مشترک معاشرے (Composit Society) میں رہتے ہیں جس کو آج کی اصطلاح میں تکثیری سماج (Plural Society) کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے کہ اس سماج میں مختلف مذاہب، رنگ، نسل اور زبان کے لوگ رہتے ہیں اور ہی سماج میں بوڑھے لوگ ہیں۔ مسلمان پر اور مسلمان سماج پر صرف مسلمان سماج کے بوڑھوں کی خبر گیری واجب نہیں ہے بلکہ بوڑھا چاہے جس قوم وملت کا فرد ہو اگر وہ بوڑھا ہے تو اس کا احترام کرنا چاہیے اور اگر وہ محتاج اور حاجت مند ہے تو اس کی اسی طرح مدد کی جانی چاہیے جیسا ایک مسلمان کی جاتی ہے۔ اسلام نے جو نظام کفالت عطا کیا ہے اس میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں ہے جو بھی حاجت مند ہے اس کی کفالت کی جائے۔

حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت کا ایک واقعہ ہے کہ آپ نے ایک بوڑھے نابینا کو بھیک مانگتے دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہے آپؓ نے اس سے پوچھا تمہیں کس چیز نے اس حالت تک پہنچایا۔ اس نے جواب دیا جزیہ، ضرورت اور بوڑھاپا۔ حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے اور اتنا کچھ دیا جو اس کی ضروریات کے لیے کافی تھا۔ پھر آپ نے بیت المال کے خزانچی کو حکم دیا کہ اس شخص اور اس جیسے دوسرے اشخاص کی طرف توجہ کرو۔ خدا کی قسم یہ انصاف نہیں ہے کہ ہم اس کی جوانی کی کمائی کھائیں اور بڑھاپے میں اسے دھتکار دیں۔ زکوٰۃ فقراء اور مساکین کے لیے اور یہ اہلِ کتاب کے مساکین میں سے ہیں۔ آپ نے اس فرد اور اس جیسے دوسرے افراد کو جزیہ سے بری قرار دیا۔

جب آپ نے دمشق کا سفر کیا تو ایک ایسی بستی سے گزرے جہاں کچھ جذام کے

مریض عیسائی بستے تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کو زکوٰۃ کے مد سے امداد دی جائے اور ان کے راشن جاری کیے جائیں۔ (سید قطب، اسلام میں عدل اجتماعی، باب تاریخ اسلام سے چند مثالیں، صفحہ 378)

ضعیفوں کے حقوق اور ہماری ذمہ داریاں

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو متعین طور پر بزرگوں اور عمر رسیدہ لوگوں کے تین طرح کے حقوق یا ضرورتیں ہیں:

(1) کفالت

(2) عزت و احترام

(3) خدمت اور خبر گیری

یہ تینوں بنیادی حقوق ہیں جس کو متحقق کرنا اور متعین طور پر فراہم کرنا ہر خاندان، معاشرہ اور ریاست کی ذمہ داری ہے۔ کسی شخص کو بھوکا، ننگا، بیمار اور بے سہارا نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اگر کسی وجہ سے کوئی شخص خود اپنی کفالت نہیں کرسکتا تو اس کے بچے پر اس کی کفالت کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس کو اسے قانونی طور پر فراہم کرایا جائے گا۔ اگر خدانخواستہ اس کی اولاد کفالت نہیں کرسکتی تو سماج اور ریاست کو آگے آنا ہوگا اور اجتماعی نظم اور اداروں کے ذریعہ اس کی کفالت کا نظم کرنا ہوگا۔ انفاق، زکوٰۃ، صدقات اور عطیات کے علاوہ بیت المال سے مستقل وظائف کا نظم اسلام کے نظام تکافل کا لازمی حصہ ہے جس سے ایسے لوگوں کی مدد کی جائے گی جو اپنی بنیادی ضروریات از خود پوری کرنے سے از خود قاصر ہیں۔ اسلامی سماج اور ریاست میں جب ایک کتے اور بلی کو بھوکا پیاسا مرنے نہیں دیا جائے گا تو کسی انسان کو کیسے بے یارومددگار چھوڑا جاسکتا ہے۔ لہٰذا بنیادی ضرورتوں کی تکمیل اور ان کو بہم پہنچانے کے لیے ایسے قوانین، ادارے، میکنزم سب بنائے جاسکتے ہیں اور بنائے جائیں گے جو ان چیزوں کو لازمی طور پر بہم پہنچانے میں معاون ہوں گے۔ اس اعتبار سے اگر مسلمان سماج میں یا اسلامی ریاست کو بوڑھا شخص ہے

خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم اور وہ اپنی کفالت نہیں کرسکتا یا اس کے بچے مالی وسائل کی کمی کی وجہ اس کی کفالت نہیں کر سکتے اس صورت میں جیسا حضورﷺ کی ہدایت اور حضرت عمرؓ کا اسوہ اوپر ذکر کیا گیا اس کی کفالت بیت المال یعنی State Exchequer سے ہوگی اور متعین اور مستقل طور پر ہوگی تا کہ وہ کسی اور کا محتاج نہ رہے۔

دوسری چیز عزت و احترام ہے۔ ایک آدمی غریب ہو یا امیر انسان ہونے کے ناطے عزت وشرف کا مستحق ہے۔ لہٰذا تمام انسانوں کا اکرام واجب ہے۔ کوئی معاشرہ کتنا صاحبِ ایمان اور مہذب ہے، اس کی ایک کسوٹی یہ بھی ہے کہ وہ باہمی شرف و احترام کا کتنا لحاظ رکھتے ہیں۔ دولت مند، طاقتور، صاحب علم اور صاحبِ مرتبہ شخص کا احترام تو سب کرتے ہیں کیونکہ ایسا کرنا ان کی مجبوری ہے ورنہ خود ان کے اپنی عزت نفس پر حملہ ہوسکتا ہے۔ ایک شخص طبعی طور پر کتنا مہذب اور Cultured ہے اس کا ایک بڑا پیمانہ یہ ہے کہ وہ اپنے سے کم تر اور کمزور لوگوں کے ساتھ کتنی عزت، محبت، احترام اور شرافت سے پیش آتا ہے۔ اگر اس کا رویہ شریفانہ ہے تو اسے مہذب مانا جائے گا ورنہ وہ خوش پوشاک وحشی قرار دیا جائے گا۔ حضورؐ کی ایک حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ایک آدمی کے برا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے کسی بھائی کو حقیر سمجھے۔ قرآن نے بلاتخصیص تمام انسانوں کو صاحبِ عزت قرار دیا ہے۔ **لقد کرمنا بنی آدم** اس میں مسلم وغیر مسلم، عورت مرد، امیر غریب، عالم جاہل، آزاد غلام، چھوٹے بڑے سب شامل ہیں۔ اور ایک ایک شخص مومن ہے اس کا اکرام دو چند ہوجاتا ہے ایک انسان ہونے کے ناطے اور دوسرے مسلمان ہونے کے ناطے اور ایک شخص بوڑھا اور عمر رسیدہ ہے تو اس کا حق تین گنا ہوجاتا ہے۔ ایک انسان ہونے کے ناطے، دوسرے مسلمان ہونے کے ناطے اور تیسرے عمر دراز ہونے کے ناطے۔ یہ تینوں پیمانے مسلمان معاشرے میں کسی بھی بوڑھے شخص کو صاحب عزت بناتے ہیں، جن کا تعظیم و احترام پوری امت پر واجب ہے۔ اور اگر وہ غیر مسلم ہے تو انسان اور عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے اس کا بھی احترام واجب ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اسلام نے بزرگوں کے احترام

کومنفی اور مثبت دونوں طرح سے متحقق کیا ہے۔قرآن نے امیر غریب ہر دو اولاد کو چاہے وہ اپنے بوڑھے والدین کی کفالت کرنے کی پوزیشن میں ہوں یا نہ ہوں، ان کی عزت کرنے، ان کے سامنے جھکے رہنے، ان سے نرمی اور محبت کا سلوک کرنے اور ان کی خوش دلی کے ساتھ خدمت کرنے کی ہدایت کی ہے۔

سماج میں ہر کوئی کسی کا بیٹا ہے تو کسی کا باپ ہے، اگر ہم کسی اور کے باپ کی عزت کریں گے تو لازماً وہ ہمارے باپ کے ساتھ عزت سے پیش آئے گا۔لیکن ہم نے کسی کے والدین کے ساتھ بدسلوکی کی تو وہ بھی بدلے میں بدسلوکی سے پیش آئے گا۔

> ''حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی شخص کا اپنے والدین کو گالی دینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔صحابہ نے پوچھا اے اللہ کے رسول کیا کوئی اپنے والدین کو بھی گالی دے سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں کوئی آدمی کسی اور آدمی کے باپ کو گالی دے تو جواب میں وہ اس کے باپ کو گالی دے۔ اور وہ اس کی ماں کو گالی دے جواب میں وہ اس کی ماں کو گالی دے۔'' (بخاری ومسلم)

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ باہمی احترام کا لازمی طریقہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ناروا سلوک سے بچیں ورنہ جواباً اس کے ساتھ بھی ناروا سلوک ہوگا اور اس طرح پورا معاشرہ پراگندہ ہوجائے گا اور ایک دوسرے کے حقوق کی پامالی ہوگی۔

یہ تو ایک صورت ہے کہ کوئی کسی کے باپ یا ماں کو برا بھلا کہے اور جواب میں دوسرا بھی اس کے ماں باپ کو برا بھلا کہے۔ ان دنوں ہمارا سماج تہذیبی اعتبار سے جن پستیوں کا شکار ہوگیا ہے،مسلمان گھرانوں میں صرف جاہل اورغریب لوگوں کے یہاں ہی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ، بظاہر مہذب اور خوشحال گھرانوں میں بھی ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ ہم نے خود اپنے کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اولاد اپنے والدین کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتی ہے بلکہ بعض پڑھے لکھے لوگ گالی گلوج اور مار

پیٹ تک کرتے دیکھے گئے ہیں۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ بزرگوں سے بدسلوکی غیر مسلم معاشرے میں ہوتی ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔ مسلمان گھروں اور سماج میں بھی بدسلوکی کے واقعات عام ہیں، خاص طور سے غریب اور مجبور والدین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس معاملے میں مسلمان معاشرے کی خاص تربیت کرنے اور حساس بنانے کی ضرورت ہے اور ایسے افراد اور اداروں کی ضرورت ہے جہاں ایسے معاملات کی دیکھ ریکھ ہو سکے۔

ہمارے سماج میں عورتوں کی تعلیم و تربیت اچھے ڈھنگ سے نہیں ہوتی جس کی وجہ سے بیٹی اور بہو اپنے سسرالی رشتہ داروں کے ساتھ اکثر اچھے سے پیش نہیں آتی ہیں۔ یہی حال ساس اور نند کا ہے وہ بھی اپنی بھاوج اور بہو کے ساتھ اچھا رویہ نہیں رکھتی ہیں۔ مسلمانوں میں مشترک خاندان کا رواج کم ہے تاہم لڑکے کے ساتھ یا لڑکی کے ساتھ ماں باپ یا ساس سسر رہتے ہیں۔ معاشی تنگی ایسے بھی جوہر کردار چھین لیتی ہے اس پر اگر تہذیبی تناقض ہو تو کریلے پر نیم چڑھا ہو جاتا ہے۔ اب بیٹی یا بہو ماں یا ساس پر حکم چلاتی ہے اور کبھی کبھی سسر کے ساتھ بھی بدسلوکی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ جب اپنے بیٹے بہو یا بیٹی داماد، ماں باپ یا ساس سسر کے ساتھ عزت و احترام سے پیش نہیں آئیں گے تو معاشرے میں ان کی عزت کیا رہے گی، اس طرح نہ صرف یہ کہ ان کی ضروریات پوری نہیں ہوں گی بلکہ انہیں دلی اور ذہنی ایذا بھی پہنچے گی جو بڑھاپے میں ان کی صحت و صلاحیت اور عزت نفس کو پامال کرنے کا سبب ہوگی۔ لہٰذا اس باب میں مسلمان سماج کو حساس ہونا ہوگا۔ اور ایسے تمام لوگوں کی عزت نفس کی حفاظت کے لیے سرگرم پہل کرنی ہوگی۔ پہلی ضرورت تو لوگوں کی دینی اخلاقی تربیت کی ہے دوسری ضرورت ان کی مدد کی ہے اور تیسری ضرورت قانونی اور سرکاری مدد کے ذریعے ان کو تعاون اور تقویت پہنچانے کی ہے۔ اس کے لیے مسلمانوں میں این جی او اور رفاہی اداروں کا قیام وقت کی ایک ضرورت ہے، جس پر توجہ دینی چاہیے۔ بہرحال ان کی عزت نفس اور حیثیت عرفی کی حفاظت وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کے لیے تمام مسجدوں کو نکلیس (Nucleus) بنا کر محلے کے تمام گھروں پر نظر رکھنے کی

ضرورت ہے اور جہاں سے ایسی شکایت آئے کہ کسی بزرگ کے ساتھ اس کے گھر والے یا محلّہ میں کسی اور شخص نے بدسلوکی کی ہے تو تمام محلّہ والوں اور مصلیان کو مل کر اس کے گھر جانا چاہیے یا اس شخص سے ملنا چاہیے۔ ان کی تربیت اور اصلاح کی کوشش کے ساتھ ساتھ حسبِ ضرورت ایسے لوگوں کے خلاف سماجی کارروائی، تادیبی اور قانونی کارروائی بھی کی جانی چاہیے تاکہ ایسے واقعات پر روک لگے۔

آخری بات خدمت اور خبر گیری ہے۔ خدمت اور خبر گیری اولاد کا حق اور اس کی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے ایسا کرنے میں ناکام ہو تو وہ دوسروں کی مدد لے سکتا ہے۔ بڑھاپا اپنے آپ میں ایک بیماری ہے اور بہت سی بیماریوں کا ذریعہ ہے۔ ان میں بعض لاعلاج اور بہت تکلیف دہ مرض بھی ہیں۔ حکومت نے اور بہت سے رفاہی اداروں نے اس ضمن میں بہت سے قابلِ تحسین اقدامات کیے ہیں اور ایسے بہت سے ادارے قائم ہیں جہاں ان کا رعایتی در پر دوا علاج ہو سکتا ہے۔ مسلمان سماج کو بھی ایسے ادارے اور این جی او قائم کرنا چاہیے جہاں ایسے مریضوں کا علاج ہو سکتا ہے اور ان کے درد اور بیماری میں کمی لائی جاسکتی ہے۔ کہنے کی غرض یہ ہے کہ اس معاملے میں حساس ہونے کی ضرورت ہے۔

انگریزی شاعر ورڈورستھ نے کہا بچہ انسان کا باپ ہوتا ہے۔ یعنی آج جو بچہ ہے کل وہی باپ بنے گا۔ آج جو چھوٹا ہے کل وہی بڑا اور بوڑھا ہوگا۔ ہم میں سے ہر شخص عمر خضر کا خواہش مند ہے۔ کوئی مرنا نہیں چاہتا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ سو سال اور سوا سو سال زندہ رہے۔ لہٰذا آج ہم جوان ہیں طاقت ور ہیں، صحت مند ہیں۔ ہمیں مطلق احساس نہیں ہے کہ ہم بھی کمزور ہوں گے، بوڑھے ہوں گے، بیمار ہوں گے، کیسے کیسے کڑیل جوانوں کو لوگوں نے معذور اور بے بس ہوتے ہوئے دیکھا ہے جن کو اپنے دست و بازو طاقت و جوانی پر بڑا ناز تھا، وہ بیساکھی کے سہارے چلنے پر مجبور ہیں۔ اس لیے نہیں کہا جاسکتا کس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے گا۔ اس لیے یہ ہر شخص کا مسئلہ ہے جس سے آج نہ کل اسے دوچار ہونا ہے۔ جو بچہ ہے وہ جوان ہوگا، جو جوان ہے اگر اس کی عمر نے وفا کی

تو بوڑھا اور بیمار ہوگا، اس وقت اس کو دوسروں کی مادی اور جذباتی ضرورت ہوگی۔

انگلینڈ، امریکہ، جرمنی اور جاپان میں ہماری طرح غربت نہیں ہے، انھوں نے سوشل سیکوریٹی کا ایک بڑا نیٹ ورک کھڑا کردیا ہے۔ انشورنس اور اجتماعی کفالت کا پورا ڈھانچہ کھڑا ہے۔ شاید وہاں کے بوڑھوں کو مالی پریشانی کم ہے۔ مگر ان کا مسئلہ یہ ہے کہ اولادیں ہونے کے باوجود وہ تنہائی کی زندگی گزارتے ہیں۔ جذباتی خلا (Emotional Vacuum) کی کمی کی وجہ سے مایوسی اور Depression کے شکار ہوجاتے ہیں اور اکثر بوڑھے لوگ اپنی تنہائی اور بیماری سے تنگ آ کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ یہ ہمارے سماج کا مسئلہ بھی ہے۔ ہمارے یہاں جو اعلیٰ اور اعلیٰ متوسط گھرانوں کے لوگ ہیں جن کے بچے دنیوی نقطۂ نظر سے بہت کامیاب ہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدوں پر ہیں اور اکثر بیرون ملک اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں ان کے بوڑھے گھر میں تنہا رہتے ہیں۔ انھوں نے زندگی بھر اپنے رشتہ داروں کو نہیں لگایا ان سے کوئی تعلق نہیں رکھا، وہ نہ کسی کے یہاں گئے نہ کوئی ان کے یہاں آیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب ریٹائر ہوئے، بوڑھے ہوئے بیمار ہوئے، کمزور ہوئے تو اس وقت ان کے بچے ان سے دور ہونے کے سبب ان کے پاس نہیں ہیں۔ پیسہ ہے مگر پیسہ انسان کی کمی اور جذباتی خلاء کو پُر نہیں کرسکتا۔ اس وقت ان کو احساس ہوتا ہے کاش ایک بیٹا اتنا کامیاب نہیں ہوتا اور وہ ان کے پاس ہوتا۔ اس طرح کے عدم دولت والے مشینی معاشرے میں جہاں احساس مروت کو آلات کچل رہے ہیں، ہمیں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بدلتی سماجی ضرورتوں کے لحاظ سے ایسے قوانین اداروں، تنظیموں، انجمنوں اور روایات کے بارے میں سوچنا ہوگا، جہاں ہم اپنے بزرگوں کی اچھی طرح خدمت وخبرگیری کرسکیں کیونکہ آج یہ ان کا مسئلہ ہے کل یہ ہمارا مسئلہ ہوگا۔ اس لیے ہر شخص کو اس کو ذاتی مسئلہ سمجھ کر ابھی سے کوشش شروع کردینی چاہیے، برسات سے پہلے چھت کی مرمت کرلی جائے تاکہ بارش کے پانی سے خود کو محفوظ رکھا جاسکے۔

■❖■

کرنے کا کام

جیسا اوپر کے صفحات میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس وقت ہندوستان کی مجموعی آبادی ایک ارب سے زائد ہے جس میں ساٹھ سال اور اس سے اوپر کی عمر کے لوگ لگ بھگ دس کروڑ ہیں جن میں پانچ کروڑ مرد اور پانچ کروڑ عورتیں ہیں۔ ملک میں مسلمانوں کی آبادی لگ بھگ بیس کروڑ ہے۔ مسلمانوں میں عمر رسیدہ لوگوں کی تعداد کتنی ہے اس کا کوئی قابل وثوق اعداد وشمار (DATA) موجودنہیں ہے تاہم ایک اندازے کے مطابق، ان کی تعداد لگ بھگ دو کروڑ ہوگی۔ اگر مرد وزن جنسوں کا تناسب یکساں مان لیا جائے تو ایک کروڑ مرد اور ایک کروڑ خواتین اس زمرے میں آتے ہیں جو شہروں اور دیہاتوں میں ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مسلمان ہندوستان کی سب سے پسماندہ کمیونٹی ہے۔ جس کے اندر غربت، جہالت، بیماری اور افلاس ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلے سب سے زیادہ ہے۔ 2006 میں شائع سچر کمیٹی کی رپورٹ نے مسلمانوں کو شیڈول ٹرائب اور شیڈول کاسٹ یعنی عرف عام میں ہریجن آدی باسی اور نیو بودھسٹ سے بھی زیادہ پسماندہ اور قلاش مانا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی 75% آبادی حد درجہ غربت وافلاس کی شکار ہے۔ ظاہر ہے اس کا اثر ان کی عمر رسیدہ آبادی پر بھی ہوگا۔ لہٰذا ایک اندازے کے مطابق دو کروڑ عمر رسیدہ لوگوں میں ایک کروڑ پچہتر لاکھ مرد وخواتین حد درجہ غربت وافلاس سے دوچار ہیں اور ان کی صحت بھی خراب ہے۔

عمر رسیدہ لوگ جو والدین، دادا دادی، نانا نانی یا ساس سسر کی صورت میں یا اسی طرح کے کسی اور رشتہ کی شکل میں ہیں۔ اسلام کا پہلا اصول ہے کہ ان کی کفالت کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو ان کے وارث ہیں، اور رشتہ میں ان سے قریب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ والدین کی کفالت کی ذمہ داری ان کی اولاد بالخصوص نرینہ اولاد یعنی بیٹوں پر ہوتی ہے۔ مگر بیٹا اگر خود غریب، مجبور، بیمار اور کم وسائل رکھتا ہے تو اس صورت میں وہ چاہ کر بھی اس حق کو ادا نہیں کرسکتا۔ ایسی صورت میں کفالت کا کوئی قانون بنا بھی دیا جائے اور عدم کفالت کو قانونی جرم بھی قرار دے دیا جائے، اس کے باوجود بھی اس مسئلے کا حل نہیں نکل سکتا ہے۔ ایسی صورت میں سماج اور ریاست کو آگے بڑھ کر یہ ذمہ داری قبول کرنی ہوگی۔

ہندوستان دستوری لحاظ سے ایک سیکولر سوشلسٹ، جمہوری ملک ہے جس میں بلا لحاظ مذہب، رنگ، نسل، جنس، اور سماجی ومعاشی حیثیت کے تمام شہریوں کو عزت کے ساتھ جینے کا بنیادی حق حاصل ہے۔ بلکہ عزت کے ساتھ جینے (Life with Dignity) کی ضمانت دینا ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اس اعتبار سے ہندوستان ایک رفاہی جمہوریہ (Welfare Democratic State) ریاست ہے، جس میں تمام شہریوں کو بھوک، غربت، جہالت، بیماری، بے کاری، ظلم واستحصال سے بچانا حکومت کی ذمہ داری تسلیم کی گئی ہے۔ لہٰذا حکومت مختلف قوانین، اداروں، ضابطوں، اسکیموں اور منصوبوں کے ذریعہ اس ذمہ داری کو ادا کررہی ہے جس کی تفصیل اوپر دی گئی ہے لیکن یہ مسئلہ صرف حکومتی اداروں یا قانون کے ذریعہ حل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے ملی اور معاشرتی پہل ضروری ہے ایک تو حکومت کے منصوبوں اور اسکیموں میں جو کمیاں (Shortcomings) ہیں ان کو دور کرنے میں دوسرے اس کے نفاذ میں جو خامیاں (Loop Hole & Leakeges) ہیں جس کے سبب ان اسکیموں کا پورا فائدہ مستحقین تک نہیں پہنچ پاتا اس کو مستحقین تک پوری طرح پہنچانے میں سماج اور سول سوسائٹی کا اہم رول ہوسکتا ہے۔

مسلمانوں میں خدمت خلق کا جذبہ بہت ہے۔ اور ہر مسلمان اپنی بساط بھر انفاق

بھی کرتا ہے مگر یہ کوششیں زیادہ تر بے ترتیب (Random) ڈھنگ سے انفرادی سطح پر وقتی، مقامی اور ہنگامی ڈھنگ سے ہوتی ہیں، ہمارے یہاں مختلف کاموں کے لیے ادارے بنانے، این جی او چلانے اور منظّم انداز سے کوشش کرنے کا کلچر بہت کم ہے۔ جبکہ اس طرح کے کام باضابطہ اور منصوبہ بند کوشش کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سالانہ سیکڑوں ہزار کروڑ روپئے خرچ کرنے کے باوجود ملت کی غربت و جہالت، ان کے اندر بیماری اور کمزوری جیسے بنیادی مسائل پر قابو نہیں پایا جاسکا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری سوچ اور طریق عمل میں کچھ بنیادی خامیاں ہیں جن کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک تو مسلمانوں میں پھیلی وسیع تر جہالت اور دوسرے دین کے محدود ناقص اور جامد تصور کی وجہ سے اسلام کی رفاہی اور افادی روح اور اس کی انسانیت نواز (Humanitarian Image) شبیہ پوری طرح مجروح نظر آتی ہے۔ اس لیے غیر مسلم تو دور خود مسلمانوں کی بڑی آبادی کو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ نماز، روزہ، حج و زکوۃ، تسبیح و تلاوت اور صدقہ خیرات کی طرح لوگوں کے مسائل کے حل کرنے اور ان کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرنا بھی عبادت ہے جس پر اللہ نے اجر وثواب کا وعدہ کیا ہے۔ ہم دینی کاموں کو جس میں اجر و ثواب ہے اور آخرت کی بھلائی مضمر ہے، عبادت سمجھ کر کرتے ہیں جس میں اللہ کی خوشنودی شامل ہوتی ہے، لہٰذا مسلمانوں کو یہ بتانا اور سمجھانا ضروری ہے کہ یہ بھی دینی کام ہے، جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے اور اس کو کرنے کا ثواب اور نہ کرنے کا عذاب ہے۔ اس سلسلے کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہماری رفاہی اور فلاحی کوششیں صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہنی چاہئیں بلکہ تمام ضرورت مند انسانوں تک اس کا دائرہ پھیلنا چاہیے کیونکہ وہ بھی خدا کے بندے ہیں اور انسانی برادری کے فرد ہیں۔ جب اللہ نے اپنے نافرمان کافر مشرک بندوں کا رزق بند نہیں کیا ہے اور ان کے دنیاوی معاملات میں کوئی فرق نہیں کرتا ہے تو ہم کیوں اللہ کے تمام بندوں سے نفرت کریں اور ان کی مصیبت کے وقت کام نہ آئیں۔ دین بندے اور خدا کا معاملہ ہے اور اللہ اپنے بندوں کا حساب لینے

کے لیے کافی ہے ہمارا کام دین پہنچانا ضرور ہے، منوانا نہیں ہے۔ ہم صرف دعوت دیں گے، کوئی مانے یا نہ مانے یہ اس کا اور اس کے خدا کا معاملہ ہے۔ لیکن اگر وہ بھوکا ہے، بیمار ہے، بے کار ہے، مظلوم ہے یا ضرورت مند ہے تو اس کی خدمت ہم پر اسی طرح فرض ہے جس طرح ایک مسلمان کا حق ہے۔ ہمارا پڑوسی اگر غیر مسلم ہے وہ بھوکا، ننگا، بیمار اور محتاج ہے تو اس کا دین دیکھ کر یا دین پوچھ کر یا جب تک اسلام نہ لے آئے اس وقت تک ہم اس کی مدد نہ کریں ایسا کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ ہمیں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ایسے لوگوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ قرآن میں تالیف قلب کا خاص حکم ہے۔ خدمت اپنی شبیہ (Image) سدھارنے اور لوگوں کا دل جیتنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

اس پوری بحث کا لب ولباب یہ ہے کہ عمر رسیدہ لوگوں کے مسائل کے بارے میں حساس، بے دار اور منظم ہونے کی ضرورت ہے اور کس مقام پر اس طرح کے لوگ ہیں ان کے ساتھ دست تعاون بڑھانا ہے۔ یہ کام ہماری تمام تر دینی ملی اور سماجی تنظیموں کو بھی کرنا ہے اور ہر مقام پر مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر بھی کرنا ہے۔ اس کے لیے ادارے بنانے، این جی او بنانے اور لوگوں کو بڑے پیمانے پر حساس اور بیدار کرنے کی ضرورت ہے تا کہ اسلامی تعلیمات ہمارے سماج کا چلن بنیں اور لوگ اسلام کو چلتے پھرتے ہمارے روز مرہ کے معاملات اور تعلقات، سماجی ضابطوں اور رابطوں میں دیکھیں اور محسوس کریں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل نکات پر دھیان دینے کی ضرورت ہے:

(1) سب سے پہلے ہماری تمام دینی ملی سماجی اور رفاہی تنظیموں اور اداروں کو عمر رسیدہ لوگوں کے معاملات اور مسائل سے Sensitise کرنے کی ضرورت ہے تا کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوں اور اپنی سطح سے ان کے حل کی راہ میں پہل کریں۔

(2) ہمارے تمام دینی، ملی اور رفاہی اداروں کو اپنے تنظیمی ڈھانچے کے اندر بزرگوں کے مسائل سے متعلق ایک Cell بنانا چاہیے اور اس کے ذریعہ ان کے مسائل کو Address کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(3) اس ضمن میں سب سے پہلا کام یہ ہوسکتا ہے کہ تمام گاؤں، پنچایت، شہروں اور قصبات کے وارڈ اور محلوں میں ساٹھ سال اور اس سے زائد عمر کے کتنے مرد و خواتین ہیں اور ان کی معاشی، سماجی حالت کیا ہے اس کی پوری فہرست تیار کرکے ان کے پاس ہونی چاہیے۔ مسلمانوں میں جماعت اسلامی، جمعیۃ العلما، ملی کونسل، جمعیۃ اہل حدیث، اہل سنت و الجماعت یعنی بریلوی مسلمانوں کی تنظیم ادارہ شرعیہ، امارت شرعیہ اور مختلف علاقوں میں جو بھی اور جس نوعیت کی بھی تنظیم اور ادارے ہیں بالخصوص مسلم پرسنل لاء بورڈ وغیرہ کو اپنے یہاں بزرگوں کے مسائل سے متعلق ایک شعبہ بنانا چاہیے اور این جی او بناکر Help Age India کے طرز پر ان کے ریلیف باز آبادی (Relief & Rehabitation)، کونسلنگ اور دیگر طرح کی امداد کے لیے آگے آنا چاہیے تاکہ ان کو سرکاری اور ملی دونوں فورم سے کماحقہ فائدہ پہنچایا جاسکے۔

(4) مرکزی اور ریاستی سرکاروں نے دیہاتی اور شہری علاقوں میں رہنے والے غریب، عمررسیدہ لوگوں کے لیے بہت سی رفاہی اسکیمیں شروع کی ہیں، مثلاً بزرگوں کو پنشن اسکیم، مفت یا رعایتی در پر راشن کی فراہمی، مکان کی فراہمی، دوا علاج کا انتظام، جاڑے اور برسات میں کمبل اور الاؤ کا انتظام، ریلیف اور باز آبادکاری، موذی امراض کے علاج کی سہولت وغیرہ۔ بوڑھے لوگ اپنی غربت، جہالت، ضعف، بیماری کی وجہ سے ان اسکیموں کے بارے میں جانتے نہیں ہیں، اور اگر جانتے بھی ہیں تو از خود اس سے فائدہ اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ کچھ طالع آزما لوگ مکھیا، سرپنچ، سرکاری کرمچاری ان کا بیشتر حصہ ہڑپ کرجاتے ہیں۔ لہٰذا دینی، ملی تنظیمیں مقامی سطح پر ان اسکیموں سے لوگوں کو واقف کرانے میں مدد کریں نیز ان سے کیسے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اس کے لیے کچھ دوڑ دھوپ کریں اور ان کو ان کا حق دلوائیں تو بڑا کام ہوسکتا ہے۔

(5) ابھی حکومت نے غذا کے حق (Right to Food) کا قانون پاس کیا ہے اور آدھار کارڈ کی بنیاد پر براہ راست رقم کی فراہمی (Direct Cash Transfer) کی اسکیم نافذ کی جارہی ہے، اس سے کرپٹ طور طریقوں پر روک لگے گی۔ لہٰذا اگر اس وقت مستعد ہوکر اس کام کو کرایا جائے تو بہت سارے غریبوں، معذوروں اور بزرگوں کا مسئلہ آسانی سے حل ہوسکتا ہے بالخصوص بوڑھی عورتیں، بیوائیں، اور بے سہارا مرد اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

(6) بڑھاپا اپنے آپ میں مختلف قسم کے امراض کا مجموعہ ہے۔ ان میں بعض امراض کافی تکلیف دہ اور لاعلاج بھی ہوتے ہیں اور بعض بیماریوں کے علاج میں کثیر رقم خرچ ہوتی ہے۔ لہٰذا بزرگ لوگ کیسے صحت مند رہیں اور کس طرح بیماریوں سے بچیں اس کے بارے میں ان کو جانکاری دینا، حفظانِ صحت کے اصولوں سے واقف کرانا، وقت پر دوا علاج کا بندوبست کرنا یہ سب بہت اہم کام ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے ان دنوں حکومت نے دوا علاج کے معاملے میں سرکاری اسپتالوں میں اچھا انتظام کیا ہے وہاں بہت سارے امراض کی دوا مفت مل جاتی ہے۔ مریض کی جانچ پڑتال بھی مفت کی جاتی ہے اور اگر ہوسپٹل میں بھرتی کی ضرورت ہے تو اس کا بھی انتظام ہے۔ مگر ہمارے یہاں ڈاکٹر اور ہاسپٹل اسٹاف کی ٹریننگ ٹھیک ڈھنگ سے نہیں ہوتی۔ سرکاری عملہ اوپر سے نیچے تک کرپٹ ہے اور غریبوں کا بہت سا حق مار کر کھا جاتے ہیں۔ لہٰذا ہر مقام پر ایک ایسی تنظیم ہو جو ان امور پر نظر رکھے اور پریشر گروپ کے طور پر کام کرے۔ لوگوں کو بتایا جائے کہ اگر ان کی کوئی شکایت ہے تو وہ اس ادارے کو بتائیں، اور شکایت موصول ہونے کے بعد یہ لوگ جانچ پڑتال کریں، متعلقہ افراد اور ذمہ داروں سے ملیں، عوامی نمائندوں اور پریس کے ذریعہ ان کے خلاف آواز اٹھائیں اور اس مقام پر پہنچ کر جمہوری انداز سے غلط حرکتوں، دھاندلی اور کرپشن کے خلاف آواز

اٹھائیں تو ان طبقات کے پچاس فیصد مسائل از خود حل ہو جائیں گے۔
مسلم تنظیموں کو چاہیے کہ اپنی طرف سے اور جہاں جہاں ان کی یونٹیں قائم ہیں وہاں عورتوں، بچوں اور بزرگوں کے لیے ہیلتھ کیمپ لگائیں، اس ہیلتھ کیمپ میں آنے والے لوگ کس بیماری سے دوچار ہیں اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس صورت میں ان کو کس قسم کی طبی امداد کی ضرورت ہے اس کا خاکہ تیار کر کے ان کو طبی مدد پہنچانی چاہیے۔ ان کے مرض کا صحیح دوا علاج کہاں ہو سکتا ہے، کیا سہولتیں ان کو مل سکتی ہیں، کون سے ادارے ان کی مدد کر سکتے ہیں اگر اس طرح کی رہنمائی لوگوں کو ملے اور ان رفاہی اداروں سے ان کا رابطہ قائم کرا دیا جائے ان کی بڑی مدد یہ ہو سکتی ہے۔
بڑھاپے میں کینسر، ٹی بی، دل اور گردے کی بیماری، آنکھ کی بینائی، گھٹنے اور جوڑوں میں تکلیف اور بعض نفسیاتی بیماریاں پارکنس، Demenitia، سائی زوفرینیا، ڈپریشن وغیرہ عام ہیں۔ ان کا دوا علاج کافی مہنگا ہوتا ہے اور ان بیماریوں میں تکلیف بھی زیادہ ہوتی ہے۔ بعض ایسے بوڑھے لوگ ہیں جو بالکل اکیلے ہیں، شوہر یا بیوی کا انتقال ہو چکا ہے، اولاد یا تو ہے نہیں یا بہت دور ہیں۔ ان کے مالی وسائل ان بیماریوں کے علاج کے لیے کافی نہیں ہیں۔ ہماری ملی، دینی جاعتوں کو اپنا بجٹ بناتے وقت ان باتوں کا دھیان رکھنا چاہیے اور اپنی آمدنی کا ایک حصہ ان بیماریوں کے علاج اور ایسے مریضوں کے دیکھ ریکھ کے لیے مختص کرنا چاہیے۔ نیز اپنے زیر انتظام ایسے این جی او بنانے چاہئیں جو اس کام کو کر سکیں اور سرکاری و غیر سرکاری ذرائع سے مدد لے کر ان کو مدد پہنچائیں۔ عیسائیوں اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس سلسلے میں بہت اچھا کام کیا ہے۔ ان کے تجربے سے مسلمانوں کو بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہمارے یہاں بہت سے ایسے مزار ہیں جہاں سالانہ لاکھوں لوگ آتے ہیں اور کروڑوں روپے کا نذرانہ

پیش کرتے ہیں۔صوفیا اس لیے مرجع خلائق ہوئے کیونکہ ان کے دروازے تمام حاجت مندوں کے لیے کھلے رہتے تھے۔ ان سے عقیدت ومحبت آج بھی باقی ہے اور عقیدت مندوں کا ہجوم اس بات کی علامت ہے۔صوفیا کی دعاؤں سے کتنے مریض شفایاب ہوتے رہے ہیں اور کتنوں کی حاجات پوری ہوئی ہیں، اس روایت کو قائم رکھتے ہوئے ان مزاروں کے گدی نشینوں، متولیوں اور انتظام کاروں کو مزار سے متصل اراضی پر ایسے ہاسپٹل بنانے چاہئیں جہاں موذی، متعدی امراض کا علاج ہوسکے۔ وہاں لوگ عقیدت سے اتنی دیں گے کہ ایسے ادارے کو چلانا مشکل نہیں ہے۔صرف تھوڑی سوچ بدلنے اور پہل کرنے کی ضرورت ہے۔

(7) ہماری مسجدیں ہماری آبادیوں میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ مسجد صرف نماز پڑھنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ محلے اور علاقے کے لوگوں سے ملنے کی جگہ بھی ہے۔ جو لوگ مسجد میں آتے ہیں ان میں اکثر لوگ عمر رسیدہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی خبر خیریت معلوم کرتے رہنا چاہیے اور اگر واقعی کوئی ضرورت مند ہے تو اس کی مدد انفرادی اور اجتماعی طور پر کرنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ زیادہ تر لوگ جہالت اور بے دینی کے شکار ہوتے ہیں اور بڑھاپے میں بھی مسجد کی طرف رخ نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو مسجد تک لانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ان کے مسائل سے دلچسپی لینی ضروری ہے۔ لہٰذا ہماری مسجدوں کو رفاہی سینٹر اور کمیونٹی سینٹر بنانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ان دنوں لوگ اپنی مصروفیت اور سماجی تعلقات میں آئی سردمہری کے سبب ایک دوسرے سے ملنے جلنے میں تکلف محسوس کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے گھر نہیں جاتے ہیں ہمیں اس رجحان کو بدلنا چاہیے اور لوگوں سے قریبی رشتہ بنانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ خاص طور پر ضرورت مند لوگوں کا پتہ لگا کر ان تک مدد پہنچانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ایسے بہت سے ضرورت مند

ہیں جو اپنی حاجات لوگوں کے سامنے پیش نہیں کرتے لیکن اگر خاموشی سے ان کی مدد کی جائے تو اسے قبول کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کی مدد کا ضرور اہتمام کرنا چاہیے۔ قرآن پاک میں اس کی خاصی تاکید آئی ہے اور مسکین ومحروم کی تعریف میں اسی طرح کے لوگ آتے ہیں۔ آپ کے مال میں ان کا حق ہے جس کو کھلے اور چھپے دونوں طرح سے ادا کرنے کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔ فرض صدقات کی ادائیگی علی الاعلان ہونا چاہیے لیکن ذاتی اور نفلی انفاق چھپا کر دینا احسن ہے اس سے ضرورت مند کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے اور اس کی عزت نفس بھی محفوظ رہتی ہے۔

(8) گھر اور خاندان سماجی تحفظ کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس ادارے کو مضبوط کیے بغیر ہم کوئی بھی طریقہ اختیار کرلیں وہ اس کا بدل نہیں ہوسکتا۔ اولاد اگر اپنے بوڑھے ماں باپ کے تئیں حساس نہ ہو، وہ ان کی عزت، خدمت اور خبر گیری نہ کرے تو آپ کوئی بھی ضابطہ اور طریقہ بنالیں یہ اس کا بدل نہیں ہوسکتا۔ غربت، جہالت، تمدنی اور تہذیبی پسماندگی، غلط ماحول کے اثرات، مادہ پرستانہ اور خود غرضانہ جذبات کی وجہ سے اکثر بچے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے بلکہ انھیں بے یار و مددگار چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک باپ چار چار بچوں کی کفالت کرتا ہے اور چار چار اولاد مل کر بھی ایک ماں باپ کی کفالت کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اکثر بھائیوں میں کشمکش ہوتی ہے کہ وہ نہیں کرتا ہے تو ہم کیوں کریں یا وہ اتنا کم کرتا ہے تو ہم سے زیادہ کا مطالبہ کیوں۔ کوئی کہتا ہے وہ ماں یا باپ کسی ایک کو اپنے ساتھ رکھے گا دونوں کی کفالت نہیں کرسکتا۔ کسی کی بیوی اپنی ساس کے ساتھ یا سسر کے ساتھ بدسلوکی کرتی ہے یہاں تک کہ کبھی کبھار گالی گلوج اور مار پیٹ کرنے کے واقعات بھی سننے کو ملتے ہیں۔ کسی اولاد کے لیے اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہوگی۔ مگر یہ سب سماجی سچائیاں ہیں جن سے

آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ لہٰذا سماج میں ماں باپ کی عزت اورخدمت کا ماحول بنانے کے لیے وسیع پیانے پرلوگوں کی دینی اور اخلاقی تربیت کی ضرورت ہے تا کہ لوگ بوڑھے ماں باپ کو اپنے لیے بوجھ نہیں بلکہ نعمت سمجھیں، جنت اورخدا کی خوشنودی، عمر اور رزق میں اضافے کا ذریعہ مانیں اور ماں باپ کی خدمت اور کفالت میں اپنے وسائل بھرکسی طرح کی کسر اٹھا نہ رکھیں لہٰذا والدین کی خدمت اور دیگر بزرگ رشتہ داروں کےحقوق کے باب میں لوگوں کو واقف کرانے اور احساس دلانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ جمعہ کے خطبوں، میلاد کی مجلسوں، سیرت کے جلسوں اور عام سماجی و دینی اجتماعات میں لوگوں کو اس جانب توجہ دلانے کی ضرورت ہے اور اس پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہر محلّہ میں ایسے کچھ لوگ ضرور ہونے چاہئیں جو اُن امور پرنظر رکھیں اورحسب ضرورت اُن کی اصلاح کے لیے سرگرم اور کوشاں ہوں۔

ان کوششوں کو صرف مردوں تک محدود نہ رکھیں بلکہ عورتوں کو بھی اس میں شامل کریں کیونکہ یہ کام بغیر عورتوں کے تعاون کےممکن نہ ہوگا۔مسلمانوں کی اجتماعی کوششوں کی ناکامی اور اس کی جزوی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے اجتماعی اور سماجی معاملات میں عورتوں کو نظر انداز کرکے کام کرنے کا نقشہ بنایا ہے جس کے نتیجے میں ہماری اسکیم ہی آدھی ادھوری ہوجاتی ہےتو فائدہ پورا کیسے حاصل ہوگا۔

(9) ہمارے سماج میں جو لوگ لاولد اور بالکل بے سہارا ہیں اور جن کا دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے ایسے لوگوں کے لیے یتیم خانے کی طرز پر بزرگوں کا گھر بناکر مسلمان عمر رسیدہ لوگوں کو ایک ساتھ رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس کام میں سرکاری اور غیر سرکاری ایجنسیوں سے مدد کے ساتھ ساتھ عشر، زکوٰۃ، صدقات اور دیگر ذرائع سے مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔ بزرگوں کے گھر میں ان

کے کھانے پینے، لباس پوشاک، دوا علاج، خدمت اور خبر گیری کے لیے ڈاکٹر، نرس اور دیگر ٹرینڈ اسٹاف رکھنا چاہیے جو ان کی نفسیات، ضرورت اور حالات کے مطابق ان کی مدد کر سکے۔

(10) بزرگوں کو ڈپریشن سے بچانے اور ان کو ایک فرحت بخش ماحول فراہم کرنے کے لیے ان کی صحت مند تفریح کا بھی نظم کرنا بہتر ہوگا۔ مثلاً شعر و شاعری، پینٹنگ، کچھ چیزوں کو بنانا یا ان کو ایسے کام میں لگانا جن سے ان کی کچھ آمدنی ہوجائے۔ ان کو ایک آزاد کھلی اور صحت بخش ماحول فراہم کرنا۔

غرض اگر ایک بار ہم سوچ لیں کہ اپنے سماج کے بڑے بزرگوں کو ہم ایک باعزت زندگی فراہم کرنے میں معاون ہوں گے اور ان کی عزت نفس کی حفاظت کے ساتھ ان کی کفالت و خدمت کا انتظام کریں گے تو خود بخود بہت سی راہیں کھل جائیں گی اور ہم ان تجربات اور خدمات کا دائرہ وسیع کرتے جائیں گے اور اس طرح ایک خیر پسند معاشرہ بنانے میں کامیاب ہوں گے۔ جس معاشرے میں بچوں اور بزرگوں دونوں کی حفاظت، کفالت اور خدمت ہوتی ہے ، اس معاشرے کو خوشحال اور خوشگوار، ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہمیں اس کے لیے بزرگوں کی خدمت کرکے ان سے دعا لینے کی ضرورت ہے۔ بزرگوں کی دعاؤں سے بڑے بڑے معرکے سر ہوتے ہیں، عمر اور رزق میں برکت ہوتی ہے۔ آدمی اور قوم خدا کے غضب سے محفوظ رہتے ہیں۔ بزرگوں کا سایہ برگد کے پیڑ کی مانند ہے جس کی گھنی چھاؤں ہمیں دھوپ کی تمازت اور گرمی کی شدت سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس لیے ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے والدین کا سایہ تادیر قائم رکھے اور ان کی عزت کے ساتھ خدمت کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہماری دنیا بھی بہتر ہو اور ہماری آخرت بھی بہتر ہو، آمین!

■❖■

نوجوانوں سے اپیل

نوجوان کسی ملک وقوم کے ریڑھ کی ہڈی اوراس کے دست و بازو ہوتے ہیں، وہ کسی قوم کی قوت وشوکت کے مظہر اور اس کی جوہری صلاحیتوں کے نمائندہ ہیں۔تعمیر و ارتقاء کی تمام عبارتیں انہیں کی رہین منت ہیں۔ وہ قوم کی تمام اعلیٰ روایتوں اور قدروں کے وارث و امین ہوتے ہیں۔قوم کا مستقبل کیا ہوگا اور اس کے اخلاق و اقدار کیا ہوں گے قوم کن تعمیری صلاحیتوں سے متصف ہے اور اس سے کیا امید رکھی جاسکتی ہے سب کچھ اس کی نوجوان صلاحیت اور ان کی جوہری خصوصیت پر منحصر ہے۔

اکیسویں صدی نوجوانوں کی صدی ہے۔ نئے مواقع، نئے چیلنج، نئے امکانات کی صدی ہے۔ اقبال نے بیسویں صدی میں کہا تھا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں اور عقابی روح جب نوجوانوں میں بیدار ہوتی ہے تو انھیں اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے۔ اکیسویں صدی میں یہ محض تصور نہیں حقیقت ہے جس کو سر کی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔مگر یہ صدی ٹوٹتے بکھرے اقدار کی صدی ہے۔ آلات کی حکمرانی جذبات و احساسات کو کچل کر بڑی بے رحمی سے گزر جاتی ہے۔اس میں انسان تضاد نفسی کا شکار ہے۔ ایک طرف ترقی کے اعلیٰ منازل ہیں تو دوسری طرف ترقی معکوس۔ مادیت، صارفیت، مہنگائی، گلاکٹ مسابقت، بازاریت، حرص و ہوس انسانی رشتوں، نازک احساسات جذبات

پر بھاری ہوتے جارہے ہیں۔جنس اور نفس محض کھیل تماشہ اور محض تفریح کا ذریعہ ہوگئے ہیں۔شوہر بیوی کے تعلقات میں فدائیت گرمجوشی، قربانی، برداشت اور دلی محبت کم ہوگئی ہے ہر چیز ظاہری اور سطحی ہے، اس لیے رشتوں کا استحکام ختم ہورہا ہے، گھر ٹوٹ رہے ہیں۔سنگل مدر، بےشوہرعورتیں، بن باپ کے بچے ٹوٹتے اقدار اور بکھرے خاندان کے وہ ٹوٹے شیشے ہیں جو بے احتیاطی سے اگر اٹھالیے جائیں تو زخمی کرسکتے ہیں۔ایسے ماحول میں اپنے گھر اور سماج کو بچانا یہ نوجوانوں کی ذمہ داری ہے۔ ہمارا کام اپنے گھر والوں کی کفالت کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انہیں اعلیٰ اخلاق اور بلند احساسات سے متصف کرنا بھی ہے۔تعلیم محض Skill Development یا Knowledge of Tools کا نام نہیں ہے بلکہ تعمیر انسانیت کا ذریعہ ہے جس سے مہذب سماج کو استحکام و وسعت حاصل ہوتی ہے۔لہٰذا ہمیں اپنے بچوں میں دین و اخلاق اور سیرت و کردار کو بہتر بنانے کی تعلیم بھی دینی ہوگی۔ خدا کا خوف، رسول سے محبت، آخرت کی جوابدہی کا احساس، دین و شریعت کی پابندی کا داعیہ، اعلیٰ اخلاق و کردار، خاندانی رشتوں کا احترام، پڑوسیوں سے اچھے تعلقات انسانیت عام سے محبت اور اس کی خدمت کا داعیہ یہ سب ہماری تعلیم وتربیت کے لازمی اجزاء ہونے چاہئیں۔

کسی بھی تربیتی نظام کی ابتدا گھر سے ہوتی ہے۔ ماں کی گود اس کا پہلا گہوارہ ہے۔ لہٰذا ماں کو نظر انداز کرکے کوئی بھی تربیتی نظام نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ آج ہمارے گھروں میں جو بحرانی صورتحال پیدا ہورہی ہے اس کی تین بڑی وجہیں ہیں پہلا معاشی تنگی، دوسرا ناقص تربیت اور تیسرا حد درجہ خودغرضی۔ معاشی تنگی،علم اور محنت سے دور ہوجائے گی۔ لیکن ناقص تربیت اور خودغرضی وہ شخصی بیماریاں ہیں جن کا علاج بازار میں نہیں ہے۔ اس کے لیے اپنے ایمان و اخلاق میں سدھار لانا ضرور ہوگا۔ اس کے لیے دین سے رشتہ مضبوط کرنا، قرآن وسنت کا علم حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے یہاں اس وقت جس قسم کی بیمار دین داری کا چلن ہے اکثر دین دار لوگ بے دین لوگوں سے زیادہ خودغرض اور شقی القلب نظر آتے ہیں، یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری کرنے

کے بجائے ان کا مال ہڑپنے اور ان کی عزت نیلام کرنے کے درپے رہتے ہیں، والدین اور دیگر بزرگوں کو حقوق پامال کرتے ہیں۔ عورتوں کے حقوق کی پامالی میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ اقبال نے کہا کہ خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔ شریعت جو انصاف کا منبع ہے ان کے غلط چلن کی وجہ ظلم کی علامت بن گیا ہے۔ ہماری عورتیں بھی ناقص تعلیم وتربیت اور بگڑتے بدلتے حالات اور ماحول کی خرابی کی وجہ سے خودغرض اور بداخلاق ہوگئی ہیں جو لالچ، جھوٹ، دکھاوا اور ظاہر داری کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ زیادہ تر تو تعلیم سے محروم ہیں اور کچھ نے اگر اسکول کالج کی تعلیم حاصل کی بھی ہے تو ان کے اندر واجبی صلاحیت نہیں ہوتی۔ مگر اپنی کم علمی کے باوجود اپنے خاندان کی کم تعلیم یافتہ اور نسبتاً جاہل خواتین پر رعب جھاڑنے اور ان کا نیچا دکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی جس سے خاندانی رشتوں میں تلخی پیدا ہوتی ہے۔ ان کی گود میں جونسل پروان چڑھ رہی ہوتی ہے، وہ اس کشمکش بھرے ماحول میں جب بڑی ہوتی ہے تو اکثر ان کی شخصیت کا صحت مند ارتقاء نہیں ہوتا اور وہ صرف ذہنی اور جسمانی طور پر ہی بونے (Stunted) اور کوپوشن (Malnatnitin) کے شکار نہیں ہوتے بلکہ Moral Malanutntion اخلاقی غذا کی کمی کے بھی شکار ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس پوری مسموم ہوا وفضا کو بدلنا ہے۔ نیا نظام، نیا کلچر پیدا کرنا ہے اور یہ کام ہمارے نوجوان ہی کرسکتے ہیں۔ نئی دنیا کی تعمیر جس علم وحوصلہ اور جس Committment کی متقاضی ہے وہ نوجوانوں کے پاس ہے، اس لیے نوجوانوں کو اعلیٰ مقاصد سے روشناس اور ان کے اندر اس کے حصول کی طلب پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

کہاوت مشہور ہے انفاق کی ابتداء گھر سے ہونی چاہیے (Charity Begins from Home) تو آیئے ایک نئے اچھے صحت مند، پرخلوص، پر اخلاق، انسانیت نواز، محبت، ہمدردی، ایثار وخبر گیری، احسان و انفاق، تعاون اور تزئین پر مبنی ایک خوبصورت معاشرہ، ایک اچھا خاندان بنانے کی کوشش کریں اور اپنی ذات سے یہ کام شروع کریں۔ ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کو سنبھائیں، تعلقات میں گرمجوشی پیدا کریں، رویہ میں خلوص پیدا کریں،

معاملات میں اعتدال و احسان کا چلن عام کریں اور اس کی ابتداء والدین کی عزت و خدمت اور خاندان کے دیگر بزرگوں کے ساتھ احترام سے ہو۔اگر وہ کسی درجہ میں آپ کے تعاون کے امید وار ہیں اور آپ اس پوزیشن میں ہیں کہ ان کے ساتھ احسان کر سکتے ہیں تو اپنی ضرورتوں کو مؤخر کر کے یا تھوڑی اس میں کمی کر کے بھی ان کے کام آنے کا جذبہ پیدا کریں، سورج، چاند، زمین، آسمان کچھ نہیں بدلتے۔ آدمی بدل جاتا ہے جس کو لوگ سمجھتے ہیں کہ زمانہ بدل گیا جب اقدار و احساس بدل جاتے ہیں تو وقت اور رشتہ میں فرق آجاتا ہے۔ اس لیے فرد کی بقا، خاندان کے استحکام، معاشرے کے ارتقا اور قوم کی تعمیر کا اصول اٹل ہے۔ لاتبدیل لسنّت اللہ۔ اللہ کی سنت کبھی نہیں بدلتی۔ لہٰذا انسانی رشتوں کی ڈور میں بھی کوئی تبدیلی نہ آنے دیجیے۔ تو آج بھی آپ کا ہے اور کل بھی آپ ہی کا ہوگا۔

ہمارے نوجوانوں پر ایک اہم تاریخی ذمہ داری ہے۔ پوری انسانی دنیا ایک بحرانی دور سے گزر رہی ہے، اسلام رشتوں کے بحران کو ختم کرنے کا ایک مجرد نسخہ ہے۔ کاش ہم اس کو خود بھی استعمال کریں اور دوسروں کو بھی بتائیں۔ اس لیے میں اپنے نوجوان دوستوں سے اپیل کروں گا کہ:

(1) صلہ رحمی کو عام کریں اور قطع رحمی سے بچیں، قطع رحمی دس بڑے گناہوں میں سے ایک ہے یعنی خون اور دودھ کے رشتوں کو جوڑیں، ان کا حق ادا کریں اور بدلے کی جگہ احسان کا طریقہ اختیار کریں۔

(2) اپنے بوڑھے والدین کی عزت، خدمت، خبرگیری اور دلجوئی میں کوئی کسر نہ چھوڑیں اور ان سے کبھی اس طرح نہ پیش آئیں کہ انہیں آپ کے اور آپ کی بیوی بچوں کے رویہ سے تکلیف پہنچے۔ اس معاملے میں اپنے بیوی بچوں کی مناسب انداز میں تربیت کریں تاکہ وہ ان کے بڑھاپے کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی بعض کمزوریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان سے احترام کا رشتہ برقرار رکھیں خصوصاً اپنی ماں کا خیال رکھیں۔ ان کی خدمت جنت کی ضمانت ہے۔ ماں باپ

کی خدمت سے عمر اور رزق جو آپ کے بیوی بچوں کو بھی محبوب ہے اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذرا اس کو آزما کر دیکھئے۔

(3) اپنے خاندان کے دیگر بزرگ رشتہ داروں سے بھی رشتہ برقرار رکھیں، اگر ان میں سے کوئی کسی چیز کا حاجت مند ہو اور آپ اس میں معاون ہو سکتے ہیں تو ضرور کریں۔ یہ ان کا حق اور آپ پر فرض ہے۔ اللہ اس سے خوش ہوتا ہے اور اس سے آپ کی دنیا و آخرت سنور سکتی ہے۔ اگر کوئی رشتہ دار بیمار ہے تو اس کی عیادت اور مزاج پرسی کو ضرور جائیں اور حسب موقع جان اور مال سے ان کی جو خدمت کر سکتے ہیں ضرور کریں۔ کسی بھی ہنگامی لمحے میں لوگ رشتہ داروں سے ہی تعاون اور ہمدردی کی امید رکھتے ہیں۔ یہ ہمارا ایمانی اور انسانی فریضہ ہے اور اسلامی معاشرے کی پہچان ہے۔

(4) آپ جس مقام، محلے، بستی یا شہر میں رہتے ہیں آپ کے پڑوس میں کوئی بوڑھا شخص ہے چاہے وہ کسی قوم کا فرد ہے قابلِ احترام ہے، اس سے عزت و محبت سے ملیں اور اگر کوئی اس کی ضرورت ہے تو حسبِ توفیق اس کو ضرور پوری کریں۔ پڑوس میں کوئی بیمار ہے کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے اور آپ کو خبر ہو تو وقت نکال کر ضرور جائیں۔ انسانی رشتوں کو بنائے رکھنا معاشرتی امن و استحکام کے لیے ضروری ہے۔ اس وقت ملک میں جو فرقہ واریت، نفرت اور تشدد کی ہوا فضا ہے اس طرح کے انسانیت نواز Proactive اقدام سے کم اور ختم کیے جا سکتے ہیں۔

(5) چاہے کتنا ہی اشتعال ہو کبھی کسی کو بھولے سے بھی اس کے زندہ یا مردہ ماں باپ کو گالی نہ دیں بلکہ دوسروں کے ماں باپ کو پوری عزت دیں۔ اس کے بدلے میں وہ بھی کبھی آپ کے ماں باپ سے دشنام طرازی نہیں کرے گا اور آپ کے والدین کی بھی عزت کرے گا۔ سماج میں باہمی احترام کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل نوجوانوں میں دوستی اور بے تکلفی

کے اظہار کے لیے صرف ایک دوسرے کو تم تام ہی نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کی ماں بہن کی گالی دے کر بلاتے اور پکارتے ہیں اور اس کو حد درجہ دوستی کی علامت مانتے ہیں۔ یہ انتہائی قبیح فعل ہے۔ انگریزی کا مقولہ ہے Familiarity Breeds Contempt یعنی بے تکلفی ازالہ حیثیت عرفی پیدا کرتی ہے۔ یہ اپنی ذات تک کو ٹھیک ہے دوست کو دوست کی طرح ہونا چاہیے اور بے تکلفی آپسی رشتوں کو مضبوط کرتی ہے لیکن اس کو کبھی ماں بہن، باپ یا اس جیسے محترم رشتوں حتیٰ کہ اپنی بیوی کے ساتھ نازیبا الفاظ کے اظہار کا ذریعہ بننے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ ہمیں ہر حال میں حدود کا پابند رہنا چاہیے۔

(6) Ethiquitt & Manner یعنی شریفانہ برتاؤ اور طور طریقہ ایک چیز ہے اور اخلاق دوسری چیز ہے۔ بعض لوگوں میں خاندانی اور فطری شرافت ہوتی ہے مگر اسی درجے میں ان کے اندر کبر نفس اور خود غرضی بھی پائی جاتی ہے ایسے لوگ دیکھنے میں شریف لگتے ہیں مگر ان سے کوئی توقع رکھنا فضول ہے۔ بخالت حرص، خود پسندی، لیے دیے رہنا اور اپنی دنیا میں مگن رہنا ان کی عادت ہوتی ہے۔ میں، میری بیوی، میرے بچے بس یہیں تک ان کی دنیا ہوتی ہے۔ ہمیں ایسے دکھاوٹی انداز اور ظاہر دارانہ رویہ سے بچنا ہے اور خلوص کی بنیاد پر انسانی رشتوں کو استوار کرنا ہے جس کے لیے تھوڑی وقت اور پیسے کی قربانی درکار ہوگی اور اس کام کو خوش دلی سے کرنا ہے۔ ہمیں سمجھنا ہوگا کہ ہمارے وقت اور مال میں ہمارے رشتہ داروں کا بھی کچھ حق ہے اس لیے اپنی اوقات و مصروفیات کو اسی طرح ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔

(7) ہم ایک پسماندہ قوم ہیں، ترقی اور طاقت کا قافلہ بہت دور نکل چکا ہے۔ ہمارے پسماندگان میں کچھ بوڑھے، کمزور، بیمار، بیکار، معذور، بچے، عورتیں بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم ماؤ کے لانگ مارچ کی طرح بوڑھے اور کمزور لوگوں کو گولی مار کی

ہلاک نہیں کر سکتے اور نہ وحشی قبائل کی طرح اپنے مردوں کا گوشت کھا کر اپنا پیٹ بھر سکتے ہیں۔ ہمارے جو لوگ ہیں یہی لوگ ہماری پونجی ہیں، ہماری طاقت ہیں، اس لیے ہم ان کو بوجھ سمجھ کر راستے میں نہیں چھوڑ سکتے۔ہمیں پوری قوم کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ یقیناً ہماری نوجوان نسل پر غیر پیداواری آبادی کا بوجھ زیادہ ہے تاہم اس سے ہمارے بوجھ اٹھانے کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ہم نے ٹھیک سے اپنے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کی خبر گیری کی تو یہ بیش بہا انسانی وسائل ہماری مستقبل کی کامیاب عبارت بنیں گے اور پوری قوم کا مستقبل روشن ہوگا۔تو آیئے اپنی گھریلو اور سماجی ذمہ داریوں کو خوشدلی سے ہاتھ پھیلا کر قبول کریں اور دل وجان سے اس کی ادائیگی میں لگ جائیں، اللہ ہمارا آپ کا سب کا حامی و ناصر ہو۔

■❖■

باب چہارم

ہندوستانی معاشرے میں کمزور طبقات کے
حقوق و معاملات اور زمینی صورتحال

ہندوستانی معاشرے میں کمزور طبقات کے حقوق و معاملات اور زمینی صورتحال

ہندوستان میں جب کمزور طبقات کی بات ہوتی ہے تو اس سے عام طور پر دلت، آدی باسی، بیک وارڈ، خواتین اور اقلیتیں بالخصوص مسلمان اقلیت مراد لی جاتی ہیں۔ ان کو کمزور ماننے کے کئی پیمانے ہیں جن میں غربت، جہالت، سماجی اور معاشی حقوق سے محرومی، کمزور قیادت اور سیاسی حصہ داری سے محرومی وغیرہ خاص اشاریہ ہیں۔ دراصل غربت اور جہالت دنیا کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ جس شخص اور گروہ میں یہ کمزوری زیادہ ہوگی وہ فرد اور طبقہ اسی درجہ میں کمزور مانا جائے گا۔ ہندوستان جیسے ملک میں ایسے کمزور افراد کی تعداد ستر فیصد سے زیادہ ہے۔ لہٰذا ان افراد اور طبقات کے حقوق کا مسئلہ اتنا پیچیدہ اور سنگین ہے جس نے ہندوستان کے چہرے کو پوری طرح داغدار اور بدنما بنا رکھا ہے۔

ہندوستانی معاشرے کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ مٹھی بھر لوگ جو وسائل اور اقتدار پر قابض ہیں انھوں نے پورے ملک اور معاشرے کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ ایک ہاتھ سے دو اور دوسرے ہاتھ سے لو کے چکر بیوہ نے محروم طبقات کو محرومی کے حصار سے نکلنے کے سارے راستے مسدود کر رکھے ہیں اور بقول اقبال خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم

اگر، پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری ہے۔ آج کے جس جمہوری دور میں جب کہ عام آدمی کو حق رائے دہندگی حاصل ہے، اور ووٹ کے استعمال کے حق سے حکومت بنائی اور گرائی جاتی ہے لیکن محروم طبقات کی محرومی کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی ہے۔ جس وقت 15/اگست 1947 کی آدھی رات کو یونین جیک اتار کر ترنگا لہرایا گیا اور اس وقت ملک کے عوام سے پہلے وزیر اعظم نے وعدہ کیا کہ ''ہم ملک کے عوام کی خدمت کریں گے جس کا مفہوم یہ ہے کہ لاکھوں لوگ جو مصیبت زدہ ہیں ان کی مدد کریں گے۔ تاکہ ان کی غربت، جہالت، بیماری اور مواقع کی غیر برابری دور ہو۔ اور ہماری نسل کے سب سے عظیم آدمی نے جو عزم کیا ہے کہ ہم ہر آنکھ کا آنسو پوچھیں گے۔ اور ہمارا کام اس وقت تک پورا نہیں ہوگا جب تک پریشان حال لوگوں کی آنکھ میں آنسو باقی ہیں۔'' (بحوالہ جواہر لال کی سینٹرل ہال میں کی گئی تقریر)

آزادی کی سات دہائیاں بیت چکی ہیں اور ہم ملک میں آزادی کی پچھترویں سال گرہ کے جشن منانے کی تیاریاں کررہے ہیں۔ مگر صورتحال یہ ہے کہ ملک میں آزادی کے وقت جتنی آبادی تھی آج اس سے کہیں زیادہ آبادی خطِ غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ ملک کے محروم طبقات کے تناسب اور تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے بلکہ بعض طبقات کو تو حکومت وقت نے بے رحم حالات کے ہاتھوں بے یارومددگار چھوڑ دیا۔ مسلمانوں کے ساتھ ڈنڈی ماری کا سلسلہ تو آزادی کے بعد سے ہی شروع ہوگیا ہے۔ جب سے مرکز اور بعض ریاستوں میں بی جے پی اور اس کی حلیف جماعتوں کی حکومت بنی ہے ملکی اور ریاستی پالیسی اور منصوبوں میں یا تو مسلمانوں کو پوری طرح نظر انداز کردیا گیا ہے یا ان کو حاشیہ سے ہٹا کر کہیں کہیں فوٹ نوٹ میں رکھ دیا گیا ہے۔ اس وقت اکثریت نوازی کی سیاست جس انداز سے سر چڑھ کر بول رہی ہے وہ پارٹیاں جو خود کو سیکولر، لبرل اور سنٹرسٹ کہتی ہیں انھوں نے بھی اقلیتوں کے جائز معاملات اور مطالبات سے منہ پھیر لیا ہے اور ایسی بے اعتنائی اختیار کررکھی ہے جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ایک

طرف حکومت کا معاندانہ رویہ ہے، دوسری طرف اپوزیشن جماعتوں کی بے رخی ہے اور تیسری طرف ان کے خلاف پوری سرکاری پشت پناہی اور کھلی چھوٹ کی وجہ سے سماج دشمن عناصر اور پریس کو ان کے خلاف کھلے عام نفرت اور تشدد پھیلانے میں 24x7 سرگرم ہیں جس نے عوام کے ایک طبقے کو اس حد تک مشتعل اور دنگائی بنادیا ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر سبّ وشتم پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا کمزور اور محروم طبقات بالخصوص اقلیتوں مسلمان اور کرسچین کی جان، مال، عزت، آبرو، ان کے مذہبی مقامات، ادارے اور علامات کچھ بھی محفوظ نہیں ہیں۔ اس صورتحال میں جب ہم انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں تو سوال اٹھتا ہے کہ کہاں کی کھاؤں چوٹ اور کہاں کی بچاؤں چوٹ والی کہاوت صادق آتی ہے۔

اس وقت بھارت میں انسانی حقوق کی پامالی جس طرح ہورہی ہے اور خاص طور سے دلت، آدی باسی اور مسلمان اس کے شکار ہورہے ہیں یہ ملک کی بدلتی سیاست اور سماج کا وہ رخ ہے جس پر ملک کے تمام انصاف پسند افراد اور گروہ نے گہری تشویش کا اظہار کیا ہے نیز عالمی میڈیا اور اداروں نے بھی اپنی تشویش اور بے چینی کا اظہار کیا ہے۔ حکومت جس طرح عوام کے جمہوری حق پر روز شب خون مار رہی ہے اور مظلوموں کی آواز کو جس طرح دبانے کی کوشش ہورہی ہے وہ ایمرجنسی کے دنوں کی یاددلاتی ہے۔ ملک میں فسطائی ڈکٹیٹر شپ نے اپنا پنجہ گاڑ دیا ہے اور کمزور طبقات پوری طرح اس کی زد میں ہیں۔ اس پورے پس منظر اور ماحول پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ایک بھیانک تصویر ابھرتی ہے جس نے ملک کے کمزور طبقات بالخصوص مذہبی، لسانی، تہذیبی اور نسلی اقلیتوں کے سامنے ایک بڑا چیلنج کھڑا کردیا ہے۔ لیکن کتاب کے اس حصے میں ہم عمومی صورتحال پر گفتگو کرنے کے بجائے کچھ مخصوص محروم اور کمزور طبقات کی نشاندہی کرکے ان کے مسلم معاشرہ اور عام معاشرہ میں حقوق و معاملات پر روشنی ڈالیں گے تاکہ ترجیحی طور پر ان کے حالات کی جانکاری حاصل کی جاسکے۔

ہمارے پیش نظر جن طبقات پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے، وہ درج ذیل

ہیں:

(1) یتیم اور بے سہارے بچے

(2) بیوہ، مطلقہ اور متروکہ عورتیں نیز فسادات میں متاثر عورتیں اور بچے

(3) مسکین اور محروم طبقات

(4) مسافر

(5) بیمار

(6) ہوم لیس

(7) معذور افراد

(8) مزدور

(9) چھوٹے کامگار

(10) لاوارث افراد اور

(11) مقروض افراد

ہم دیکھنے اور جاننے کی کوشش کریں گے مسلمان معاشرے میں اور عام معاشرے میں ان افراد کے حالات کیا ہیں اور ان کے حقوق و معاملات کے باب میں کیا کوششیں کی جارہی ہیں۔ حکومت کی جانب سے اس سمت میں کیا اقدامات کیے گئے ہیں اور ان کا کتنا فائدہ ان تک پہنچ رہا ہے۔ نیز اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کے لیے کیا انتظامی اور اجتماعی ڈھانچہ بنانا چاہیے تاکہ ان کے حقوق کو محفوظ اور متحقق کیا جاسکے۔ ذیل میں ہم اوپر مذکورہ ہر طبقہ کا الگ الگ مطالعہ کرکے ان کی صورتحال جاننے کی کوشش کریں گے۔ یہ مطالعہ ہندوستان کے دستوری اور قانونی چوکھٹے کا بھی جائزہ لے گا اور مسلم معاشرہ اور ہندوستانی سماج کو بھی زیر بحث لائے گا تاکہ ایک پوری تصویر ہمارے سامنے ہو اور ہمیں ایک نتیجہ پر پہنچنے میں مدد دے۔

■❖■

یتیم اور بے سہارا بچے

یہ ہمارے سماج کا کمزور ترین حصہ ہے۔ یتیم سے مراد وہ بچے اور بچیاں ہیں جن کے ماں یا باپ یا دونوں سن بلوغ تک پہنچنے سے پہلے فوت ہوجاتے ہیں۔ ماں باپ اولاد کے لیے دنیا میں سب سے بڑا مادی اور روحانی سہارا ہوتے ہیں۔ ماں باپ نہ صرف ان کی پرورش کرتے ہیں بلکہ ان کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کو پوری کرتے ہیں اور ہر طرح سے ان کی حفاظت اور سرپرستی کرتے ہیں۔ مگر جب ماں یا باپ یا دونوں دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں تو ایک بچہ بالکل بے سہارا اور محتاج ہوجاتا ہے اور دوسروں کے رحم و کرم پر جینے کے لیے مجبور ہوجاتا ہے۔ جو والدین غریب ہوتے ہیں اور ان کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہوتا ان کے بچے تو اور بھی محتاج اور آفت زدہ ہوجاتے ہیں۔ جن کے پاس سرمایہ ہے ان کی حالت تھوڑی بہتر ہوتی ہے۔ مگر اکثر جو لوگ ان کے سرپرست بنتے ہیں وہ ان کے مال کو تلف کرلیتے ہیں یا اس کو خورد برد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہرحال یتیمی ایک بہت ہی تکلیف دہ صورتحال ہے اور جو بچے ان حالات سے دوچار ہوتے ہیں وہ ہماری توجہ کے اولین مستحق ہیں۔

یونیسیف کی تعریف کے مطابق جن بچوں کے ایک یا دونوں والدین فوت ہوچکے ہیں یا جنہیں لاوارث چھوڑ دیا گیا ہے وہ یتیم کی تعریف میں آتے ہیں۔ یونیسیف کے

مطابق 30 اکتوبر 2018 کے ایک تخمینہ کے مطابق ہندوستان میں 29.6 ملین بچے یتیم تھے، اس طرح بھارت کی 4% آبادی یتیم تھی۔ ہندوستان کی شمالی اور جنوبی ریاستوں اور نسبتاً دولت مند ریاستوں کے مقابلے جو ریاستیں معاشی اعتبار سے پسماندہ ہیں وہاں یتیم بچوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ یوپی، مدھیہ پردیش، بہار اور بنگال میں یتیموں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ان تمام ریاستوں میں 6 ملین یتیم بچے ہیں جن کی تعداد 2021 میں 7.1 ملین ہو جانے کی امید ہے۔ کووڈ-19 میں بہت سے بچے ماں باپ سے محروم ہو چکے ہیں، جن پر خصوصی توجہ دینے کے لیے سول سوسائٹی اور عدالتوں نے حکومت کو متوجہ کیا ہے۔

حکومت ہند کی چائلڈ لائن پورٹل کے مطابق یونیسیف نے تخمینہ لگایا ہے کہ 2007 میں بھارت میں 25 ملین بچے یتیم تھے۔ دوسرے مطالعہ کے مطابق 44 ملین بچے نادار (Destitute) ہیں جن میں 12 ملین یتیم اور بے سہارا ہیں۔ 70 فیصد یتیم بچے شیڈول کاسٹ، شیڈول ٹرائبس اور او بی سی خانے سے آتے ہیں۔ 13 فیصد بچے صرف ایک والدین کے ساتھ رہتے ہیں جن میں 85% صرف ماں کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ زیادہ تر بچے شفقت پدری سے محروم ہوتے ہیں۔ یتیمی اور غربت کی وجہ سے ہی بچہ مزدوری اور بچوں کی اسمگلنگ ہوتی ہے جو اس مسئلہ کا سب سے دردناک پہلو ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان کے دستور اور قانون میں اس سلسلے میں کیا رہنمائی ملتی ہے اور حکومت کی جانب سے کیا اقدامات کیے گئے ہیں۔ دستور ہند کے پارٹ-III میں بنیادی حقوق کا ذکر ہے۔ جس کی دفعہ 21 جس کا تعلق زندگی اور انفرادی آزادی کے تحفظ سے متعلق ہے میں سپریم کورٹ کے مختلف فیصلوں کی روشنی میں اس کے معنی، مفہوم اور اطلاق میں روز افزوں توسیع کی جاتی رہی ہے۔ لہٰذا زندگی کے حق کے باب میں زندگی گزارنے کے لیے بنیادی وسائل فراہم کرنے یعنی (Right to Livelihood)، صحت، مکان، تعلیم، بچوں کے ساتھ زیادتی کرنے والوں کو سزا، بچوں کو کسی جرم پر مارنے یا ان کے ساتھ زیادتی کرنے، صاف پانی کی فراہمی وغیرہ کو زندہ رہنے کے بنیادی حق میں شامل

کیا گیا ہے۔ دراصل ایک فلاحی ریاست میں اسٹیٹ خاص طور پر یتیم اور بے سہارے بچے کے والدین (Parents) کا کردار ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا دستور کی دفعہ 21 کے تحت ایک بچے کو تمام بنیادی حقوق فراہم کرنا اسٹیٹ کی ذمہ داری مانی جاتی ہے۔ دفعہ 23 میں انسانی اسمگلنگ اور جبری مزدوری پر روک کی بات کہی گئی ہے جس کا اطلاق بڑوں کے ساتھ بچوں پر بھی ہوتا ہے۔ دفعہ 24 میں 14 سال سے کم عمر کے بچوں کو کسی فیکٹری یا مائن میں کام کرنے پر پابندی ہے خاص طور سے ایسی انڈسٹری جو ان کی صحت کے لیے مضر ہو۔ اس طرح بنیادی حقوق کے باب میں انہیں عزت اور حفاظت کے ساتھ جینے کا حق دیا گیا ہے۔

دستور ہند کے پارٹ-VI میں جو ریاست کو رہنما اصول دیے گئے ہیں۔ ان میں دفعہ 45 کے تحت 14 سال تک کے بچوں کو لازمی اور مفت تعلیم کے انتظام کی بات کی گئی ہے۔ دفعہ 46 میں شیڈول کاسٹ، شیڈول ٹرائبس اور دیگر کمزور طبقات کے تعلیمی اور معاشی مفادات کو بڑھانے کی بات کہی گئی ہے جس میں ان طبقات کے بچے بھی آتے ہیں۔ اسی طرح دفعہ 47 میں لوگوں کے تغذیہ میں بہتری لانے، ان کی معیار زندگی بلند کرنے اور عوامی صحت کو بہتر بنانے کی بات کہی گئی ہے۔ ان تمام نکات میں بچوں کی فلاح بھی شامل ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دستور ہند نے اس باب میں واضح رہنمائی دی ہے اور عدالت کے فیصلوں نے اس کو اور بھی وسیع بنادیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ حکومت نے اس سلسلے میں کیا قوانین بنائے ہیں اور موجودہ صورتحال کیا ہے؟

حکومت ہند نے ان دستوری تحفظات اور رہنما اصولوں کی روشنی میں سن 2006 میں مربوط تحفظ اطفال اسکیم جو انگریزی میں Integrated Child Protection Scheme (ICPS) کہا جاتا ہے کی تجویز رکھی جس کا نفاذ 2009 میں ہوا۔ یہ تحفظ اطفال کے باب میں ایک فلیگ شپ اسکیم ہے جس کے تحت صفر سے چھ (0-6) سال کے بچوں کو معاون تغذیہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو چھ جان لیوا بیماریوں سے بچنے کے ٹیکے بھی لگائے جاتے ہیں اوران کی ذہنی و جسمانی نشوونما کے لیے زبانی تعلیم اور کھیل کود کا بھی نظم کیا جاتا ہے۔

یہ ساری سہولیات آنگن باڑی مراکز کے ذریعہ فراہم کیے جاتے ہیں۔ ان مراکز کا خاص مقصد بچوں کو غربت، جرائم سے دور رکھتے ہوئے محفوظ مقام عطا کرنا ہے۔ ساتھ ہی ان کو مختلف امراض سے محفوظ رکھنا ہے بچوں کو گداگری اور چائلڈ ٹرفیکنگ سے بچانا بھی ہے۔ ان مراکز کا خاص اور سماج کے کمزور ترین طبقوں کے بچوں مثلاً شیڈول کاسٹ، شیڈول ٹرائبس، پس ماندہ برادریاں اور اقلیتوں کے بچوں کو ایک محفوظ اور صحت مند زندگی بہم پہنچانا ہے۔ اس کام میں حکومت اور عوام دونوں اگر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں تو اس مقصد کو زیادہ بہتر اور مؤثر طور پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس وقت پورے ملک میں سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 13.77لاکھ آنگن باڑی مراکز ہیں جس میں 12.8 لاکھ ورکر کام کررہے ہیں اور ان کی 11.6لاکھ ہیلپر ہیں۔ جنوری 2019 میں شائع شدہ ایک رپورٹ کے مطابق (PIB Release Jan 2019) ان تمام اداروں کے تحت پورے ملک میں 78000 بچے فیضیاب ہوئے ہیں۔ اور حکومت نے کل 1500 کروڑ روپے اس پر خرچ کیے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ فی بچہ دو روپیہ یومیہ ان پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو یہ رقم ضرورت سے بہت کم ہے۔ ان اداروں کو اور بھی چاق و چوبند بنانے کی ضرورت ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کا نٹ ورک وسیع کیا جائے، ان اداروں میں کام کرنے والی خواتین کو زیادہ بہتر ٹریننگ دی جائے، ان کے اندر خدمت کا جذبہ پیدا کیا جائے نیز ان کا گزارہ بھتہ اور معاوضہ بڑھایا جائے۔

یہ پوری اسکیم وزارت اطفال اور ترقی خواتین کے تحت آتی ہیں جن میں حاملہ خواتین، دودھ پلانے والی مائیں، نابالغ بچیاں اور دیگر خواتین بھی آتی ہیں۔ وزارت اطفال اور خواتین گرچہ نسل انسانی کے تحفظ اور صحت مند نشو ونما میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مگر حکومت کے دیگر وزارت کے مقابلے اس کی اہمیت کم ہے۔ اس لیے بجٹ میں اس پر خرچ بھی بہت کم کیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کو ترجیحی دائرے میں رکھنا چاہیے۔ چلی کی مشہور شاعرہ اور ادب میں نوبل انعام حاصل کرنے والی ڈپلومیٹ، ایڈوکیٹ اور انسانیت نواز

شاعرہ گیبرل مسٹرال (Gabriel Mistral 7 April 1889-10 January 1957) نے بچوں کی ترقی کو انسانی ترقی سے جوڑ کر دیکھا ہے۔ ان کی رائے میں باقی تمام چیزوں کو روکا یا مؤخر کیا جاسکتا ہے، لیکن بچوں کو نہیں۔ ان کے خوبصورت الفاظ اس طرح ہیں:

"We are guilty of many errors and many faults, but our worst crime is abandoning the children, neglecting the fountain of life. Many of the things we need can wait. The child cannot. Right now is the time his bones are being formed, his blood is being made, and his senses are being developed. To him we cannot answer 'Tomorrow,' his name is today."

''ہم بہت سی غلطیوں اور کوتاہیوں کے ملزم ہیں، لیکن ہمارا سب سے بڑا جرم اپنے بچوں کو بے سہارا چھوڑ دینا ہے اور زندگی کے سرچشمہ کو نظر انداز کر دینا ہے۔ ہمیں جن چیزوں کی ضرورت ہے ان میں بہت سے چیزیں رک سکتی ہیں، مگر ایک بچے کو نہیں روکا جاسکتا۔ ابھی وقت ہے جبکہ اس کی ہڈیاں بن رہی ہیں، اس کا خون بن رہا ہے، اس کے حواس نمو پذیر ہو رہے ہیں، ہم اس کا جواب کل نہیں دے سکتے اس کے لیے تو بس آج ہی اس کا نام ہے۔''

غریب، نادار، یتیم اور بے سہارا بچوں کے باب میں یہ مسئلہ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔

■❖■

ہندوستان کے مسلمان معاشرے میں یتیم اور بے سہارا بچوں کا حال

2019 کے حالیہ سروے کے مطابق ہندوستان میں مجموعی طور پر 2.9 کروڑ یتیم اور بے سہارا بچے ہیں۔ ان میں مسلمان بچوں کی تعداد کتنی ہے اس کا الگ سے کوئی ڈاٹا موجود نہیں ہے۔ ہندوستان میں مجموعی طور پر مسلمانوں کی آبادی بیس کروڑ ہے جو کل آبادی کا کم وبیش 15 فیصد ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی افزائش آبادی اور شرح اموات کم وبیش ایک جیسی ہے۔ اگر مسلمانوں کی آبادی ملک میں 15 فیصد ہے اور کل یتیم، بے سہارا بچوں کی تعداد کا تناسب نکالتے ہیں تو 2.9 کروڑ میں چار لاکھ پچاس ہزار یتیم اور بے سہارا بچے مسلمان ہوں گے۔

اگر آپ ہندوستان میں بڑے شہروں میں جھگی جھونپڑی (Slum) کا جائزہ لیں، ریلوے پلیٹ فارم اور سڑکوں پر زندگی گزارنے والے بچوں کا جائزہ لیں، کوڑے ڈھیر میں ردی کاغذات چننے والے بچوں کا جائزہ لیں، بھیک مانگنے والے بچوں کو دیکھیں تو ان میں آپ کو مسلمان بچوں کی ایک بڑی تعداد ملے گی۔ فلم سلم ڈاگ ملینیم میں جن کرداروں کو دکھلایا گیا ہے، ان میں زیادہ تر مسلمان تھے جو بڑی حد تک ہمارے سماج کی عکاسی کرتے ہیں۔

اکثر اخبارات میں یہ خبر پڑھنے کو ملتی ہے کہ پولیس نے بچوں کو گجرات، مہاراشٹر یا اور ریاستوں میں لے جارہے بچوں کے گروہ کو پکڑا اور ان بچوں کو ان کے چنگل سے آزاد کرایا ان میں غریب بچوں کے ساتھ ساتھ ایک بڑی تعداد یتیم بچوں کی ہوتی ہے جن کے سرپرست یا تو ان بچوں کو ایسے لوگوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں یا پھر ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے ان کے حوالے کردیتے ہیں۔ قالین بافی کا سارا کاروبار چھوٹے بچوں کے نازک ہاتھوں کا کمال ہوتا ہے، اسی طرح سے یہ چمڑہ فیکٹری اور کئی دوسری خطرناک فیکٹریوں میں کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جہاں ان کے لیے نہ تو کام کرتے وقت کوئی حفاظتی انتظام ہوتا ہے اور نہ بعد میں ان کے لیے دوا علاج کی کوئی سہولت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سے بچے جسمانی طور پر معذور ہوجاتے ہیں یا بچپن میں ہی مہلک بیماریوں کے شکار ہوجاتے ہیں۔

مسلم سماج کا خاندانی نظام مضبوط اور مستحکم ہے۔ عموماً مسلمان معاشرے میں مشترکہ خاندان تو نہیں پایا جاتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے پاس فی الوقت نہ بڑی جائداد ہے اور نہ بڑا کاروبار ہے۔ اس لیے اندرونی طور پر مشترکہ خاندانی نظام کے لیے مسلمان معاشرے میں کوئی مستحکم بنیاد نہیں ہے۔ لیکن ان کے یہاں وسیع خاندان (Extended Family) کا تصور پایا جاتا ہے دوسرے صلہ رحمی یعنی دودھ اور خون کے رشتوں کا احترام بھی کسی درجہ میں موجود ہے۔ اس لیے اگر کوئی یتیم اور بے سہارا ہے تو اس کے ساتھ لوگوں کی فطری ہمدردی ہوتی ہے اور گھر کے اندر اور باہر سماج میں ایسے کئی لوگ ہوتے ہیں جو ان کی مدد کے لیے آگے آتے ہیں۔ مگر چونکہ مسلمانوں کی عام مالی حالت خود کمزور ہوتی ہے اس لیے اس طرح کی مدد وقتی، ہنگامی ہونے کے ساتھ ساتھ محدود بھی ہوتی ہے جو ان کی ضرورتوں کی تکمیل نہیں کرتی، اس لیے ایسے لوگوں کی زندگی بہت دکھ تکلیف میں گزرتی ہے۔

ان دنوں مدارس اسلامیہ کے سلسلے میں بہت سی بے تکی اور بے بنیاد باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ مدارس اسلامیہ صرف دینی تعلیم کا ادارہ نہیں

ہے بلکہ وہ سماجی تحفظ کا بھی ادارہ ہے۔ بلاشبہ مدارس اسلامیہ میں بہت سی چیزیں اصلاح طلب ہیں اور اس میں اصلاح ضرور کرنی چاہیے لیکن اس کے سماجی تحفظ کے کردار کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق مدارس اسلامیہ میں کل چار فیصد بچے تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ ان میں صرف ایک فیصد بچے کھاتے پیتے گھرانوں سے آتے ہیں باقی تین فیصد بچے یا تو بالکل غریب، نادار، پسماندہ گھرانوں اور برادریوں سے آتے ہیں یا پھر یتیم اور بے سہارا ہوتے ہیں جن کے کھانے پینے، رہنے، لباس، پوشاک، تعلیم اور صحت سب کا انتظام مدرسہ کے ذمہ ہوتا ہے۔ باقی تمام باتوں کو چھوڑ دیا جائے اگر صرف اسی ایک بات پر دھیان دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مدرسے میں جو لاکھوں بچے تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ ان میں ایک بڑی تعداد یتیم اور بے سہارا بچوں کی ہے یہ ایک ایسا ٹھوس انتظام ہے جس کی وجہ سے سالانہ لاکھوں، بچوں کی کفالت اور تعلیم کا نظم کیا جاتا ہے۔

عام مدارس کے علاوہ پورے ہندوستان میں کم وبیش تمام ریاستوں میں لڑکے اور لڑکیوں کے لیے الگ یتیم خانہ بھی ہیں جہاں ان کی کفالت کے ساتھ تعلیم کا نظم بھی ہوتا ہے اور کئی اداروں میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری اور تکنیکی تعلیم بھی دی جاتی ہے تاکہ بڑے ہوکر وہ بچے خود کفیل ہوجائیں اور عزت وخوشحالی کی زندگی بسر کریں اور ایسے ہزاروں طلباء ان اداروں سے کامیاب ہوکر سالانہ نکلتے ہیں۔

اس طرح اپنی غربت اور کمزوری کے باوجود مسلمان معاشرہ بغیر کسی سرکاری مدد کے ایسے سیکڑوں ادارے چلا رہا ہے اور اس کے ذریعے سالانہ کم وبیش ایک لاکھ بچوں کی کفالت ہوتی ہے تاہم یہ کوششیں ضرورت کے لحاظ سے ناکافی ہیں اور دوتہائی سے زیادہ بچے محروم رہتے ہیں۔

غربت اور جہالت کے سبب مسلمان بچوں میں تغذیہ کی کمی، خون کی کمی، کمزور اور دبلا پتلا ہونا، پست قد ہونا (Stunted Growth) عام ہے اور اکثر بچے پانچ سال سے پہلے فوت ہوجاتے ہیں۔ ان میں یتیم اور بے سہارا بچوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اس طرح

مجموعی طور پر مسلمان معاشرے میں یتیم اور بے سہارا بچوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے جس پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا بہت سا قیمتی انسانی سرمایہ ہر سال ضائع ہوجاتا ہے جو ملک وملت دونوں کا نقصان ہے۔ لہٰذا اپنے قیمتی انسانی جانوں کی حفاظت اور صحیح نشوونما نہ صرف ایک اہم انسانی فریضہ ہے بلکہ ایک مضبوط معاشی عمل بھی ہے۔ کیونکہ انسان وسیلہ بھی ہے اور حاصل وسیلہ بھی (Man is means and an end both)

ہندوستان کے مسلم سماج کی اخلاقی حالت اچھی نہیں ہے۔ سہل پسندی، آرام طلبی اور عیش کوشی نے ان کو اندر سے کھوکھلا کردیا ہے۔ اپنی محنت اور ذہانت کے ذریعہ حصول رزق کی جدوجہد کرنے کے بجائے دوسروں کے مال و دولت کو حرص و ہوس کے ذریعہ ناجائز طور پر حاصل کرنے کا رجحان غالب ہے۔ شادی بیاہ میں تلک جہیز کی لعنت اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ عام طور پر والدین کی جائداد میں بہن کا حصہ نہ دینا اور اپنے نابالغ اور کمزور بھائیوں کا حق مارلینا یا ان کو ان کے حصے سے کم دینا یا اپنے لیے اچھا اور ان کے لیے خراب مال کا انتخاب کرنا یہ عام بات ہے۔ اس ماحول میں اگر کسی بھائی کا انتقال ہوجاتا ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ان کے ساتھ رحمت و رافت کا برتاؤ کرنے کے بجائے شقی القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یا تو اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے یا انہیں مجبور محض رکھ کر ان کے ساتھ نوکروں اور غلاموں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ رشتہ دار اور سماج کے لوگ یہ سارا ظلم دیکھتے ہوئے بھی اس کو روکتے ٹوکتے نہیں ہیں کیونکہ ان کی اپنی اخلاقی حالت بھی ان کو جرأت مند اقدام سے روکتی ہے۔

دادا کی وراثت میں سے پوتے کو محروم رکھنے کے لیے ہمارے یہاں مجوب کی ایک اصطلاح بہت عام ہے۔ یہ قرآن و حدیث کی وضع کردہ کوئی اصطلاح نہیں ہے۔ لغت کی رو سے مجوب کا مطلب حجاب کیا ہوا۔ پردہ میں، پوشیدہ مخفی وغیرہ ہے۔ دوسرے یعنی شرمندہ، نادم اور منفعل ہیں۔ ان معنی سے حق وراثت سے محرومی کا کوئی مفہوم ظاہر نہیں ہوتا

ہے تاہم یہ اس قدر مستعمل ہے کہ اس سے حق وراثت سے محرومی ہی مراد لی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے وارثت کا جو قانون دیا ہے اس کی رو سے باپ کی حیات میں بیٹے کا جائداد پر کوئی حق نہیں ہوتا ہے۔ باپ کی وفات کے بعد جو بیٹے بیٹیاں حیات سے ہیں وہی جائداد کے براہ راست وارث ہوتے ہیں۔ چونکہ باپ کی حیات میں ہی بیٹے کا انتقال ہوگیا اس لیے اس بیٹے یا اس کے وارثان کو اس جائداد میں براہ راست حصہ رسدی متعین طور پر نہیں ملتا ہے۔ یہ بات قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ مگر قرآن کا اور اسلام کے قانون وراثت کا غور سے مطالعہ کریں تو معلوم یہ ہوگا کہ ایک شخص کو اپنی جائداد میں 1/3 حصہ تک وصیت کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ اور یہ وصیت ان کے حق میں نہیں کی جاسکتی جو پہلے سے وارث ہیں۔ وصیت اس کے حق میں ہوگی جو وارث نہیں ہے، یعنی از روئے شرع جس کا جائداد میں براہ راست حق نہیں پہنچتا۔ اس صورت میں دادا اگر چاہے تو اپنے مرحوم بیٹے کی بیوی بچوں کے حق میں اپنی جائداد کا ایک تہائی تک وصیت کرسکتا ہے۔ بلکہ ایسا کرنا صلہ رحمی کے مطابق عین تقاضائے اخلاق و انسانیت ہے۔

شریعت نے اس کو لازم اور واجب کرنے کے بجائے دادا، دادی، نانا، نانی پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے باقیات کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ اگر وہ ان کے ساتھ صلہ رحمی کے بجائے قطع رحمی کا معاملہ کرتے ہیں تو یہ گناہ کبیرہ میں سے ایک گناہ ہے جس کے وبال سے کوئی بچ نہیں سکتا ہے۔ لہٰذا شریعت نے پوری گنجائش چھوڑی ہے، اب اگر کوئی شقی القلبی کا مظاہرہ کرتا ہے تو اسے اخلاقی طور پر تو پابند کیا جاسکتا ہے مگر قانونی طور پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ایک بات اور ہے جو قابلِ توجہ ہے۔ چچا یتیم بھتیجے اور بھتیجی کا قانونی وارث ہوتا ہے اور اس پر ان کی کفالت اپنے بچوں کی طرح فرض ہے۔ جس سے وہ کسی حال میں روگردانی نہیں کرسکتا ہے اس طرح قانونی اور اخلاقی دونوں پہلوؤں سے ایسے بچوں کو پورا تحفظ دیا گیا ہے لیکن چونکہ معاشرے میں غربت عام ہے اور لوگوں کی اخلاقی حالت بھی اچھی نہیں ہے اس لیے لوگ یتیم بچوں کی کفالت میں مجرمانہ کوتاہی برتتے ہیں۔ جس کی وجہ سے

مسلمان معاشرے میں یتیموں کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ یہ سماجی اصلاح کا وہ پہلو ہے جس پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ تصادم ایک اٹل سماجی، سیاسی حقیقت ہے۔ فسادات زیادہ تر مذہبی وجوہات سے ہوتے ہیں لیکن اس کا محرک سیاسی ہے۔ ہندوستان میں کئی ایسی سیاسی پارٹیاں ہیں جو اقتدار میں آنے یا اپنے اقتدار کو دوام و استحکام بخشنے کے لیے فسادات کا سہارا لیتی ہیں۔ آزادی کے قبل سے ہی بعض سیاسی وجوہات کی وجہ سے ہندو مسلم کشمکش کو ہوا دی گئی جو دھیرے دھیرے اس قدر پھیل گئی کہ اس وقت دونوں قوموں میں ایک دوسرے کے بارے میں زبردست عدم اعتماد بلکہ عناد پایا جاتا ہے۔ لہٰذا ذرا ذرا سی بات پر دونوں بڑی آسانی سے لڑنے بھڑنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ مسئلہ اس وقت سنگین ہوجاتا ہے جب حکومت کے اعلیٰ مناصب پر بیٹھے ہوئے لوگ پولیس اور انتظامیہ فسادیوں کے ساتھ ہوجاتے ہیں یا خود فسادی بن جاتے ہیں۔ اس صورت میں مسلمانوں کے جان و مال کا نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ہونے والے تمام فسادات میں اب تک مسلمانوں کا نقصان زیادہ ہوا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ فساد کا مقصد کیا ہے اور فساد کون کراتا ہے اور کیوں کراتا ہے؟

جب کبھی بھی قدرتی یا انسانی آفات آتے ہیں تو اس کی زد میں سب سے زیادہ کمزور طبقات ہی آتے ہیں۔ ان کمزور طبقات میں عورتیں اور بچے سب سے زیادہ کمزور ہیں۔ لہٰذا وہی سب سے زیادہ اور سب سے پہلے متاثر ہوتے ہیں۔ آزاد ہندوستان میں اب تک آزادی کے بعد ملک کے کم و بیش تمام ریاستوں میں سینکڑوں کی تعداد میں فسادات ہوچکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ہر فساد میں سو پچاس جانیں جاتی ہیں جن میں اکثریت مسلمان ہوتی ہے۔ بعض بڑے فسادات ہوتے ہیں جن میں ہلاکتوں کی تعداد ہزاروں تک گئی ہے جس کو بجا طور پر نسل کشی کہا جاسکتا ہے۔ اس طرح ہندوستان میں قدرتی آفات کے علاوہ فسادات میں ہلاک ہونے کی وجہ سے ہر سال سینکڑوں کی تعداد

میں بچے یتیم اورعورتیں بیوہ ہوتی ہیں۔اس طرح فساد ایک ایسا انسانی مسئلہ ہے جو پوری طرح انسانی عمل کا نتیجہ ہے۔ جس کو بڑی آسانی کے ساتھ روکااور ختم کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ کوئی حکومت ایسا کرنا چاہے۔

فسادات کے انسانی پہلو کو دھیان میں رکھتے ہوئے اس کی ہولنا کی کو کم کرنے کے لیے سول سوسائٹی ایک لمبے عرصے سے مطالبہ کررہی ہے کہ فسادات کی روک تھام کے لیے مؤثر قانون بنایا جائے اور اس کے نقصان کی تلافی کے لیے معاوضہ اور کفالت کا معقول نظم کیا جائے تاکہ فسادات میں متاثر خاندانوں بالخصوص عورتوں، بچوں کی صحیح ڈھنگ سے تعلیم و تربیت اور کفالت کی جاسکے۔مگر ابھی تک مرکزی اور ریاستی حکومتیں ایسا کوئی قانون بنانے سے گریز کرتی رہی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارا پولیٹکل کلاس کس قدر انسانی جذبات واحساسات سے غافل ہے اور کیسے لوگوں کی مصیبت کو اپنے لیے ایک موقع مان کر اقتدار کی روٹی سینکنے میں مصروف ہے۔

بہرحال اس پورے منظر نامے سے آپ کو مسلمان معاشرہ میں یتیم بچوں کی نوعیت اور ان کی صورتحال کا ایک سرسری سا اندازہ ہوگیا ہوگا جو بہرطور پر سماج اور حکومت دونوں سے فوری توجہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔آئندہ سطور میں ہم اسلام میں یتیموں کے حقوق کے باب میں جو احکامات اور ہدایات ہیں ان کا جائزہ لیں گے اور اس سے کیا فکری اور عملی رہنمائی ملتی ہے اس پر گفتگو کریں گے۔

■❖■

اسلام میں یتیموں کے حقوق

انیسویں صدی کے مشہور برٹش مورخ تھومس کارلائل (Thomas Carlyle) 1795-1881 نے لکھا ہے کہ دنیا کی تاریخ عظیم انسانوں کی سوانح حیات ہے۔ بیسویں صدی کے مشہور برٹش فلسفی برٹرینڈ رسل (Bertran Russell) 1872-1970 نے اپنی کتاب میرج اینڈ مورلس (1929) میں لکھا ہے کہ دنیا کے عظیم انسانوں کی اکثریت یتیم تھی یعنی دنیا میں اب تک جتنے عظیم انسان پیدا ہوئے ہیں ان کی اکثریت یتیم رہی ہے یا تو وہ یتیمی کی گود میں پیدا ہوئے یا بچپن میں ہی ان کی ماں یا باپ یا دونوں کا انتقال ہوگیا۔ اسلام کی تاریخ سے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس طرح کارلائل اور رسل دونوں کے جملوں کو ملا دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی تاریخ عظیم مگر یتیم انسانوں کی سوانح حیات ہے جنھوں نے نہ صرف تاریخ سازی کی ہے بلکہ حیات و کائنات میں ان مٹ نشان چھوڑے ہیں۔

حضور سرور کونین حضرت محمد ﷺ یتیمی کی گود میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش سے قبل ہی آپ ﷺ کے والد جناب عبداللہ کا انتقال ہوگیا تھا، لہٰذا آپ ﷺ بعد الموت پدر (Posthumous Child) پیدا ہوئے تھے۔ جب آپؐ چھ سال کے ہوئے تو آپؐ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کا انتقال ہوگیا۔ بارہ سال تک آپؐ اپنے دادا عبدالمطلب کے زیر سرپرستی رہے پھر ان کے انتقال کے بعد چچا ابوطالب کی سرپرستی میں آئے۔ اس طرح

حضورؐ کا پورا عہد طفولیت یتیمی کے زیر سایہ گزرا۔ لہٰذا آپ سے زیادہ یتیموں کا کون بہی خواہ ہوسکتا تھا۔

حضورؐ کی بعثت سے قبل عربوں میں ہر چھوٹی بڑی بات پر قبائلی جنگیں ہوتی رہتی تھیں جونسل درنسل چلتی رہتی تھیں۔ لہٰذا ان جنگوں میں اکثر مرد مارے جاتے تھے۔ اوراس معاشرے میں یتیموں اور بیواؤں کی کثرت ہوتی تھی۔ جن کے شوہر مرجاتے تھے یا مارے جاتے تھے ان کی بیویاں دوسرے مرد سے شادی کرلیتی تھیں مگر بچوں کو وہ کبھی اپناتے اور کبھی نہیں اپناتے تھے، جن کی پرورش قبائلی روایات کے مطابق نانیہال یا دادیہال میں ہوتی تھی تاہم ان کے حقوق متعین نہیں تھے۔ عربوں میں بیوگان کی شادی اور تعدد ازدواج کی بنیادی وجہ ان کی آپسی قبائلی جنگیں تھیں جو بعد میں رواج عام ہوگیا اور جسے شریعت اسلامی نے بھی بعض شرطوں کے ساتھ جواز کا پیرہن عطا کردیا۔

اسلام نے یتیموں کے سلسلے میں بہت تفصیلی اور واضح احکامات دیے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام یتیموں کے معاملے میں کتنا حساس ہے اوران کے حقوق کے بارے میں کس قدر مستعد ہے۔

اسلام میں یتیم کی کیا اہمیت ہے، اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ یتیم ہی ہیں جن کے حقوق محفوظ رکھنے کے لیے اللہ نے سورہ النساء میں پورے قانون وراثت نازل فرمائے اور بتایا کہ مرنے والے کی جائداد میں کس کا اور کتنا حق ہے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ جنگ احد میں مسلمان جیتی بازی ہار گئے اور ایک معمولی چوک کی وجہ سے ستر صحابہ شہید ہوگئے تھے۔ انہی میں ایک حضرت سعد بن ربیع بھی تھے۔ جنگ احد کے بعد حضرت سعد کی بیوی اپنی دو بچیوں کو لیے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ سعد کی بچیاں ہیں جو آپ کے ساتھ احد میں شہید ہوئے ہیں۔ ان کے چچا نے پوری جائداد پر قبضہ کرلیا ہے اور ان کو ایک حبہ تک نہیں چھوڑا ہے۔ اب بھلا ان بچیوں سے کون نکاح کرے گا۔ اس واقعہ کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں:

''لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے۔ پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔'' (النساء:9)

پھر اس کے بعد یتیموں کے باب میں تفصیلی احکامات دیے گئے ہیں جو اسلام کے عائلی اور خاندانی نظام کی پوری طرح وضاحت کرتے ہیں۔

قرآن پاک کا پہلا حکم یہ ہے کہ یتیموں کے ساتھ سختی نہ کی جائے۔ (107:9) اور انہیں دھکے نہ دیے جائیں (108:2) بلکہ ان کے ساتھ تکریم سے پیش آیا جائے۔ یتیم کو دھکے دینا اور ان سے عزت کا سلوک نہ کرنا انکار آخرت کی نشانی ہے۔ جس پر بڑی وعید آئی ہے۔

ترجیحی بنیاد پر یتیموں کی عزت اور خبر گیری ایک صاحب ایمان فرد اور معاشرے کا طرۂ امتیاز ہے چنانچہ قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ قرآن نے ایک اچھے اسلامی معاشرے کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا ہے کہ:

''اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔'' (الدھر 76:9-8)

یہ ایک مومن کا کردار ہے کہ وہ نہ تو احسان جتاتا ہے اور نہ تکلیف دیتا ہے بلکہ انسانوں کی بے لوث خدمت کرتا ہے۔ اس کا سارا تعلق اللہ سے ہے اور وہ اسی سے ڈرتا ہے اور اسی سے اجر کا طالب ہوتا ہے۔

ان ضروری اخلاقی ہدایات کے بعد قرآن پاک میں یتیموں خصوصاً یتیم بچیوں کے بارے میں ضروری ہدایات دی ہیں:

(1) وہ تم سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں (کہ ان کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے) کہو جس میں ان کی بھلائی ہو وہ بہتر ہے۔ اگر تم ان کو کھانے پینے اور رہنےسہنے میں اپنے ساتھ ملا کر رکھو تو (بھی کوئی حرج نہیں کیوں کہ) وہ تمہارے بھائی ہیں،اللہ جانتا ہے کون بگاڑنے والا ہے اور کون بنانے اور سنوارنے والا۔ اللہ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا، وہ غالب وحکیم ہے۔'' (البقرہ:220)

(2) یتیموں کا مال ان کو واپس دو، اچھے مال کو برے مال سے نہ بدلو اور ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے۔(النساء:2)

(3) اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار نکاح کرلو۔لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضے میں آتی ہیں ، بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔(النساء:3)

ان آیات میں تعدد ازدواج کی ایک غایت یتیموں سے نکاح ہے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حدود اور قیود کا ذکر ہے اور نا انصافی سے بچنے کی تاکید ہے۔

(4) اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں، پھر اگر تم ان کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالے کردو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ حد انصاف سے تجاوز کرکے اس خوف سے ان کے مال جلدی جلدی کھاجاؤ کہ بڑے ہوکر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا جو سرپرست مال دار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقے سے کھائے۔ پھر جب ان کے مال ان کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنالو، اور

حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔ (النساء:6)

(5) بے شک وہ لوگ جو یتیموں کے مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔ (النساء: 10)

(6) یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقے سے جو بہترین ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائیں۔ (الانعام: 151)

قرآن پاک کے علاوہ حدیثوں میں یتیموں کی خبر گیری، پرورش، کفالت اور شفقت کے باب میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

(1) مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ برا سلوک کیا جائے۔ (ابو ہریرہ، ابن ماجہ)

(2) اے اللہ! جو شخص ان دو کمزوروں- یتیم اور عورت کا حق ضائع کرے میں اسے خطا کار اور مجرم ٹھہراتا ہوں (اور اس سے بچنے کی تاکید کرتا ہوں) ۔(مسند احمد)

(3) جو شخص کسی یتیم کو جو مسلمان ماں باپ سے ہو، اپنے کھانے پینے میں اس وقت تک ساتھ رکھے جب تک وہ (بڑا ہوکر) اس سے بے نیاز ہوجائے تو اس کے لیے جنت واجب ہوگی۔ (مالک بن الحارث، مسند احمد)

(4) میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح قریب ہوں گے۔ یہ کہہ کر آپ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا۔ (بخاری)

(5) یتیم کی کفالت کرنے والا چاہے وہ اس کا ہو یا کسی دوسرے کا وہ اور میں جنت میں اس طرح قریب ہوں گے (جیسے یہ دو انگلیاں)۔ (مسلم)

(6) جو شخص تین یتیموں کی پرورش کرے وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے رات میں قیام کیا، دن میں روزہ رکھا اور صبح و شام اپنی تلوار لیے خدا کی راہ میں جہاد کرتا رہا۔ میں اور وہ جنت میں اس طرح قریب ہوں گے جیسے یہ دو انگلیاں ہیں۔ یہ

کہہ کر آپؐ نے انگشت شہادت اور درمیان کی انگلی ملائی۔ (مسند احمد)

(7) ایک شخص نے نبیؐ سے شکایت کی کہ اس کا دل سخت ہے۔ آپؐ نے فرمایا یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا کرو اور مسکینوں اور ضرورت مندوں کو کھانا کھلایا کرو۔ (رواہ ابو ہریرہ، مسند احمد)

(8) ایک آدمی نبیؐ کے پاس آیا اور عرض کیا، میں ایک غریب آدمی ہوں، میرے پاس کچھ نہیں ہے لیکن میری سر پرستی میں ایک مالدار یتیم ہے (تو کیا میں اس کے مال میں سے کھا سکتا ہوں) آپؐ نے فرمایا تم یتیم کے معاملے میں اپنا معقول خرچ لے سکتے ہو، بشرطیکہ اسراف نہ کرو اور بالغ ہونے سے پہلے جلدی جلدی اس مال کو نہ اڑاؤ اور اپنی جائداد بنانے کی فکر نہ کرو۔ (ابوداؤد)

(9) حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول میں کن وجوہ کی بنیاد پر اپنے زیر کفالت یتیم کو مار سکتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا جن وجوہ سے تم اپنے بیٹوں کو مارتے ہو۔ یتیم کو بھی مار سکتے ہو۔ خبردار! اپنے مال بچانے کے لیے اس کا مال برباد نہ کرنا اور نہ اس کے مال کو اپنی جائداد بنانا۔ (معجم طبرانی)

ان آیات اور احادیث کا محاکمہ کیا جائے تو یتیموں کے بارے میں مندرجہ ذیل رہنما اصول ابھر کر سامنے آتے ہیں:

(1) اولاد کی محبت دنیا میں سب سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ ایک بندۂ مومن جب فوت ہونے لگتا ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے ہیں تو اس کے دل میں اپنے بیوی بچوں کے بارے میں شدید فکر لاحق ہوتی ہے۔ لیکن اسے خدا پر یقین ہوتا ہے جو تمام انسانوں کا دائمی سر پرست اور مالک ہے۔ اسے اپنے گھر والوں پر یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کی اچھی طرح خبر گیری کریں گے۔ اپنے بچوں کی طرح پالیں گے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کریں گے۔ اسے مسلمان سماج پر یقین ہوتا ہے کہ یہ سماج اس کی کفالت میں مددگار ہوگا اور اس پر کسی جانب

سے ظلم وحق تلفی ہوتی ہے تو اس کو روکے گا اس کو دور کرے گا اور اسے اسلامی ریاست پر یقین ہوتا ہے کہ ریاست کسی بچے کو بھوکا، ننگا، جاہل اور بیمار، بیکار نہیں چھوڑے گی بلکہ ہر وہ زندگی کے ہر مرحلے میں تمام ضرورت مندوں کی خبر گیری کے ساتھ یتیموں کا بھی خیال رکھے گی اور یہ کام کسی دکھاوے کے طور پر نہیں بلکہ اصلاح نیت کے ساتھ پورے خلوص اور محبت کے جذبے سے سرشار ہوکر کرے گی۔

(2) کفالت کا نظم انفرادی اور خاندانی سطح پر کیا جائے گا۔ کفالت میں کھانا، کپڑا، دوا علاج، تعلیم اور رہنے کی جگہ سب شامل ہے۔ جو خود کھائے گا وہی یتیم کو بھی کھلائے گا۔ یتیم چھوٹا بچہ ہے تو اس کی پرورش اپنے بیٹے بیٹی کی طرح کرے گا وہ اس سے شفقت محبت بھی رکھے گا اور جیسے اپنے بچوں کی غلطی پر سرزنش کرتا ہے اسی طرح یتیم کی بھی سرزنش کی جاسکتی ہے۔ مگر یاد رہے اس پر ایسی سختی یا ظلم نہ کرے جیسے کہ وہ اس کا دست نگر اور غلام ہو۔

(3) یتیم دو طرح کے ہوسکتے ہیں، ایک نادار اور دوسرا مالدار۔ اسی طرح یتیم کی کفالت کرنے والے بھی دو طرح کے ہوسکتے ہیں ایک نادار، دوسرا مالدار۔ اگر کفالت کرنے والا نادار ہے مگر اس کے زیر نگرانی جو یتیم بچہ ہے وہ مالدار ہے، اس صورت میں کفالت کرنے والا معمول کے مطابق اس مال یتیم سے یتیم کو کھلانے پلانے کے عوض خود بھی حسبِ ضرورت اس میں سے خرچ کرسکتا ہے۔ مگر یہ خرچ اس طرح نہ ہو کہ یتیم جب بڑا ہو اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھے اس وقت اس کا سارا مال ضائع ہوجائے۔ کسی نے اگر برے ارادے سے اس کے مال کو خرچ کیا تو وہ اس کے وبال سے نہیں بچ سکتا۔

(4) جو لوگ مالدار ہیں ان کے لیے بہتر ہے کہ یتیم کے مال کو ہاتھ نہ لگائیں بلکہ اس کی کفالت اپنے بچوں کی طرح کریں، جس نے یتیم کا مال ناجائز طریقے سے

کھایا یا ہڑپا گویا اس نے آگ سے اپنا پیٹ بھرلیا۔ غریب حق معاوضہ لے سکتا ہے لیکن امیر اس مال میں تصرف نہ کرے تو بہتر ہے۔

(5) کفالت اور سرپرستی صرف اس وقت تک ہے جب تک وہ نابالغ اور نادان ہے۔ جب وہ بالغ ہوگیا اور سمجھ دار ہوگیا تب تمام گواہوں کے سامنے اس کا مال اس کے حوالے کردیا جائے تاکہ پورے سماج کو معلوم ہوجائے کہ اس نے امانت میں کوئی خیانت نہیں کی۔ اس طرح سماج میں ایک مثبت پیغام جائے گا۔

(6) کسی یتیم کو کسی حال میں بے سہارا نہیں چھوڑا جاسکتا ہے، چاہے وہ مالدار ہو یا نادار اس کے جو قریب ترین وارث ہوں گے وہ اس کے وکیل اور کفیل ہوں گے۔ اگر وہ کسی وجہ سے یہ ذمہ داری قبول کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوں تو دوسرے رشتہ دار اور ریاست کو یہ ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے۔

(7) اسلام کی نظر میں جو مال ہے وہ گن گن کر جمع رکھنے کے لیے نہیں ہے بلکہ خرچ کرنے کے لیے ہے جس میں یتیم اور یسیر کا حق مقدم ہے۔ چنانچہ جہاں لوگ محروم مجوب کرنے کی بات کرتے ہیں قرآن کہتا ہے کہ جب وارثت تقسیم ہورہی ہے اور وہاں ایسے رشتہ دار آجاتے ہیں جن کا کوئی حق حصہ نہیں ہوتا انھیں بھی کچھ دے دو۔ غیر وارث کے حق میں ایک تہائی حصہ وصیت کی جاسکتی ہے تاکہ کوئی یتیم محروم نہ رہے۔

یہ ہیں قرآن پاک کی وہ ہدایات جن سے یتیم کے حقوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

دوسری طرف حدیثوں میں جن باتوں کی تلقین اور ترغیب دی گئی ہے، ان کے مطابق:

(1) وہ گھر بہت اچھا ہے جہاں یتیم کی پرورش ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے اور وہ بدترین گھر ہے جہاں یتیموں کے ساتھ بدتر سلوک ہوتا ہے۔

(2) وہ آدمی جو یتیموں کا حق ادا نہیں کرے گا وہ مجرم اور خطا کار ٹھہرے گا۔

(3) یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں حضورؐ کا ہم سایہ ہوگا، جو ایک مسلمان کے

لیے سب سے بڑی سعادت اور سب سے بڑا انعام ہے۔

(4) غریب سرپرست مال دار یتیم کے مال سے حسب ضرورت اپنی کفالت لے سکتا ہے۔

(5) یتیم کو اپنے بچے کی طرح رکھو، اسی طرح اس کو پیار اور سرزنش کرو۔

(6) اور آخری بات یہ ہے کہ دل کی سختی کا علاج کسی یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ دو دل نرم ہو جائیں گے۔

اگر ان رہنما اصولوں کے مطابق یتیم کی کفالت اور خبر گیری کی جائے تو مسلمان معاشرے میں یتیمی ماں باپ کے سایہ عاطفت سے محرومی کا بدل تو نہیں ہوسکتا مگر اس کے تمام تر خراب اثرات سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے اور یتیم کو بھی باعزت شفقت و محبت سے بھری زندگی بہم پہنچائی جاسکتی ہے۔

ہمارے پاس اس امر کا امپریکل ڈاٹا تو نہیں ہے کہ واقعتاً مسلمان معاشرہ اس آئیڈیل کے مطابق اپنے یتیموں کی دیکھ ریکھ کرتا ہے یا نہیں۔ میری گٹ فیلنگ ہے کہ ہم اس معیار پر قائم نہیں ہیں اور ہمارے معاشرے میں لاکھوں یتیم بچے بالخصوص بچیاں ظلم و استحصال کا شکار ہوتی ہیں۔ لہٰذا انسانی حقوق کے نقطہ نظر سے کمزور طبقات کی طرح یہ طبقے بھی توجہ کا محتاج ہیں، جس پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ کسی گاؤں اور شہر کے دس دس خاندانوں کا اگر رینڈم سیمپل سروے کیا جائے جہاں یتیم بچے ہیں ان میں امیر اور غریب دونوں ہوں تو اس سے مسلمان گھرانوں میں یتیموں کے حالات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

■❖■

بیوہ، مطلقہ، متروکہ
اور فسادات میں متاثر عورتیں بچے

عورت تمام معاشروں، مذاہب، اقوام اور تہذیبوں میں نامعلوم زمانے سے ایک کمزور صنف مانی جاتی رہی ہے جس کا ہمیشہ سے استحصال کیا گیا ہے اور جس کی حق تلفی کی گئی ہے۔ اسے برابر کا انسانی درجہ دینے میں بھی تامل کیا گیا ہے۔ اسے ایک پراپرٹی اور ملکیت کی طرح دیکھا اور برتا گیا ہے۔عورت کے معاملے میں دنیا ہمیشہ دو انتہاؤں کے درمیان رہی۔کبھی اسے پیدا ہوتے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا، اسے گناہ کا سرچشمہ، شیطان کے آنے کا دروازہ، ایک ناگزیر برائی مانا جاتا اور تمام تر انسانی حقوق سے محروم کرکے، ایک انسان ماننے سے بھی انکار کیا جاتا۔ اور دوسرا روپ یہ ہے کہ اسے دیوی مان کر اس کی پوجا کی جاتی اور اس کے نام پر وہ سارے کرم کانڈ اور دھرم کانڈ وضع کیے گئے جس کے بعد اس سے دنیا میں ایک انسان کی طرح جینے کے سارے اختیارات چھین لیے جاتے۔ اس کو برہنگی اور شہوانیت کا شاہ کار بنا کر اس طرح پیش کیا گیا گویا عورت کا وجود محض مرد کی شہوانی ضرورت کی تسکین کے لیے ہے، اس کا اپنا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ عورت پوری انسانی تاریخ میں ایک پنڈولم کی طرح ان دو انتہائی کے بیچ ڈولتی رہی ہے۔

جسے اپنے بارے میں فیصلہ لینے کا کبھی کوئی اختیار نہیں دیا گیا۔ جدید عورت بھی قدیم عورت سے بہت مختلف نہیں ہے تاہم حالات اور نظریات میں جوہری فرق واقع ہوئے ہیں۔ عورت میں شعور ذات پیدا ہوا ہے اور وہ اپنی انسانی حیثیت کو پانے اور منوانے کی جدوجہد میں مصروف نظر آتی ہے۔ عورت کے انسانی حقوق کے مسئلے کو اسی پس منظر میں دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔

موجودہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ سائنسی اور تکنیکی ترقی نے تمام تر سابقہ تصورات و نظریات کو یکسر تبدیل کردیا ہے۔ جیسے جیسے عورتوں کو تعلیم کے مواقع میسر آرہے ہیں اور زندگی کے مختلف میدانوں میں انہیں کام کرنے کے مواقع دیے جارہے ہیں، اس نے اپنی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر کے یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ ذہنی اور جسمانی لحاظ سے مردوں سے کسی طرح کمتر نہیں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ جسمانی اعتبار سے بالعموم اوسطاً مردوں سے کم ہے تاہم انفرادی طور پر ہر عورت ہر مرد سے کمزور نہیں ہوتی بلکہ بہت سی عورتیں بہت سے مردوں سے مضبوط ہوتی ہیں اور اس طرح کے کھیل جہاں کبھی مردوں کی ہی اجارہ داری ہوا کرتی تھی جیسے کشتی، مکے بازی، دوڑ لگانا، فٹ بال، والی بال، کرکٹ، اس میں عورتوں نے اپنی اعلیٰ جسمانی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ بہت سے ملکوں میں اب عورتیں فوج میں بھی کمیشن کی جارہی ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر انہیں مناسب مواقع آزادی اور ٹریننگ دی جائے تو وہ ہر میدان میں اپنی اعلیٰ ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا سکہ جماسکتی ہیں۔ ماضی میں عورتوں کو یہ مواقع بعض وجوہات کی بنا پر نہیں ملے اس لیے ان کی صلاحیتوں کے بارے میں لوگوں نے اندازہ لگانے میں غلطی کی۔ مگر اس وقت بھی جن عورتوں کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا انھوں نے حکومتیں بھی چلائی ہیں، بزنس بھی کیا ہے اور فوجی خدمات بھی انجام دی ہیں اور فنونِ لطیفہ کے میدان میں اعلیٰ تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مگر اس کو استثنیٰ مانا گیا کیونکہ انہیں شاذ و نادر ہی ایسے مواقع ملے۔

دراصل ماضی میں چاہے کھیتی ہو، تجارت ہو یا جنگ اس میں مشین کے بجائے ہاتھ سے کام کرنا پڑتا تھا جس کے لیے بڑی جسمانی قوت درکار ہوتی تھی اور عورتیں ان کاموں میں مددگار تو ہوتی تھیں مگر اتنی جسمانی قوت نہیں رکھتی تھیں، اس لیے یہ مان لیا گیا کہ گھر کے باہر کا کام جس میں زیادہ جسمانی قوت کی ضرورت ہے اور زیادہ مشقت کرنا ہے وہ مرد کریں گے اور بچوں کی پرورش اور دیگر گھریلو کام عورتیں کریں گی۔ مگر اب ٹکنالوجی کی ترقی نے زندگی آسان کردی ہے اور بڑے سے بڑا کام بھاری سے بھاری بوجھ محض ایک بٹن دبا کر کیا جاسکتا ہے۔ تو یہ کام مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی کرسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید دور میں زندگی کے ہر شعبہ میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کررہی ہیں اور اپنی حسن کارکردگی سے یہ ثابت کررہی ہیں کہ وہ کسی طرح مردوں سے کم نہیں ہیں۔ لہٰذا عورتوں کے بارے میں جو بھی سابقہ تصورات، خیالات، معتقدات رہے ہیں وہ نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ لہٰذا ہمیں عورتوں کے بارے میں اپنے ذہنی تحفظات اور تعصّبات سے باہر نکل کر ایک نارمل آدمی کی طرح غور کرنا ہوگا اور اپنے گھر اور سماج کو نئے سانچے میں ڈھالنا ہوگا۔ میں اندھا دھند طور پر عورتوں کے بارے میں مغربی تصورات کا قائل نہیں ہوں اور نہ مشرقی رجعت پسندی کو صحیح مانتا ہوں۔ میری رائے میں نہ تو آئین نو سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ طرزِ کہن پر اڑنے کی ضرورت ہے بلکہ ایک متوازن عقلی متبادل پیدا کرنے کی ضرورت ہے جہاں ایک عورت اپنی عزت و ناموس کو محفوظ رکھتے ہوئے اور اپنی تمام تر صنفی خصوصیات کا احترام کرتے ہوئے زندگی کے ہر میدان میں اپنی حصہ داری اپنا رول اور کردار ادا کرسکے۔

میں نے بیوگی اور اس کے متعلقات پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ طویل تمہید اس لیے اختیار کی کیونکہ اگر ہم عورتوں کو صنفی آزادی، انصاف اور احترام بخشنے میں کامیاب ہوجائیں گے تو بیوگی اور اس سے متعلقہ مسائل کا حل کرنا آسان ہوجائے گا۔ ہندوستان کے سماجی اور تہذیبی پس منظر میں یہ معاملہ اور بھی اہم ہوجاتا ہے۔

میں نے یہ بات اوپر واضح کی ہے کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان معاشرے میں تھوڑے سے ظاہری فرق کے ساتھ دونوں کی سماجی بناوٹ اور سوچ میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دونوں قوموں نے ایک دوسرے کی اچھی باتیں اختیار کرنے میں چاہے کوتاہی دکھائی ہو مگر ایک دوسرے کی بری باتوں کو بڑی آسانی سے قبول کرلیا ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں معاشروں میں عورتوں کی حالت اور حیثیت کم وبیش ایک جیسی ہے۔

ہمارے دیش میں پچھلے ایک سال سے ہندوتو کے نام پر ایک تحریک چلائی جارہی ہے جس کا ایک حصہ ہندو دھرم، سنسکرتی، قوم اور بھاشا کا گن گان ہے اور دوسرا حصہ مسلمانوں اور اسلام سے بغض ونفرت ہے۔ ہندوستان میں جو بھی مذہبی، سماجی، اخلاقی، تہذیبی، معاشی اور سیاسی خرابیاں اور مسائل ہیں سنگھ پریوار اور ہندوتو کے علمبردار اس کا ڈانڈا فوراً اسلام اور مسلمانوں سے ملادیتے ہیں۔ ان کے خیال میں جب تک بھارت سے اسلام اور مسلمانوں کا صفایا نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک اس دیش کا کلیان اور ترقی نہیں ہوسکتی ہے۔ لہٰذا وہ پوری قوت کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایسا ماحول بنانے میں لگے ہوئے ہیں تاکہ پوری ہندوقوم ان کے خلاف کھڑی ہوجائے اور انہیں ایک فرضی جنگ میں مبتلا کرکے ان کا استحصال کیا جائے۔ اکیسویں صدی کے اوائل میں رام مندر تحریک اور کئی دیگر تحریکوں کے نتیجے میں وہ اس ملک کے اقتدار پر قابض ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اس وقت وہ ملک کی ترقی کے بجائے سارا زور اس بات پر صرف کررہے ہیں کہ کس طرح اور کتنا جلدی مسلمانوں کا استیصال کیا جائے تاکہ ان کے اثرات سے سماج کو پاک کیا جاسکے۔

اس پس منظر میں ہمیں اپنی آدھی آبادی کے مسائل کو ایک وسیع کینوس میں دیکھنے کی ضرورت ہے اور اپنی سماجی کمزوریوں پر قابو پاکر ایک ایسی علمی اور تہذیبی جدوجہد کا آغاز کرنا ہے جس سے ہم اپنی اندرونی اصلاح بھی کرسکیں اور ساتھ ہی وسیع تر ہندوستانی سماج کو ایک مثبت پیغام بھی دے سکیں۔ ظاہر سی بات ہے یہ ملک ہمارا ملک ہے ہم نہ اس ملک

سے بھاگ سکتے ہیں اور نہ الگ ہو سکتے ہیں، اس لیے مسائل چاہے جتنے سنگین ہوں ہمیں ایک ہمہ گیر نقطۂ نظر سے دیکھنا ہوگا اور پوری ملت یعنی اپنی پوری آبادی جس میں عورت اور مرد دونوں شامل ہیں ان کو ساتھ لے کر اس چیلنج کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اسی پس منظر میں ہم اپنے سماج کے سب سے کمزور طبقے کے حقوق کے باب میں گفتگو کریں گے۔

(الف) بیوگی

ہندوستان میں بیوگی ایک ایسی لعنت اور نحوست شمار کی جاتی ہے جس کے بعد ایک عورت سے نارمل اور باعزت زندگی گزارنے کے سارے اختیارات چھین لیے جاتے ہیں اور اسے ایک لعنت زدہ زندگی جینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے برکات میں ایک بڑی برکت یہ ہے کہ اس نے ستی پرتھا جیسی انسانیت سوز رسم کا خاتمہ کردیا۔ بھارت کے اعلیٰ طبقہ کے خاندانوں میں جن کو کولین ورگ کہا جاتا تھا خاص طور سے راجپوت اور حکمراں طبقے میں یہ رسم رائج تھی کہ جب کسی عورت کا شوہر انتقال کرتا تھا تو اس کے ساتھ اس کی بیوہ کو بھی زندہ نذرِ آتش کردیا جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ تاریخ میں کسی عورت نے خود کو اپنے شوہر سے محبت اور وفاداری کے اظہار کے طور پر اس کی چتا کے ساتھ جلانا پسند کیا ہو۔ مگر عام طور پر 99.9% معاملے میں اسے جبراً جلادیا جاتا تھا اور اسے اس کی پتی ورتا ہونے کی دلیل مانا جاتا تھا۔ اس طرح اس کو دیوی مان کر اس کی عظمت کے گن گائے جاتے تھے اور اس کی پوجا کی جاتی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں ستی ماتا کے نام پر مندر بنا کر اس کی مورتی کی پوجا کی جاتی ہے۔ ایسے مندر آج بھی آپ کو ہر شہر اور علاقے میں مل جائیں گے جو ظاہر کرتا ہے کہ یہ رسم کسی ایک جگہ یا ایک زمانے تک محدود نہیں تھی بلکہ پورے نارتھ انڈیا میں ایسے واردات ہوتے تھے اور ہندو سماج احترام وعقیدت کے ساتھ اس رسم کا اہتمام کرتا تھا۔

برہمنوں نے بڑی چالاکی سے خود کو اس رسم سے الگ رکھا تھا۔ لہٰذا کسی برہمن کے انتقال پر برہمن عورتیں ستی نہیں ہوتی تھیں، لیکن راجپوت اور دیگر اعلیٰ ذات کے لوگ

اور ان کی دیکھا دیکھی ویشیہ طبقات میں بھی یہ رسم پھیل گئی۔ اکبر اور اورنگ زیب وغیرہ نے اپنے عہد حکومت میں اس رسم پر پابندی لگادی تھی مگر اس وقت اس کا چلن اتنا عام تھا کہ اس پر مکمل روک نہیں لگائی جاسکی۔ 1829 میں ولیم بنٹک نے راجہ رام موہن رائے اور ولیم کیری ایک پادری کی کوششوں سے اس رسم کو پوری طرح ختم کرنے کا ایک پلان بنایا۔ 1856 میں ہندو بیوہ کی دوبارہ شادی کا قانون پاس ہوا بچیوں کے قتل کو روکنے کے لیے 1870 میں ایک قانون بنایا گیا اور 1891 میں شادی کے لیے رضا مندی دینے کی عمر کا قانون پاس ہوا۔ ان تمام اصلاحی قوانین کا مقصد یہ تھا کہ ہندو عورتوں کو ظالمانہ رسم و رواج سے بچا کر ان کو جینے اور باعزت زندگی گزارنے کا حق دیا جائے۔

ہندوستان میں لڑکیوں کی پیدائش کو آج بھی ناپسندیدہ مانا جاتا ہے۔ اگر کسی طرح سے پتہ چل جائے کہ پیٹ میں پلنے والا بچہ لڑکی ہے تو مختلف ذرائع سے اس کا اسقاط کرادیا جاتا ہے۔ دیہات کے بجائے شہروں میں یہ وبا زیادہ عام ہے۔ غریب اور پسماندہ آبادی کے مقابلے پڑھے لکھے، متوسط اور خوشحال گھرانوں میں یہ عام چلن ہے۔ ہندوستان میں تلک جہیز کی رسم اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ امیر ہو یا غریب ہر شخص اس رواج کی وجہ سے پریشان ہے مگر کوئی اس کو بدلنا یا ختم کرنا نہیں چاہتا ہے۔ بیٹی کی شادی ہمالیہ پہاڑ پر چڑھنے سے زیادہ مشکل عمل سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان میں بیٹی کی شادی میں کنیا دان کیا جاتا ہے گویا ایک ماں باپ نے اپنی بیٹی کو دوسرے پریوار کو جہاں اس کی شادی ہوئی ہے اس کو دان کردیا۔ اس طرح کنیا دان کو مہادان کہا جاتا ہے۔ جب کوئی چیز دان کی جاتی ہے اس کا مطلب ہے کہ اولاً تو وہ چیز کبھی واپس نہیں لی جاسکتی، دوسرے اب اس گھر میں اس کا کوئی حق اختیار یا ادھیکار نہیں رہا۔ مانا جاتا ہے کہ جس گھر میں اس کی ڈولی گئی ہے وہیں سے اس کی ارتھی بھی نکلے گی۔ جب کسی عورت کے شوہر کا انتقال ہوجاتا تھا تو مانا جاتا تھا کہ اب اس عورت کا سماج میں کوئی کام نہیں ہے۔ وہ صرف اس خاندان پر ہی نہیں بلکہ پورے سماج پر ایک بوجھ اور ایک نحوست شمار کی جاتی تھی۔ اور اگر اس کے بچے بھی نہ ہوں جو اس

کی کفالت کرسکیں تو ستی ہونے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ غرض انگریزوں کے آنے تک ایک بیوہ عورت کے لیے ستی ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ گویا اس سماج میں بیوگی کے مسئلے کا صرف یہی ایک حل تھا۔

ہندوستان میں لڑکے اور لڑکیوں کی شادی بچپنے اور لڑکپن میں یعنی سن بلوغ سے پہلے ہی کردی جاتی ہے۔ ماضی میں شادی پانچ سے دس سال کے درمیان ہوجایا کرتی تھی۔ آج بھی بہت سی ریاستوں اور برادریوں میں بچوں کی شادی کے خلاف قانون بن جانے کے باوجود بچوں کی شادی عام ہے۔ یونیسیف کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں 27% لڑکیوں کی شادی 18 سال سے پہلے ہوجاتی ہے اور 7% کی شادی 15 سال سے پہلے ہوجاتی ہے۔ دلہن بچیوں کی تعداد ملک میں 1.5 کروڑ سے زائد ہے۔

جب لڑکے اور لڑکیوں کی شرح موت کا موازنہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیوں کے مقابلے لڑکے پہلے اور زیادہ مرتے ہیں۔ حال کے دنوں میں بہت ساری وجوہات کی بنا پر اس رجحان میں تبدیلی دیکھنے کو مل رہی ہے جبکہ ماضی میں یہ ایک عام رجحان تھا۔ کم عمر میں شادی ہونے کے سبب جب شوہر کا انتقال ہوجاتا تھا اس وقت بہت چھوٹی عمر میں ایک لڑکی بیوہ ہوجاتی تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد اس کی دنیا ہی بدل جاتی تھی۔ وہ لکشمی کے بجائے کولکشمی ہوجاتی تھی جس کے لیے خاندان اور سماج میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ اگر وہ ستی ہوجاتی ہے تو سب سے اچھی بات ہے ورنہ اس کی زندگی اجیرن کرکے رکھ دی جاتی۔ گھر اور سماج کی عورتیں بڑے ہی ظالمانہ طریقے سے اس کے ماتھے کا سندور کھرچ کھرچ کر صاف کردیتیں۔ اس کے جسم سے سارے زیورات اور گہنے اتار دیے جاتے۔ اس کا سر منڈھا دیا جاتا اور اس کے جسم سے قیمتی اور رنگین کپڑوں کو اتار کر اسے سادہ اور سفید لباس پہنا دیا جاتا اور گھر کے ایک کمرے میں الگ تھلگ کرکے انہیں اچھوت کی طرح رکھا جاتا اور انہیں ہر طرح کے گھریلو اور سماجی تقریبات سے الگ تھلگ رکھا جاتا۔ انہیں بہت موٹا جھوٹا کھانے کو دیا جاتا اور ان سے توقع کی جاتی کہ وہ اپنی ساری عمر

محض عبادت ریاضت میں گزاریں اور دنیا اور لذاتِ دنیا سے بالکل دور رہیں، وہ جیتے جی اس قید سے کبھی باہر نہیں نکل سکتی تھیں۔ متھرا، بنارس اور ورنداون ان کی آخری پناہ گاہ ہوتی، جہاں جوان عورتیں، قحبہ گری کرکے اور ادھیڑ اور بوڑھی عورتیں بھیک مانگ کر اپنا گزارہ کرتیں۔ جن عورتوں کی کوئی اولاد نہیں تھی ان کی تو مجبوری تھی۔آپ اس ہولناک منظر کو ذہن میں رکھیں تو کلیجہ منہ کو آجائے گا۔ جب ایک 9 سال، 12 سال، 15 سال کی بچی، 18 سال، 20 سال، 22 سال اور 24 سال کی لڑکی اور 30 سال اور 34 سال کی عورت کا سر مونڈھ کر عمر بھر کے لیے لباس بیوگی پہنادیا جاتا تھا۔ یہ امر اس وقت اور بھی افسوسناک ہوجاتا جب ادھیڑ اور بوڑھی عمر میں ان کے بچے ان کو تیرتھ کے بہانے ان مقامات پر لے جاتے اور بھیڑ میں ان کو چپکے سے چھوڑ کر واپس آجاتے اور پھر زندگی بھر کبھی ان کی خبر نہیں لیتے۔ یہ ایسی اندوہناک حقیقت ہے جس کو لکھتے ہوئے قلم کانپ جاتا ہے۔ اب حالات تھوڑے بدلے تو ضرور ہیں مگر سوچ میں ابھی بھی بہت فرق نہیں آیا ہے۔ لہٰذا بیوگی کا مسئلہ ہندوستان کے بڑے سماجی مسائل میں ایک ہے جس پر انسانی حقوق کے نقطۂ نظر سے غور کرنے اور مثبت اقدام (Afirmative Action) کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں 2011 کی مردم شماری کے مطابق کل 542,24563 بیوائیں تھیں جو عورتوں کی کل آبادی کا 12.84% تھیں۔ 2001 میں 18 سال اور اس سے کم عمر کی بیواؤں کی کل تعداد 157676 تھی جو 2011 میں 179075 ہوگئی۔ 2001 میں 21 سال کی عمر کی بیواؤں کی تعداد 323637 تھی جو 2011 میں 334578 ہوگئی۔ 2011 میں ملک کی کل آبادی 121 کروڑ تھی جس میں 4.6% یعنی 5.6 کروڑ بیوائیں تھیں۔ 2001 کے مقابلے یہ تعداد کافی بڑھی ہے۔ 2001 میں 102 کروڑ کی آبادی جس میں صرف 18.5 لاکھ بیوائیں تھیں جو کل آبادی کا محض 0.7% تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ 2001 اور 2011 کی دہائی میں بیواؤں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کی تین بنیادی وجہیں بتائی جاتی ہیں۔ ایک مردوں کے مقابلے عورتوں کا زیادہ دن زندہ رہنا، دوسری عورتوں اور مردوں کے درمیان شادی کے

وقت عمروں کا بہت فرق ہونا اور تیسری سب سے بڑی وجہ باوجود اس کے کہ بچپن کی شادی قانوناً ممنوع ہے بچپن کی شادی کا رواج عام ہونا جس کا تناسب اوپر بیان کیا گیا ہے۔

ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ ایک براعظم ہے، لہٰذا ہندوستان کی چند بڑی ریاستوں میں بیوگی کی کیا تعداد ہے اور اس کا تناسب کیا ہے، اس مسئلہ کی سنگینی کو سمجھنے کے لیے اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے چلنا بہتر ہوگا:

Table:1

جموں و کشمیر	0.62%	3,35,136
پنجاب	2.9%	11,85,943
یوپی	10.9%	59,13,805
بہار	4.3%	26,02,380
مغربی بنگال	9.20%	49,90,116
مدھیہ پردیش	11.09%	29,38,991
گجرات	11.65%	24,52,518
مہاراشٹر	13.8%	55,21,290
آندھرا پردیش	16.71%	52,71,941
کرناٹک	16.20%	37,19,136
کیرالہ	17.9%	22,42,176
تامل ناڈو	16.61%	49,29,054

Source: Censuss 2011

اس چارٹ میں آپ کو مذکورہ ریاستوں میں بیواؤں کی تعداد اور ان کا تناسب دکھایا گیا ہے جس سے معلوم ہو سکے گا کہ کس ریاست میں بیواؤں کی کتنی آبادی ہے۔ کل آبادی کے لحاظ سے کیرالہ میں بیواؤں کی تعداد 6.7% ہے جبکہ تامل ناڈو میں 6.4 فیصد

خواتین بیوائیں ہیں کرناٹک 5.7 فیصد اور آندھرا پردیش میں 6 فیصد خواتین بیوائیں ہیں۔ چونکہ ان خواتین کو کوئی مالی تحفظ حاصل نہیں ہوتا اور نہ ان کے لیے کوئی فلاحی ڈھانچہ موجود ہے لہٰذا یہ خواتین یا تو بے یارومددگار چھوڑ دی جاتی ہیں یا پھر انھیں مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بہت کم خواتین ہیں جو ورک فورس میں شامل ہوتی ہیں یا جن کو روزگار کے مواقع مل پاتے ہیں۔ 2001 میں 18.6 فیصد بیوہ خواتین ورک فورس میں شامل تھیں جبکہ 2011 میں یہ تعداد 26.5 فیصد تھی۔ اس طرح گویا 74.5 فیصد خواتین بھیک مانگنے یا دوسروں کے رحم و کرم پر رہنے پر مجبور ہیں۔

ذیل کے ٹیبل میں ہندوستان کے تمام مذہبی سماجوں میں اور مسلمان سماج میں مختلف عمر کی عورتوں کے درمیان بیوگی کا تناسب دیا گیا ہے جس سے عام سماج اور مسلم سماج میں اس مسئلہ کی نوعیت کو جاننے میں مدد ملے گی۔

Table-2

عمریں	تمام مذہبی سماجوں میں	مسلمان سماج میں
15-19	0.2	0.2
20-24	0.7	0.7
25-29	1.4	1.3
30-34	2.6	2.4
35-39	4.5	4.1
40-44	7.7	7.8
45-49	11.3	11.4
50+	37.5	37.5
15+ (Ever married)	12.6	11.4

Source: Computed from data CD from India, Register General (2005)

اس ٹیبل کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان سماج اور ہندوستان کے دیگر مذہبی سماج ہندو،سکھ، بودھ، عیسائی وغیرہ میں بیوگی کا تناسب کم و بیش ایک جیسا ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ پر تمام سماجوں کو دھیان میں رکھ کر مجموعی اعتبار سے سوچنا چاہیے اور ان کی حفاظت اور کفالت کا جامع منصوبہ بنانا چاہیے۔ تناسب کے اعتبار سے ہندو اور مسلم سماج کا تناسب ایک جیسا ہے تاہم جب ہم ان کو عدد میں شمار کریں گے تو چونکہ ہندوسماج کی آبادی زیادہ ہے، لہٰذا ان کی مجموعی تعداد بھی زیادہ ہوگی اور مسلمان آبادی اس کے مقابلے بہت کم ہے۔ اس لیے ان کی مجموعی تعداد کم ہوگی۔ مگر دونوں سماج میں Marital Status اور شادی کی عمریں کم و بیش ایک جیسی ہیں اور ان کے سماجی مسائل بھی ایک جیسے ہیں جو دیگر امور پر گفتگو کرتے ہوئے سامنے آئے گا۔ ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ بیوگی یا دیگر مسائل کو Sectoral اور Sectional نقطہ نظر سے دیکھنے کے بجائے مجموعی اعتبار سے دیکھنا چاہیے اور اس کے حل کے لیے جامع منصوبہ تشکیل دینا چاہیے۔

2011 کی مردم شماری سے ایک دلچسپ حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دیگر مذہبی اکائیوں کے مقابلے بیوہ خواتین کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ مسلمانوں میں 11.1% خواتین بیوہ ہیں جبکہ ہندوؤں میں 12.9%، کرسچین میں 14.9% اور دوسری مذہبی اقلیتوں میں 13.3 فیصد ہیں۔ مسلمانوں میں بیوہ خواتین کی تعداد کم ہونے کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مسلمان سماج میں بیواؤں کی دوسری شادی اتنی معیوب نہیں مانی جاتی جتنی دیگر سماجوں میں ہے۔ بہرحال یہ ایک اہم عمرانی اور سماجی مسئلہ ہے جس پر گہرائی سے غور کرتے ہوئے ایک کامن نیشنل پالیسی بنانے کی ضرورت ہے کیونکہ آج کی تاریخ میں مجموعی اعتبار سے یہ کم وبیش 43 ملین خواتین کا مسئلہ ہے یعنی 4 کروڑ 30 لاکھ خواتین بیوگی کے عذاب میں مبتلا ہیں، جہاں سے ان کو نکالنے اور سہارا دینے کی ضرورت ہے۔

(ب) متروکہ اور مطلقہ خواتین

بے شوہر خواتین کی دوسری کیٹگری وہ ہے جنھیں متروکہ (Abandoned or

(Deserted) خواتین اور مطلقہ خواتین کہا جاتا ہے۔ متروکہ خواتین ان کو کہتے ہیں جن کو ان کے شوہروں نے بغیر طلاق دیے چھوڑ دیا ہے اور وہ ان کی کفالت اور دیگر ذمہ داریوں سے آزاد ہوگئے ہیں۔ دراصل ہندو سماج میں طلاق کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ہندو سماج میں شادی جنم جنم کا بندھن مانا جاتا ہے، جب ایک بار ایک مرد اور عورت شادی کے بندھن میں بندھ گئے تو اب انھیں موت ہی ایک دوسرے سے جدا کرسکتی ہے۔ جیتے جی جدا ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ مگر انسانی طبائع، اخلاق اور مزاج میں فرق کی وجہ سے میاں بیوی میں نہیں بنتی، ایسی صورت میں بسا اوقات ایک شوہر طلاق دیے بغیر اپنی بیوی کو چھوڑ دیتا ہے۔ یا تو وہ دوسری شادی کرلیتا ہے یا پھر شادی شدہ زندگی گزارنے کے بجائے تجرد کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ہمارے ملک میں عام لوگ ہی نہیں بڑے بڑے لوگ بھی اپنی بیویوں کو چھوڑ کر یا تو دوسری شادی کر لیتے ہیں یا بغیر شادی کیے کسی دوسری عورت کے ساتھ لیو اِن ریلیشن میں رہتے ہیں یا پھر تجرد کی زندگی گزارتے ہیں۔ مگر ان تمام کی مار عورت پر ہی پڑتی ہے۔ سماج میں اس کی کوئی قدر نہیں ہوتی اور اسے کوئی قانونی تحفظ حاصل نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ اپنا پاسپورٹ، آدھار کارڈ اور راشن کارڈ بھی نہیں بنواسکتی ہیں۔

ہندو مذہبی اور سماجی ضابطہ میں طلاق کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا مگر 1956 میں جب ہندو کوڈ بل پاس ہوا تو ملکی قانون کے تحت ہندو مرد و عورت دونوں کو طلاق لینے اور دینے کا اختیار دیا گیا مگر دونوں کو اس کے لیے عدالت سے رجوع کرنا ہوگا اور عدالت کے فیصلے کے بعد ہی دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوسکتے ہیں۔

بہرحال شوہر سے علیحدگی ایک بڑا سماجی مسئلہ ہے جس کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیاجاسکتا ہے۔ 2011 کی مردم شمار کے مطابق 2.3 ملین متروکہ خواتین ہیں یہ تعداد مطلقہ خواتین کے مقابلے دوگنی ہے۔ ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں میں متروکہ ہندو خواتین دو ملین سے زائد ہیں جبکہ مسلمانوں میں متروکہ اور مطلقہ کی تعداد 2.8 لاکھ، کرسچین میں 0.9 لاکھ اور دیگر مذہبی اکائیوں میں 0.8 لاکھ ہے۔ اس طرح آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جہاں

ہندوؤں میں یہ تعداد 23 لاکھ ہے مسلمانوں میں محض 2 لاکھ 8 ہزار ہے۔

اس وقت ہندوستانیوں کی ایک اچھی خاصی آبادی یورپ، امریکہ اور مڈل ایسٹ میں رہتی ہے جن کو این آر آئی کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگ تو ورکنگ ویزا پر ہوتے ہیں مگر کچھ لوگ پرمانٹ ویزا پر اور بطور شہری ان ملکوں میں رہتے ہیں۔ ہمارے یہاں بالخصوص پنجاب، ہریانہ، دہلی اور دیگر ریاستوں میں این آر آئی لڑکوں سے شادی کرنے کا کریز ہے۔ لڑکیاں بھی خوشی خوشی ایسے لڑکوں سے شادی کرنے کے لیے راضی ہوجاتی ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر دھوکے باز نکلتے ہیں۔ وہ یہاں موٹے تلک جہیز کے لالچ میں اچھی اور خوبصورت لڑکیوں سے شادی کر لیتے ہیں اور کچھ دن یہاں رہنے کے بعد اس وعدے کے ساتھ لوٹ جاتے ہیں کہ وہ وہاں پہنچ کر ان کو بلا لیں گے، کبھی کبھی وہ ان لڑکیوں کو اپنے ساتھ بھی لے جاتے ہیں۔ ایسی شکایتیں سننے اور دیکھنے کو ملی ہیں کہ وہ یا تو پہلے سے شادی شدہ ہوتے ہیں یا پھر وہاں جا کر کسی اور سے شادی کر لیتے ہیں جو لڑکیاں یہاں سے ان کے ساتھ جاتی ہیں وہاں جا کر وہ ان کو چھوڑ دیتے ہیں اور مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتے ہیں۔ ایسی لڑکیوں کی زندگی اجیرن اور عذاب بن جاتی ہے۔ ان کو نہ تو کوئی قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے اور نہ سماجی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ ایسی لڑکیوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ لہٰذا یہ ایک بڑا سماجی مسئلہ بن گیا ہے۔ 2019 تک پانچ ہزار سے زائد خواتین نے وزارتِ خارجہ سے شکایت کی ہے کہ ان کے شوہروں نے ان کو چھوڑ رکھا ہے۔ لہٰذا ان کے خلاف مناسب قانونی کارروائی کی جائے۔

اگر آپ اس مسئلہ کا قریب سے جائزہ لیں گے تو اندازہ ہوگا کہ ملک میں 24 لاکھ متروکہ خواتین ہیں جن میں 19 لاکھ ہندو خواتین ہیں۔ 2011 کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں میں متروکہ خواتین کی تعداد سب سے کم 0.67% ہے جبکہ ہندوؤں میں یہ تناسب 0.69% ہے، کرسچین میں 1.19% اور دیگر اقلیتوں میں 0.68% ہے۔ لہٰذا ہمیں صرف مطلقہ ہی نہیں متروکہ خواتین پر بھی دھیان دینا چاہیے اور ان کے مسئلہ پر ہمدردانہ غور کرتے

ہوئے انھیں اس عذاب سے باہر نکالنے کا باضابطہ منصوبہ بنانا چاہیے۔

اب ہم مطلقہ خواتین کے مسئلہ کی طرف واپس آتے ہیں۔ مطلقہ خواتین ان خواتین کو کہتے ہیں جن کی شادی ہوئی تھی مگر بعض وجوہات کی بنا پر فریقین کے درمیان نباہ نہیں ہوسکا۔ لہٰذا انھیں ایک مذہبی یا قانونی ضابطہ کے تحت ایک دوسرے سے آزاد کردیا گیا۔

ہمارے یہاں طلاق کے دو ضابطے ہیں۔ ایک سماجی اور مذہبی ضابطہ ہے، دوسرا قانونی ضابطہ ہے۔ سماجی اور مذہبی ضابطے کے تحت شوہر بیوی کو طلاق دیتا ہے یا بیوی شوہر سے طلاق لیتی ہے۔ مسلمانوں میں فسق نکاح کے دو طریقے پائے جاتے ہیں۔ ایک طلاق اور دوسرا خلع۔ طلاق کا اختیار شوہر کو ہے جبکہ خلع کا اختیار بیوی کو ہوتا ہے۔ قرآن نے طلاق کا ایک معروف طریقہ بتایا ہے۔ مگر بسا اوقات لوگ اس طریقے کو پوری طرح فالو کیے بغیر براہِ راست ایک بار میں تین طلاق بول کر اس رشتے کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیتے ہیں۔ یہ طریقہ گرچہ رائج ہے مگر یہ قرآن وسنت کے طریقے کے خلاف ہے، جس کی اصلاح ہونی چاہیے۔

ابھی ایک مجلس میں تین طلاق کے خلاف زبردست ماحول بنایا گیا اور اسے اس انداز سے پیش کیا گیا گویا مسلمان عورت مستقل تین طلاق کے خوف کے سائے میں زندگی گزارتی ہے اور مسلمان مرد بغیر روک ٹوک تین طلاق دے کر اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیتا ہے۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ تین طلاق کا رواج غلط ہے۔ قرآن وسنت سے میل نہیں کھاتا ہے۔ لہٰذا اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ سپریم کورٹ نے اور حکومت ہند نے اس مسئلہ کو جس انداز سے ڈیل کیا ہے، وہ ایک دوسری انتہا کی طرف لے جاتی ہے، جس نے اس مسئلہ کو حل نہیں کیا بلکہ اور سنگین بنادیا ہے۔ دراصل حکومت کا مقصد مسلمان عورت کی حالت میں سدھار نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں رائج مسلم پرسنل لاء کو ختم کرنا ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلم سماج نے حکومت اور عدالت کی اس مداخلت کو نہ صرف غیر ضروری مانا بلکہ اسے بدنیتی پر مبنی قرار دیا۔

2011 کی مردم شماری میں وارد اعداد و شمار کے جائزہ سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ہندوستان کی مذہبی قوموں میں کس قوم کی شادی میں کتنی پائیداری پائی جاتی ہے اور اس پس منظر میں اس پروپیگنڈہ کو بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ کیا واقعی ایک مسلمان عورت تین طلاق کے خوف کے سائے میں جیتی ہے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مسلمانوں میں شادی کی پائیداری دیگر مذہبی برادریوں سے زائد ہے۔ مثلاً مسلمانوں میں 87.8 فیصد شادیاں پائیدار ہیں وہیں ہندوؤں میں یہ تناسب 86.2 فیصد، کرسچین میں 83.7 فیصد اور دیگر مذہبی اقلیتوں میں 85.8 فیصد ہے۔ اس طرح تناسب کے اعتبار سے مسلمان معاشرے میں شادیاں زیادہ ٹکتی ہیں جو یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کے باوجود کہ تین طلاق کا غلط رواج مسلمان معاشرے میں چل رہا ہے مسلمانوں میں شادیاں زیادہ پائیدار ہوتی ہیں۔ مسلمان معاشرہ میں متروکہ خواتین کی تعداد بہت کم ہے۔ دیگر سماجوں کے متروکہ اور مطلقہ خواتین کی تعداد ملادی جائے تو ان کی تعداد مسلمان معاشرے میں مطلقہ خواتین کی تعداد سے زائد ہوگی۔ تاہم اعداد و شمار کی روشنی میں بات کی جائے تو مسلمان معاشرہ میں کل شادی شدہ خواتین میں مطلقہ خواتین کی تعداد 1.1 فیصد ہے جبکہ دوسری مذہبی اکائیوں میں 0.9 فیصد ہے۔ اس طرح مسلمان معاشرہ میں دیگر معاشروں کے مقابلے میں 0.2 فیصد زیادہ مطلقہ خواتین ہیں۔ مطلقہ خواتین کی تعداد کم ہونے کی وجہ ان کی دوسری شادی بھی ہوسکتی ہے۔ بہرحال 2011 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں کل 34 کروڑ شادی شدہ خواتین ہیں جن میں 9.1 لاکھ مطلقہ خواتین ہیں جن میں 2.1 لاکھ مسلمان ہیں۔

ایک اور بات قابلِ توجہ ہے، تین طلاق کے مسئلہ کو جس طرح نمک مرچ لگا کر اور مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کیا گیا گویا مسلمانوں میں یہ ایک وبا کی طرح پھیلا ہوا مسئلہ ہے جبکہ زمینی حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں میں کم وبیش ہر ریاست میں شرعی عدالتیں ہیں جہاں طلاق اور خلع کے معاملات طے پاتے ہیں۔ ان میں داخل کیے گئے معاملات کا جائزہ لیا جائے تو اس پروپیگنڈے کی ہوا نکل جاتی ہے۔ حیدرآباد میں

مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی ہے، جہاں کے دو قاضیوں نے بتایا کہ ان کے یہاں کتنے طلاق اور خلع کے معاملات آتے ہیں۔

ایک قاضی کے مطابق پچھلے سات سال میں تین طلاق کے صرف دو معاملے ان کے زیرِ سماعت آئے جبکہ دوسرے قاضی نے بتایا کہ 15 سالوں میں 160 معاملات فسق نکاح یعنی طلاق کے زیرِ سماعت آئے جس میں 130 معاملات خلع کے تھے یعنی لڑکی نے شادی توڑنے کی درخواست کی تھی۔ 21 معاملات طلاق کے تھے جس میں لڑکے نے طلاق لینا چاہا تھا اور صرف 9 معاملات تین طلاق کے تھے جس میں لڑکے نے ایک ہی مجلس میں تین بار طلاق دے کر رشتہ توڑ دیا تھا۔

بہرحال معاملہ چاہے طلاق کا ہو یا خلع کا ہو یا بغیر طلاق دیے رشتہ منقطع کرنے کا یہ ایک اہم سماجی مسئلہ ہے جس پر وسیع تناظر میں غور کرنے کی ضرورت ہے اور اس کو Gender Justice کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جس کے لیے حکومت، عدالت اور سول سوسائٹی تینوں کو مل کر پہل کرنی ہوگی۔

(ج) فساد زدہ خواتین

بیوہ، متروکہ اور مطلقہ کے بعد آفت زدہ خواتین کی چوتھی قسم فساد زدہ خواتین کی ہے۔ ہمارے ملک میں آفات سماوی اور ارضی کے علاوہ ایک خالص انسان کی پیدا کردہ آفت ہے جس کو ہم فرقہ وارانہ فساد کہتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فساد کی ظاہری صورت تو مذہبی ہوتی ہے مگر اس کا محرک سیاست ہوتی ہے۔ یہ وقت کی سیاست کا پیدا کردہ مسئلہ ہے جس کے سماجی، معاشی، نفسیاتی اور انسانی پہلو ہیں۔

بھارت میں جنگ آزادی کے درمیان ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو سیاسی کشمکش شروع ہوئی اس نے جلد ہی فرقہ وارانہ رنگ لے لیا۔ لہٰذا انگریزی عہد میں ہی فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ دراصل انگریزوں نے بانٹو اور راج کرو کی جو نیتی اپنائی تھی اسی کے نتیجے میں فرقہ وارانہ کشمکش اور پھر فسادات کی شروعات ہوئی۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات پر بہت کچھ لکھا گیا۔ بہت سے کمیشن اور کمیٹیاں بحال کی گئی ہیں، جنھوں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی روک تھام کے لیے بہت سی تجاویز پیش کی ہیں۔ ان میں ایک بڑا مسئلہ ان فسادات کا خواتین اور بچوں پر پڑنے والے اثرات ہیں۔ ان فسادات کی سب سے زیادہ مار خواتین اور بچوں پر ہی پڑتی ہے۔ لہٰذا فسادات کو سیاسی، معاشی، نفسیاتی اور انسانی پہلوؤں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ لاء اینڈ آرڈر سے جڑا ہوا مسئلہ تو ہے۔ یہ انسانی حقوق سے جڑا ہوا مسئلہ بھی ہے۔ جس پر اس پہلو سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

فسادات میں جان و مال کا اتلاف تو ہوتا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ عورتوں اور بچیوں کا اغوا کرنا اور ان کی آبرو ریزی کرنا ایک بڑا مسئلہ ہے جس کا زندگی بھر ایک Traumatic Effect ہوتا ہے جو کئی طرح کی جنسی اور نفسیاتی بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔ ہندوستان میں آزادی کے وقت سے لے کر ابھی تک یعنی 2020 تک پورے ملک میں دسیوں ہزار چھوٹے بڑے فسادات ہو چکے ہیں ملک کا کوئی خطہ، صوبہ یا بڑا شہر نہیں ہے جہاں کبھی نہ کبھی کوئی بڑا فساد نہیں ہوا ہے۔ اس لیے یہ ایک ملک گیر مسئلہ ہے جو قریب ایک صدی سے رائج ہے اور جس کی وجہ سے اب تک لاکھوں لوگوں کی جانیں جا چکی ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں عورتوں کا اغوا کیا گیا ہے اور ان کی جبری آبرو ریزی کی گئی ہے۔

ملک کی تقسیم کے نتیجے میں جو فسادات پھوٹے اور قتل و غارت گری ہوئی اس میں سرکاری ذرائع کے مطابق دو لاکھ سے بیس لاکھ لوگ مارے گئے اور کم و بیش ایک کروڑ چالیس لاکھ لوگ Displace ہوئے۔ ان میں 75 ہزار سے ایک لاکھ خواتین کا اغوا کیا گیا اور ان کی آبرو ریزی کی گئی۔ فساد صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہے بلکہ سکھ اور کرسچین بھی اس کے شکار ہوتے رہے ہیں۔ 1984 میں سکھوں کے خلاف دہلی میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد بہت خون خرابہ ہوا جس میں تین ہزار سے زائد سکھ مرد مارے گئے اور ہزاروں عورتوں کی آبرو ریزی کی گئی۔ عیسائیوں کے ساتھ بھی ملک کے مختلف حصوں میں قتل و

غارت گری کی جاتی ہے۔ ان کے مذہبی مقامات کو نذرِ آتش کیا جاتا ہے، ان کی عورتوں اور بچوں کی آبروریزی کی جاتی ہے۔

مسلمانوں کی تو یہ تقدیر بن چکی ہے۔ ملک میں حکومت چاہے جس پارٹی کی ہو فساد کا Pattern اور اس کا Character ایک جیسا ہوتا ہے۔ جان و مال کی تباہی کے ساتھ ساتھ عورتوں پر ان فسادات کی دوہری تہری مار پڑتی ہے۔

(1) فسادات میں جن عورتوں کے شوہر بیٹے اور بھائی مارے جاتے ہیں، اس کے بعد وہ بالکل بے سہارا ہوجاتی ہیں اور زندگی بھر اس کے اثرات سے باہرنہیں آپاتی ہیں۔ ہندوستان میں عورتوں میں گھریلو خواتین کی اکثریت ہے جو یا تو بالکل پڑھی لکھی نہیں ہوتی ہیں یا بہت کم پڑھی لکھی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی معاشی کفالت کے لیے گھر کے مردوں پر منحصر ہوتی ہیں۔ ان کے پاس کوئی متبادل ذریعہ معاش نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر فسادات میں مرد مارے جاتے ہیں تو یہ بالکل بے سہارا ہوجاتی ہیں اور ان کی غربت و پسماندگی تاعمر ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس اعتبار سے فساد عورتوں کو مستقل عذاب میں مبتلا رکھتا ہے۔

(2) جن عورتوں کو اغوا کرلیا گیا، یا جن کی عزت لوٹ لی گئی، یا جن کی آنکھوں کے سامنے ان کے پیاروں کو قتل کردیا گیا، ان کی گھر جائداد کو خاکستر کردیا گیا وہ زندگی بھر اس خون خرابے، حادثے اور تباہی کے اثرات سے باہرنہیں نکل پاتیں جس کی وجہ سے وہ بہت سی جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہوجاتی ہیں یہاں تک کہ اپنی کفالت کا کوئی متبادل انتظام کرنے میں ناکام ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی بہت کسمپرسی میں گزرتی ہے۔

(3) اکثر فسادات کے بعد عورتیں اور بچے بچ جاتے ہیں اور ایک اکیلی عورت پر اپنی اور اپنے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ متبادل روزگار کے ذرائع نہ ہونے کے سبب اور کسی طرح کا Compensation نہیں ملنے کی وجہ سے اور کوئی

Social Security Network نہیں ہونے کی وجہ سے انہیں زندگی میں ناقابلِ بیان پریشاناں جھیلنی پڑتی ہیں۔

(4) ہندوستان میں ویسے بھی لڑکیاں بوجھ سمجھی جاتی ہیں، کنواری لڑکیوں کی شادی میں بے شمار پریشانیاں ہوتی ہیں، تلک، جہیز کی لعنت کے علاوہ اور بھی کئی طرح کی سماجی بندشیں ہوتی ہیں جن کو عبور کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اسلام میں بیوہ اور مطلقہ کی شادی کی اجازت ہے، مگر ہندوسماج میں اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ اس سماج کا اثر ہے کہ مسلمان سماج میں بھی بیوہ اور مطلقہ کی شادی چاہے اس میں عورت کا کوئی قصور ہو یا نہ ہو ایک بہت مشکل امر ہے۔ اس وجہ سے وہ عورتیں جو فسادات کی شکار ہوئی ہیں اور ان کے شوہر مارے جاتے ہیں، ان کی دوسری شادی مسئلہ ہوجاتی ہے اور ان کی کفالت ایک ایسا امر ہے جو قابلِ توجہ ہے۔ کوئی عورت اگر تیس پینتیس سال کے اندر کی ہے تو دوسری شادی ممکن ہے، مگر اس سے زیادہ عمر کی عورتیں خود بھی دوسری شادی کرنا پسند نہیں کرتیں اور نہ ایسا کرنا آسان ہوگا۔

لہٰذا فساد زدہ خواتین کا مسئلہ ایک بڑا انسانی مسئلہ ہے جس پر مجموعی اعتبار سے اس قبیل کی دیگر عورتوں جیسے بیوہ، مطلقہ اور متروکہ کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے اور ایک جامع منصوبہ تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔

ادھر حال کے دنوں میں وقت کی سیاست نے ایک نیا مسئلہ کھڑا کردیا ہے، جس کو موب لنچنگ یا ہجومی تشدد کہتے ہیں۔ خاص طور پر گائے کے گوشت اور گائے کی اسمگلنگ کے الزام میں کچھ لوگ کسی شخص کو پکڑ لیتے ہیں اور انہیں قانون اور پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے پیٹ پیٹ کر ہلاک کردیتے ہیں۔ حال کے دنوں میں اس طرح کے واقعات میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اور ملک کی مختلف ریاستوں میں اس طرح کے واقعات کافی بڑی تعداد میں رپورٹ کیے گئے جس میں سینکڑوں لوگوں کی جانیں گئی ہیں۔ اس کی وجہ سے

بھی بہت سی عورتیں بے سہارا ہوگئی ہیں کیونکہ ان کا ایک ہی کمانے والا تھا جس کو ہجومی تشدد میں مارڈالا گیا ہے۔

اب تک ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں فسادات ہوچکے ہیں جس کی وجہ سے لاکھوں کی تعداد میں خاندان متاثر اورتباہ ہوئے ہیں۔ہمیں ایک طرف ان فسادات کی روک تھام کی تدابیر سوچنا ہوگی وہیں ان کے متاثرین کی باز آبادکاری اور کفالت کے مسئلہ پر بھی غور کرنا ہوگا۔خصوصاً ان فسادات میں متاثر عورتوں کے مسائل کو ترجیحی بنیادوں پر حل کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہمیں بیوہ، مطلقہ، متروکہ اور فساد زدہ خواتین کے مسائل کو Piecemeal میں دیکھنے کی بجائے ہمہ جہت اور ہمہ گیر انداز سے دیکھنا چاہیے۔ اس باب میں غوروفکر کے لیے مندرجہ ذیل Policy Resolitions پیش کیے جارہے ہیں جس کی روشنی میں ایک وسیع البنیاد منصوبہ تشکیل دیا جاسکتا ہے:

(1) عورتیں، حد درجہ پسماندہ برادریاں ہوں، کمزور طبقات ہوں یا اقلیتیں ہوں ان سب کے لیے سب سے بڑا تحفظ تعلیم، اچھی اور معیاری تعلیم ہے۔تعلیم سے ہی ان کو Awareness، Entitlement، Security، Empowerment اور Social Economic اور Political Space مل سکتا ہے۔ لہٰذا تعلیم ان سب کے لیے سب سے بڑا انشورنس ہے جو ہر طرف کے آفات اور Disaster میں ان کا سہارا بن سکتا ہے۔ لہٰذا ہمارا سب سے پہلا Policy Resolution یہ ہے کہ تمام لڑکیوں اورعورتوں کوتعلیم اوراچھی تعلیم سے آراستہ کیا جائے تا کہ وہ حالات کے مطابق اپنی آزادانہ اور باعزت زندگی گزارنے کے لائق بنیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی ضرورت مسلمانوں کی ذہنیت تبدیل کرنے کی ہےاور دوسری ضرورت تعلیم کے لیے ہرطرح کا Infra Structural اور Institutional Support فراہم کرنے کی ہے تا کہ ایک محفوظ اورسہولت سے پُر ماحول میں ان کی تعلیم وتربیت ہوسکے۔

(2) تعلیم کے ساتھ لڑکیوں اورعورتوں کے اندر Skill Training اور Vocational

(Self کو عام کرنے کی ضرورت ہے تا کہ وہ وقت پڑنے پر خود روزگار Courses
(Employment کے لائق ہوسکیں۔ اس کے لیے نہ صرف ٹریننگ کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کرنے کے لیے نئے نئے ادارے اور کورسیز شروع کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ان کو کچے مال، ضروری وسائل خاص طور سے ان کے لیے مارکیٹ اور سرمایہ کی فراہمی پر بھی زور دینے کی ضرورت ہے تا کہ وہ آسانی سے اپنا کاروبار شروع کرسکیں اور مشکل دنوں میں اس کے ذریعے پھر سے اپنی معاشی تعمیر کے لیے تیار ہو جائیں۔

(3) تیسرا اور اہم چیز مرکزی اور ریاستی سرکاری نوکریوں میں بالخصوص گریڈ تھری اور فور کی نوکریوں میں عورتوں کو دس فیصد رزرویشن دیا جائے اور اس دس فیصد میں 5 فیصد نشستیں بیواؤں، متروکہ عورتوں، مطلقہ خواتین اور فساد زدہ خواتین کے لیے مختص کیا جائے تا کہ وہ اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرسکیں۔ ایسی خواتین کے لیے سرکاری نوکریوں میں ترجیح ان کی زندگی کو استحکام دینے میں سنگ میل ثابت ہوگی۔

(4) جو عورتیں تعلیم یافتہ ہیں یا کوئی ہنر رکھتی ہیں۔ انھیں اپنا کام شروع کرنے کے لیے غیر ضمانتی بلاسودی قرض ایک لاکھ سے دس لاکھ تک بینکوں کے ذریعے فراہم کیا جائے تا کہ وہ اپنی معاشی جدوجہد شروع کر کے خود کفیل بن سکیں۔

(5) لاء اینڈ آرڈر اور کرمنل جسٹس سسٹم کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے تا کہ سماج میں فساد یا کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آئے۔ اگر آتا ہے تو اس کی غیر جانب دارانہ جانچ ہونی چاہیے اور قصورواروں کو قرار واقعی سزا دینے کے ساتھ ساتھ نقصانات کا صحیح صحیح اندازہ لگا کر جان و مال کا جو بھی نقصان ہوا ہے اس کا معقول معاوضہ دلانے کا اہتمام ہونا چاہیے، ملک کی جیوڈیشیل سسٹم کو یہ Ensure کرنا چاہیے کہ کوئی Victim انصاف اور چھتی پورتی سے محروم نہ رہے۔

(6) ملک میں اس وقت کم و بیش 6 کروڑ بیوائیں ہیں، 25 لاکھ متروکہ خواتین، 20 لاکھ مطلقہ خواتین ہیں اور فسادات میں متاثرین خواتین کی تعداد دو لاکھ سے اوپر ہے، اس طرح کم و بیش 7 کروڑ خواتین ہیں جن کو Social Security میں لانے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کے Criminal Procedure Code کے Section 125 میں بیوی، بچوں اور والدین کو گزارا بھتہ دینے کے لیے شوہروں اور اولادوں کو پابند کیا گیا ہے۔ جس کے اندر مطلقہ اور متروکہ خواتین کو گزارا بھتہ حاصل کرنے کا اختیار ہے جب تک کہ وہ دوسری شادی نہیں کرلیتیں۔ پہلے اس قانون کا اطلاق اس وقت ہوتا تھا جب ایک عورت کورٹ میں درخواست دیتی تھی اور اس کے حق میں فیصلہ ہوجاتا تھا۔ جس کے فیصلے ہونے میں برسوں لگ جاتے تھے اور اس کی زندگی سخت مالی پریشانیوں میں گزرتی تھی۔ سپریم کورٹ نے اپنے ایک حالیہ فیصلے میں (بحوالہ ہندو، 5 نومبر 2020) یہ کہا ہے کہ ایک عورت اسی دن سے گزارا بھتہ کی مستحق ہوجاتی ہے جس دن اس نے اس کی درخواست دی ہے۔ اس طرح اس فیصلے سے مطلقہ اور متروکہ خواتین کو بڑی راحت ملی ہے۔

مگر جیسا کہ اوپر کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلقہ اور متروکہ خواتین پوری بے سہارا خواتین کی ایک چھوٹی تعداد ہے۔ بڑی تعداد بیوہ خواتین کی ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ تمام بیوہ، متروکہ، مطلقہ اور فساد زدہ خواتین کو ایک وسیع سوشل سیکوریٹی نیٹ ورک میں لایا جائے اور ان کو معاشی تحفظ فراہم کیا جائے۔ سوشل سوسائٹی کو بھی اس معاملے میں پہل کرنی چاہیے اور این جی اوز کے ذریعہ ایک Security Network بنانا چاہیے لیکن یہ کام اسٹیٹ کا ہے۔ لہٰذا ریاستی اور مرکزی سرکاروں کو ان خواتین کی معاشی کفالت کے لیے ایک Comprehensive Socical Security Network کے تحت باعزت زندگی گزارنے کے لیے ضروری کفالت کا نظم کیا جائے یہ وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

میری رائے میں اس پورے مسئلہ کو انسانی حقوق کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی

ضرورت ہے جس کے تحفظ کے لیے چہار طرفہ جدوجہد کی جانی چاہیے۔

(د) مسکین اور محروم طبقات

مسکین اور محروم طبقات میں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے لوگ، بیمار، ہوم لیس، معذور، لاوارث، مزدور، چھوٹے کام گار اور مقروض افراد آتے ہیں۔ کم و بیش ملک کی 80 فیصد آبادی انہی طبقات پر مشتمل ہے۔ اپنی غربت اور جہالت کی وجہ سے یہ طبقہ عوامی اور جمہوری حکومت کے تمام حسنات اور فوائد سے محروم ہے اور انصاف و آزادی کے تمام برکات اس کے لیے وعدۂ فردا کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ جب کبھی آفات ارضی و سماوی سے انہیں دوچار ہونا پڑتا ہے تو ان کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہوجاتی ہے۔ آزادی کے ستر سال کے بعد بھی ان طبقات کو بھوک، کوپوشن، بیماری اور لاچاری سے چھٹکارا نہیں مل پایا ہے۔ باڑھ، سکھاڑ اور اس طرح کی آفتوں سے سب سے زیادہ یہی طبقہ متاثر ہوتا ہے۔ حکومت نے جب کالا دھن نکالنے کے نام پر نوٹ بندی کی تو اسی طبقہ پر سب سے زیادہ مار پڑی۔ کوووڈ-19 کے تحت لاک ڈاؤن ہوا اس میں یہ طبقہ پس کر رہ گیا۔ کروڑوں کی تعداد میں مزدور، سیکڑوں میل پیدل چل کر اپنے گھر لوٹنے کے لیے مجبور ہوئے، جس میں سینکڑوں مزدور راستے میں بھوک، پیاس، تھکان اور بیماری سے مرگئے۔ بہت سے لوگ ریل سے کٹ کر اور سڑک حادثوں میں مارے گئے۔

ہم لوگ اکثر ملک کی ترقی کو جی ڈی پی گروتھ اور فی کس آمدنی میں ناپتے ہیں جس سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ ملک ترقی کررہا ہے اور اوسطاً تمام طبقات اور افراد کی ترقی ہورہی ہے مگر یہ غلط تصور ہے۔ جی ڈی پی دراصل ملک کی مجموعی پیداوار کا جوڑ ہے۔ جب ملک کی مجموعی پیداوار کو کل آبادی سے تقسیم کیا جاتا ہے تو اس سے فی کس اوسط آمدنی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح فی کس اوسط آمدنی کے اعتبار سے امبانی، اڈانی، ٹاٹا اور برلا کی آمدنی اور ایک مزدور کی آمدنی برابر ہوتی ہے۔ کیا اس سے بڑا کوئی دھوکہ ہوسکتا ہے؟ ملک کی حقیقی صورتحال کیا ہے اس کا اندازہ جی ڈی پی گروتھ یا فی کس اوسط آمدنی سے نہیں لگایا

جا سکتا بلکہ اس کا اندازہ فی کس خرچ سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایک آدمی کی جتنی آمدنی ہوگی وہ اسی لحاظ سے خرچ کرے گا۔ اس لیے مجموعی (Macro) نہیں منفرد (Micro) مطالعہ کی ضرورت ہے جو گھریلو سروے سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں دولت اور آمدنی میں جو بے پناہ تفاوت پایا جاتا ہے اس کی ایک جھلک مندرجہ ذیل اعداد وشمار میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ہندوستان میں جو لوگ صاحبِ وسائل ہیں جن کو انگریزی میں Haves کہا جاتا ہے ان کی تعداد کل آبادی میں 10 فیصد ہے باقی لوگ کم وسائل یا بے وسائل کیٹگری میں آتے ہیں جس کو Haves Not کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کی آمدنی اور دولت میں جو تفاوت ہے اس کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ 2019 میں کل قومی دولت میں جو اضافہ ہوا اس کا 42.5% پر صرف ایک فیصد جو حد درجہ دولت مند ہیں ان کے حصے میں آیا، جبکہ نیچے کی 50 فیصد آبادی کو صرف 2.8 فیصد ہی ملا۔ اس طرح گویا دس فیصد امیر ترین لوگوں کے حصے میں 74.3 فیصد قومی دولت آئی اور 90 فیصد کے حصے میں 25.7 فیصد۔ اکسفوم نے جنوری 2020 میں جو اعداد و شمار شائع کیے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی 95 کروڑ 30 لاکھ آبادی جو کل آبادی کا 70 فیصد ہے اس کی جو مجموعی دولت ہے اس کے مقابلے ایک فیصد لوگوں کے پاس ان سے چار گنا دولت ہے۔ ملک میں 80 کروڑ لوگ ماہانہ دس ہزار سے کم کماتے ہیں۔

ان اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ ملک کی کافی بڑی آبادی خطِ غربت سے نیچے ہے اور لوگوں کی آمدنیوں اور وسائل میں بے پناہ تفاوت پایا جاتا ہے۔ جو افراد اور طبقات خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارتے ہیں ان کی زندگی بے حد کسمپرسی میں گزرتی ہے۔ غربت صرف معاشی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ انسانی حقوق کا مسئلہ ہے۔ ایک غریب آدمی کی نہ تو بنیادی ضرورت پوری ہو پاتی ہے اور نہ اسے کوئی قانونی تحفظ حاصل ہو پاتا ہے۔ تمام تر دعوؤں اور وعدوں کے باوجود محرومی اور مجبوری اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی ہیں۔

ہندوستان دستوری اعتبار سے ایک فلاحی ریاست ہے اور یہاں تمام شہریوں کو

قانون کی نظر میں برابر مانتے ہوئے ان کو سماجی انصاف کے ساتھ ساتھ معاشی انصاف بھی دینے کی بات کہی گئی ہے۔مگر آزادی کی سات دہائیاں بیت جانے کے بعد بھی یہ منزل کوسوں دور ہے اور عام آدمی کی زندگی تمام تر محرومیوں کی شکار ہے۔ اس ملک کی پسماندہ برادریاں شیڈول کاسٹ، شیڈول ٹرائبس اور اقلیتیں بالخصوص مسلمان اقلیت انتہائی تنگ دستی اور افلاس میں زندگی گزارتی ہیں جن کے انسانی حقوق کی اس طرح پامالی ہوتی ہے جیسے یہ انسان نہ ہوں بلکہ کوئی کم تر مخلوق ہوں۔ حکومت جس کو ان کے مفادات کا محافظ ہونا چاہیے اور انصاف اور قانون کو نافذ کرنے والے ادارے جن کو ان کے حق میں کھڑا ہونا چاہیے وہ بھی طبقاتی تعصب کا شکار نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ان کو کہیں سے واجبی تحفظ نہیں ملتا اور بڑے پیمانے پر ان کے انسانی حقوق کی پامالی بھارت کا ایک بڑا سماجی مسئلہ ہے جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے وطن عزیز بھارت میں مسکین اور محروم طبقات کی تعداد کم وبیش 80% ہے۔

(i) مسکین افراد

ہمارے ملک میں 73 ملین لوگ جو کل آبادی کی 6.7 فیصد ہیں وہ خطِ غربت سے بہت نیچے یعنی انتہائی غریب ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی فی کس آدمی یومیہ 2 ڈالر سے کم ہے اور انہیں صحت مند اور قابل کار زندگی گزارنے کے لیے جتنی کیلوری چاہیے نہیں ملتی ہے۔ غربت کی وجہ سے نہ صرف ان کو مناسب غذا ملتی ہے بلکہ وہ جسمانی لحاظ سے کم زور ہوتے ہیں، ان کی قوتِ کار گھٹتی ہے اور وہ طرح طرح کے امراض کے شکار ہوتے ہیں جن کا علاج کراپانا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ ایک ایسے کو چکر میں مبتلا ہوتے ہیں جس سے نکلنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ کسی بھی آفات ارضی و سماوی کے وقت یہی طبقہ سب سے زیادہ مصیبت اور تکلیف کا شکار ہوتا ہے اور ان کے انسانی حقوق کی بڑے پیمانے پر پامالی ہوتی ہے۔

(ii) معذور افراد

ہماری آبادی کی ایک اچھی خاصی تعداد ذہنی اور جسمانی معذوری کی شکار ہے۔

جن کے لیے خود کی کفالت ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ 2001 کی مردم شماری کے مطابق 21 ملین لوگ معذور تھے جن میں 12.6 ملین مرد تھے اور 9.3 ملین عورتیں تھیں۔ سماجی تحفظ کے کسی نظام کی عدم موجودگی کے سبب ان کی زندگی کافی تکلیف اور مصیبت میں گزرتی ہے اور معذورین کی بڑی تعداد بھیک پر اپنی زندگی گزارتی ہے۔ آپ ان معذورین کو کسی مسجد، درگاہ، مندر، مٹھ یا سڑکوں چوراہوں پر بھیک مانگتے دیکھ سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی معذوری جزوی ہوتی ہے کچھ آدھے یا پورے معذور ہوتے ہیں۔ غریب گھرانوں میں جو معذور افراد ہوتے ہیں ان کو گھر والے ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کی 95,90 فیصد تعداد کے لیے بھیک ہی گزر اوقات کا ذریعہ ہوتی ہے۔

(iii) ہوم لیس

سر پر ایک چھت چاہے پھوس یا کھپڑے کی ہو انسان کو بہت ساری محرومیوں اور عدمِ تحفظ سے محفوظ رکھتی ہے۔ ہمارے یہاں ایک بہت بڑی آبادی وہ ہے جس کے سر پر کوئی چھت نہیں ہے۔ گرمی، جاڑا، برسات میں وہ کھلے آسمان کے نیچے زندگی گزارتے ہیں۔ دیہاتوں کے مقابلے شہروں میں یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ بڑے شہروں میں ایک بڑی آبادی جھگی جھونپڑیوں میں رہتی ہے۔ اسی شہر میں ایسے ہزاروں لوگ ہیں جو جھگی جھونپڑی بھی نہیں پاتے اور وہ سڑکوں کے کنارے، فوٹ پاتھ اور ڈیوائڈر پر سوتے ہیں، ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور دھرم شالاؤں کے گیٹ پر پڑے رہتے ہیں۔ اکثر یہی لوگ تیز رفتار کار اور دیگر گاڑیوں کی زد میں آکر ہلاک ہوجاتے ہیں۔ 2011 کی مردم شماری کے مطابق ہمارے ملک میں 1.77 ملین لوگ بے گھر ہیں جو کل آبادی کا 0.15% ہے۔

(vi) مزدور اور چھوٹے کامگار

بھارت میں صرف 6% لیبر فورس آرگنائزڈ سیکٹر میں ہے اور 94% لوگ غیر منظّم سیکٹر میں کام کرتے ہیں۔ جو لوگ غیر منظّم سیکٹر میں ہیں ان میں چھوٹے اور بہت چھوٹے

کسان، بے زمین زرعی مزدور، بٹائی دار، مچھلی اور جانور پالنے والے، بیڑی بنانے والے، بنکر، ارٹیزن، نمک مزدور، بھٹہ مزدور، پتھر توڑنے والے، سولر میں کام کرنے والے، پھیری والے، سبزی بیچنے والے یا پھر چھوٹے موٹے میکنک وغیرہ۔ یہ سب مزدوروں اور چھوٹے کامگاروں کے درجے میں آتے ہیں جن کی صحت اور طاقت ہی ان کی پونجی ہوتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے ان کا کام دو چار دن کے لیے بھی بند ہوجائے تو سوائے بھوکے مرنے اور گھر کے سامان کو گروی رکھ کر قرض لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ان کی روز کی آمدنی بس اتنی ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح اپنی بنیادی ضرورت پوری کر لیتے ہیں۔ ایک بار اگر یہ قرض کے چنگل میں پھنسے تو موت ہی ان کو اس سے چھٹکارا دلاسکتی ہے۔ حالانکہ یہ طبقہ انتہائی سخت ترین حالات میں بھی جینے کا عادی ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود اس کے لیے زندگی اتنی مشکل ہوجاتی ہے کہ وہ خودکشی کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ حال کے برسوں میں روزانہ کی مزدوری کرنے والوں میں خودکشی کی تعداد میں کافی تیزی آئی ہے جو مندرجہ ذیل ٹیبل سے واضح ہے اور اس طبقہ کی انتہائی ناگفتہ حالات کی عکاسی کرتی ہے:

سال	خودکشی کا تناسب
2014	12%
2015	17.8%
2016	19.2%
2017	22.1%
2018	22.4%
2019	23.4%

Source: Pinky Chakroborty, TOI Sep. 24, 2020

(v) مقروض افراد

قرض موجودہ اسٹیٹ اور انڈسٹری کے لیے ترقی کا ایندھن ہے مگر غریب عوام کے لیے ایک عذاب سے کم نہیں ہے۔ ہندوستان کے دیہی اور شہری علاقوں میں جو غریب لوگ ہیں انہیں بیماری، شادی بیاہ، موت اور دیگر موقعوں پر قرض لے کر ہی کام چلانا ہوتا ہے۔ بسا اوقات انہیں کھانے اور کپڑے کے لیے بھی قرض لینا پڑتا ہے یہ قرض ان کو سرکار یا بینک سے نہیں ملتا، اس کے لیے انہیں یہ قرض بنیا، مہاجن، سونار اور گاؤں کے سرمایہ دار سے لینا پڑتا ہے جو ان کو بھاری شرح سود پر یہ قرض دیتے ہیں۔ اکثر اس قرض کی ادائیگی ان کے لیے جان لیوا بن جاتی ہے۔ اس وجہ سے صرف کسان ہی نہیں عام مزدور بھی خودکشی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، جیسا کہ اوپر کے ٹیبل سے پتہ چلتا ہے۔

لہٰذا ایک فلاحی ریاست میں تمام افراد اور طبقات خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ ورنہ انسانی حقوق کے تحفظ اور بحالی کے سارے دعوے اور وعدے کھوکھلے ثابت ہوں گے۔ لہٰذا دستور ہند کے ابتدائیہ میں ہم جس سوشل اور ایکونومک جسٹس کی بات کرتے ہیں اور ہم نے دستور کے باب سوم میں جن بنیادی حقوق کی بات کی ہے اور باب چہارم میں رہنما اصولوں کے تحت جن آئیڈیل کا تذکرہ کیا ہے یہ سب ہاتھی کے دکھاوٹی دانت ثابت ہوں گے۔

مسلمان سماج پر خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اسلام نے جس سماجی تحفظ کا وسیع تر ضابطہ فراہم کیا ہے اس کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر بروئے کار لاتے ہوئے نہ صرف ان طبقات کی بھلائی کے لیے کام کرے بلکہ ان کو سماجی انصاف اور معاشی انصاف دلانے میں کلیدی کردار ادا کرے تاکہ غریب اور پسماندہ انسانوں اور طبقات کے انسانی حقوق کو عملی طور پر حاصل کرنا متحقق کیا جاسکے۔

■❖■

باب پنجم

ہندوستان میں انسانی حقوق کی بحالی کا روڈ میپ - ہمارا موقف

(1) مسلمان معاشرے میں خواص، دانش ور اور علماء میں تفاوت اور تعلق اور انسانی حقوق پر پڑنے والے اثرات

(2) مسلمان اور غیر مسلموں کے تعلقات اور ان کے حقوق کی پاسداری

(3) مسلمان معاشرے میں انسانی حقوق کی صحیح تفہیم اور انسان پرور معاشرے کی طرف ایک مثبت پہل

(4) ہندوستان میں مسلمان سماج کی اندرونی بناوٹ انسانی حقوق کی بحالی اور سماجی اصلاح کا روڈ میپ

ہندوستان میں انسانی حقوق کی بحالی کا روڈ میپ - ہمارا موقف

اسلام اپنی فطرت میں ایک مساوات پسند دین ہے اور انسانی شرف و مساوات پر مبنی ایک ایسا سماج بنانا چاہتا ہے جہاں ہر فرد اور گروہ عزت و آزادی کے ماحول میں اپنے جملہ حقوق کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ اسلام کا نعرہ ہے صرف خدا بڑا ہے باقی سب برابر ہیں۔ لہٰذا اسلام کے تصور معاشرت میں رنگ ونسل کا کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا ہے اور ذات برادری کے نام پر کوئی تفریق نہیں کی جاتی ہے۔ سارے انسان بلا لحاظ نسل وقوم، ذات برادری، جنس اور رنگ کے ایک خدا کے بندے اور ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ لہٰذا انسانوں اور انسانوں کے درمیان رنگ ونسل اور ذات برادری کی کوئی دیوار کھڑی کرنا اور کسی کو بڑا اور اعلیٰ جاننا اور کسی کو چھوٹا اور ادنیٰ ماننا ایک غلط اور بیہودہ بات ہے جس کی اسلام سختی سے تردید اور مذمت کرتا ہے۔ یہ اسلام کا نقطۂ نظر ہے مگر یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ہمارا مسلمان معاشرہ اس آئیڈیل سے کوسوں دور ہے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس آئیڈیل کے بالکل الٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس اسلام کا ذکر قرآن و سنت میں ہے اور جو ہمارا مسلمان معاشرہ ہے دونوں میں اتنا تضاد ہے کہ یہ سمجھنا اور ماننا بہت

مشکل ہوگیا ہے کہ کیا ہم واقعی قرآن وسنت پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمیں اسلام کی تعریف کی رو سے ایک مسلم معاشرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ میں اس وقت عالمی تناظر میں گفتگو نہیں کر رہا ہوں، میری ساری گفتگو ہندوستان کے مسلم معاشرے پر مرتکز ہے۔

اسلام ہندوستان میں دو راستوں سے آیا۔ پہلا بحری راستے سے اور دوسرا خشکی کے راستے۔ تاریخی حوالوں سے یہ بات متحقق ہوچکی ہے کہ عربوں اور ہندوستانیو ں کے تعلقات ظہورِ اسلام سے قبل سے قائم تھے۔ عربوں کے تجارتی قافلے بحرعرب کے راستے مالا بار اور کیرالہ کے ساحلی علاقوں تک آتے اور پھر یہاں سے جزائر ہند، چین اور جاپان تک جاتے تھے۔ جب ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں اسلام کا ظہور ہوا اسی وقت اسلام کیرالہ کے بعض ساحلی علاقوں میں آگیا اور دھیرے دھیرے ہندوستانی سماج کا جزو لاینفک بن گیا۔ شمالی ہندوستان میں اسلام محمد بن قاسم کے ذریعے آٹھویں صدی کے اوائل میں اس وقت آیا جب سندھ اور ملتان پر حملہ ہوا۔ مگر یہ حکومت محض دو سال رہی اور اس کے بعد لگ بھگ دو صدیوں تک کسی علاقے پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔ محمد بن قاسم کے حملہ نے عرب اور ہند کے درمیان خشکی کا ایک راستہ کھول دیا اور اس طرح عرب اور ہند کے درمیان ایک مضبوط علمی اور تمدنی رشتہ قائم ہوگیا۔ مسلمان سپاہیوں، تاجروں کے ساتھ ساتھ علماء اور فضلاء کی ایک بڑی تعداد سندھ اور ملتان کے علاقے میں آباد ہوگئی۔ اس طرح ان حضرات کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کا پہلا تعارف ہوا۔

سن 1192ء میں باضابطہ ہندوستان میں مسلم حکومت کا آغاز ہوا۔ سلطان محمد غوری نے پرتھوی راج کو شکست دے کر دہلی کی حکومت پر قبضہ کرلیا اور اپنے غلام قطب الدین ایبک کو دہلی کی حکومت سونپ کر غزنی لوٹ گیا۔ 1192 سے لے کر 1757 تک یعنی جب تک ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی ہندوستان کے طول وعرض پر بہت سے مسلمان خاندانوں کی حکومتیں رہیں۔

کیا یہ حکومتیں اسلامی تھیں، یعنی ان کا نظام حکمرانی قرآن وسنت پر مبنی تھا؟ اس کا

ایک لفظ میں جواب ہے نہیں۔ نہ وہ اسلامی حکومت تھی اور نہ اسے معروف معنوں میں مسلم حکومت کہا جاسکتا ہے۔ ان کو زیادہ سے زیادہ بعض مسلمان خاندانوں کی حکومت کہا جاسکتا ہے کیونکہ ان کا مقصد ہندوستان میں نہ تو اسلام کی ترویج و اشاعت تھا اور نہ مجموعی طور پر مسلمانوں کا فروغ اور ان کی برتری۔ وہ خاندانی حکومتیں تھیں اور ان کا مقصد محض اپنی خاندانی حکومت کی بقا و استحکام تھا۔ اور اپنے وفاداروں کو ان کی وفاداری کا انعام و اکرام دینا تھا۔ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے جیسی پہلی حکومتیں تھیں ویسی وہ حکومت بھی تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ جو مسلمان تھے ان کے عائلی اور دیوانی معاملات شرعی اصولوں کی بنیاد پر فیصل ہوتے تھے جبکہ ہندوؤں کو اپنے مذہبی اور سماجی معاملات میں مکمل آزادی حاصل تھی۔ بہرحال اس کے باوجود کے مسلم حکمرانوں نے اسلام کی ترویج و اشاعت میں کوئی دلچسپی نہیں لی بلکہ عملاً وہ اس سے دور رہے۔ مگر مسلم اقتدار ہونے کی وجہ سے قبولِ اسلام کی راہ میں کوئی حکومتی روک ٹوک نہیں تھی اس لیے بھارت میں اسلام کے پھیلنے میں مدد ملی۔ تاریخ کی یہ ایک دلچسپ پہیلی ہے کہ جہاں جہاں عربی النسل مسلمان گئے وہاں یا تو صد فی صد آبادی یا غالب اکثریت مسلمان ہوگئی جبکہ جہاں جہاں ایرانی، تورانی، افغان، منگول نسل کے مسلمان گئے وہاں وہ مقامی آبادی کو پوری طرح متاثر کرنے میں ناکام رہے۔ یہ مطالعہ اور تحقیق کا اہم موضوع ہے جس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ بہرحال اس وقت یہ ہمارے مطالعہ اور گفتگو کا موضوع نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے مطالعے کا موضوع ہندوستان میں مسلمان سماج کی بناوٹ ہے اور اس سے اٹھنے والے سوالات اور مسائل ہیں۔

ڈاکٹر تاراچند نے اپنی کتاب ''تحریک آزادی ہند'' میں لکھا ہے:

''اسلام کے اثرات نے ہندوستان کی کلچرل زندگی میں تبدیلیاں پیدا کیں، اس نے مذہب، خیالات، زبان و ادب اور فنون لطیفہ، فنِ تعمیر، مصوری، موسیقی سب کو متاثر کیا۔ بھارتی سنسکرتی پر اس کا گہرا اور دور رس اثر پڑا۔ لیکن جہاں تک سماجی، اقتصادی عمارت کا سوال ہے اس میں کوئی ترمیم

> نہیں ہوئی۔ ہندوؤں میں قبیلوں اور ذاتوں کا جو نظام قائم تھا اور خاندانوں اور ذاتوں کے بنیادی تعلقات کے بارے میں جو ہندو لاء رائج تھے ان سب میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی بلکہ اس کے برعکس مسلمان خود ہندو مذہب میں جذب ہوگئے۔ ذاتوں کی تقسیم، شادی کے رسم و رواج اور وراثت کے قوانین جو ہندوؤں میں رائج تھے وہی ان کے اندر اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی رائج رہے۔''

ایبسٹن نے پنجاب میں مسلمانوں کی سماجی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندو مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی ان کی ذات برادری پر ذرا بھی اثر نہیں پڑا بلکہ وہ اپنے تمام تر سماجی رسم و رواج میں ہم پلہ ذات کی ہی طرح رہے۔ ان کے یہاں اعلیٰ ذات اور ادنیٰ ذات کا تصور اسی طرح قائم رہا۔ مسلمان جو شہروں اور اقتدار کے مرکزوں سے قریب تھے ان پر حکمرانوں کا رنگ پوری طرح غالب تھا اور جو لوگ دیہاتوں میں آباد تھے ان پر وہی رنگ چڑھا ہوا تھا جو ہندوؤں کا تھا۔ بقول ڈاکٹر تاراچند مذہب روزہ اور تہواروں کے معاملات میں مسلمان مختلف تھے، لیکن ان کو انجام دینے کے طور طرز میں انھوں نے بہت سا رنگ ہندوؤں سے مستعار لے لیا تھا۔ گاؤں کے تمام میلوں اور رنگ رلیوں میں دونوں مشترک ہوتے۔ گاؤں کے اونچے طبقے کے مسلمان بالکل ہندوؤں کی اونچی ذاتوں کے مشابہ ہوتے اور نیچے طبقے کے مسلمان نیچی ذاتوں کی طرح۔

بھارت کے مسلم سماج میں ذات پات کا نظام اتنی گہرائی تک پیوست ہونے کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔ پہلا اور قریبی سبب ہندو ورن ووستھا اور ہندو سماج کا اثر اور دوسرا ایرانی اثرات ہیں۔ جیسا کہ البیرونی نے اپنی کتاب ''کتاب الہند'' میں لکھا ہے قبل اسلام قدیم زمانے میں جب ایرانی بادشاہ خسرو اور داشر بن باگ نے ایرانی سلطنت قائم کی تو اس نے اپنی آبادی پر کاسٹ اور کلاس کے نظام کو سختی سے قائم کرنے کا حکم دیا، ساتھ ہی کسی کو بھی اپنے کلاس اور کاسٹ سے باہر روابط پیدا کرنے سے منع کردیا۔ پہلے درجہ میں شہزادگان اور

فوج کے اعلیٰ عہدہ دار آتے تھے۔ دوسرے درجے میں پروہت، پجاری اور قانون داں، تیسرے درجے میں حکیم، نجومی اور دیگر علوم کے ماہرین اور چوتھے درجہ میں صناع اور کاشتکار۔ یہ درجہ بندی اتنی سخت تھی کہ کوئی اس کو توڑ نہیں سکتا تھا۔ اس درجہ بندی نے بعد میں مستقل ذات کی شکل اختیار کر لی اور وقت گزرنے کے ساتھ اس نے سماج میں ایسی درجہ بندی قائم کی جو اسلام کے تصورِ مساوات پر بھاری پڑا۔ جہالت اور عصبیت کے ملے جلے اثرات کی وجہ سے یہ ہندو سماج کی طرح ہی بھارت کے مسلمان سماج کی پہچان بن گیا جس کو لوگوں نے توڑنے اور چھوڑنے کے بجائے پوری شدت سے قائم رکھا۔

اس پورے عہد میں سب سے اندوہناک پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کے شریف تعلیم یافتہ اور اونچے طبقہ نے نیچے طبقہ کو کبھی بھی اوپر اٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ذات پات اور اونچ نیچ کو دوام و استحکام عطا کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان سماج میں ذات پات کا نظام گہرائی تک پیوست ہو چکا ہے۔ اس معاملہ میں صرف حکمراں، افسران اور رؤسا نے ہی نہیں بلکہ علمائے اسلام نے بھی مجرمانہ غفلت اور کوتاہی کا مظاہرہ کیا بلکہ بعضوں نے اس کی تائید و توثیق بھی کی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان سماج خواص و عوام دونوں خانوں میں بٹ گیا جس کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا۔ جب تک ان کا اقتدار قائم رہا اس سماج کے سارے عیب ڈھکے ہوئے تھے جیسے اقتدار کا سایہ ان پر سے اٹھا یہ ننگے ہو کر کھلے میدان میں آ گئے تب لوگوں نے یہ دیکھا یہ سماج اندر سے کتنا ٹوٹا اور بکھرا ہوا ہے اور اس کے جسم پر کتنے داغ دھبے ہیں۔

1857ء کی بغاوت فرو ہونے کے بعد انگریزوں نے جو انتقامی کارروائی شروع کی اور مسلمانوں کو بغاوت کے جرم میں سزا دینے کی غرض سے جہاں ایک طرف ہزاروں علماء اور مجاہدین آزادی کو سولی پر لٹکا دیا وہیں دوسری طرف ان کی جاگیریں اور زمینداریاں چھین کر انہیں قلاش و مفلس بنا دیا اور بڑے بڑے صاحبان کج کلاہ بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ جب سرسید نے فیروز شاہ تغلق کے پوتوں اور احمد شاہ ابدالی کے نواسوں کو پاؤں دباتے اور

براہلی کرتے دیکھا تو انہیں اندازہ ہوگیا کہ حالات کتنے خراب ہوچکے ہیں۔ اس وقت انہیں قوم کی بہتری کو جو صورت نظر آئی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرکے نئ مسابقت کے لیے تیار کیا جائے اور اس کے لیے انھوں نے علی گڑھ میں جدید تعلیم کے لیے مدرسۃ العلوم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر اس حال میں انہیں دو بڑی عصبیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمانوں نے جدید تعلیم کو کرسچین اور نیچری بنانے کا پیش خیمہ مان کر ان کی مخالفت شروع کی۔ دوسرے مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ جاگیردار اور زمیندار اس بات کے لیے آمادہ نہیں تھا کہ ان کے بچے اور سفلاء طبقہ کے بچوں کے ساتھ تعلیم حاصل کریں۔ پہلی عصبیت کو سرسید نے سمجھا بجھا کر کم کردیا تھا مگر دوسری عصبیت کے سامنے انھوں نے سپر ڈال دیا اور اعلیٰ طبقہ کو یقین دلایا کہ مدرسۃ العلوم کے دروازے مسلمانوں کے نچلے طبقات کے لیے بند رہیں گے۔ اس طرح مسلمانوں کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ میں جو خلیج مسلم دورِ اقتدار میں پڑچکی تھی وہ انگریزی عہد میں بھی نہ صرف باقی رہی بلکہ گہری اور چوڑی ہوتی چلی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ وقت کے ساتھ اس شدت میں کمی آئی اور مسلمانوں کے پسماندہ طبقات کے لوگ بھی علی گڑھ میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوئے اور یہ امتیاز بڑی حد تک ختم ہوچکا ہے۔

مسلمانوں میں دینی تعلیم کی ترویج و اشاعت کے لیے دیوبند اور بریلی میں جو ادارے قائم کیے گئے وہاں بھی اعلیٰ اور ادنیٰ کا فرق دیکھا جاسکتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے درمیان چاہے جو بھی مسلکی اختلافات ہوں مگر مسلمانوں کے ادنیٰ طبقے کے بارے میں ان کی سوچ میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے جو اسلام کے تصور اخوت و مساوات سے کوسوں دور ہے۔ ایک وقت تھا کہ مدارس میں اعلیٰ طبقات کے بچے ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مگر جدید تعلیم کے رواج کے بعد ان کی ترجیح بدل گئی۔ اب مدارس میں ادنیٰ اور غریب طبقات کے بچے ہی زیادہ حاصل کرتے ہیں۔ اس وقت ہمارے گاؤں اور شہروں میں مدارس اور مساجد کا نظام انہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ غرض شرفاء اور علماء دونوں نے اس معاملے میں جس مجرمانہ ذہنیت کا ثبوت دیا ہے وہ

ہماری ملی تاریخ کا ایک افسوسناک باب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی مسلم سماج میں وہ جاہلی تعصّبات باقی ہیں جس نے ملت کے شیرازہ کو بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ رسی جل گئی ہے مگر اینٹھن باقی ہے۔

ہندو سماج جس ورن آشرم کی بنیاد پر قائم ہے اس میں اعلیٰ اور ادنیٰ ذات یعنی برہمن اور شودر کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا۔ بلکہ اعلیٰ ذات کے لوگ شودروں کو اچھوت مانتے تھے، ان کے ہاتھ کا چھوا بھی ان کے لیے ناپاک تھا، بلکہ ان کے سائے تک کو ناپاک مانتے تھے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں میں آزادی کی جنگ کے دوران جہاں ایک طرف سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی وہیں سماجی اصلاح کے ذریعہ ذات پات کے نظام کو ختم کرنے اور چھوا چھوت دور کرکے ہندو سماج کو باہم جوڑنے اور ان کے درمیان برابری اور باہمی احترام کا جذبہ پیدا کرکے ایک دھاگے میں پرونے کی کوشش کی گئی۔ ان کوششوں کے مثبت نتائج سر کی آنکھوں سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس وقت ہندوؤں میں جو احیاء پرست قوتیں ہیں انھوں نے سابقہ تمام جبروظلم کا رخ مسلمانوں کی طرف پھیر کر شودروں کے ایک بڑے طبقے کو اپنی طرف کرلیا ہے اور آج یہ شودر احیاء پرست قوتوں کا ہراول دستہ بن کر ان کے پیدل فوج میں تبدیل ہوگئے ہیں اور مسلمانوں پر حملہ کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔

دوسری طرف مسلمانوں میں افتراق و انتشار بڑھتا جارہا ہے اور ذات برادری اور مسلک کے نام پر اس قدر انتشار برپا ہے کہ دو مسلمان بھی ایک ساتھ چلنے کو آمادہ نہیں ہیں۔ مسلمان دشمن قوتیں جہاں ایک طرف اس انتشار کو ہوا دینے میں مصروف ہیں وہیں دوسری طرف مسلمان نوشتہ دیوار پڑھنے سے قاصر ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان کی تمام قومیں، ذاتیں، برادریاں اور خطے کے لوگ آپسی صف بندی کرکے اپنے سیاسی، سماجی، معاشی اور تمدنی بہتری کی کوشش کررہے ہیں مگر مسلمانوں کو جوتیوں میں دال بانٹنے سے فرصت نہیں مل رہی ہے۔ ہمارے خواص، علماء،

دانشور، دینی وملی جماعتیں سب ملت کو جوڑنے ان کے اندر اجتماعی شعور بیدار کرنے اور ان کی صف بندی کرنے میں ناکام ہیں بلکہ ہر کوئی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر اپنے شخصی اور گروہی مفاد کو ملی مفاد بتا کر اس کی حصولیابی میں مصروف ہے۔ بہرحال وقت آ گیا ہے کہ ہم اس مسئلہ کو انسانی حقوق کی عینک سے دیکھتے ہوئے زمینی حقائق کا ایماندارانہ جائزہ لیں اور پوری ملت کو یعنی شیخ وجمن دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کا داعیہ پیدا کریں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ماضی میں جو غلطیاں ہوگئی ہیں ان پر تبرہ پڑھنے یا مرثیہ گانے اور سینہ کوبی کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ملت میں دینی اور عصری شعور بیدار کر کے اس صورتحال کی اصلاح کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

قرآن پاک کی سورہ النساء واضح طور پر بتاتی ہے کہ تمام انسان ایک جان سے پیدا کیے گئے ہیں۔قرآن کے الفاظ میں:

> ''لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد وعورت دنیا میں پھیلا دیے۔'' (النساء:1)
>
> ایک دوسری جگہ اور واضح انداز میں بتایا کہ
>
> ''لوگو ہم نے تم کو ایک مرد وعورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔'' (الحجرات:13)

اسی سورہ میں قرآن فرماتا ہے کہ مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔(الحجرات:10)

حضورﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جس منشور کا اعلان فرمایا اس میں واضح طور پر کہا گیا: ''کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر اور کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔تم سب آدم کی اولاد ہو۔''

ان آیات اور احادیث کی روشنی میں اسلام نے جس وحدت آدم اور اخوت و مساوات کا تصور پیش کیا ہے ان کے مندرجہ ذیل نکات ہیں:

(1) کل کائنات اور تمام انسانوں کا خالق ایک اللہ ہے گویا سب کی تخلیق اللہ نے کی ہے۔اس طرح وحدت تخلیق کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔

(2) مرد وعورت کی تخلیق ایک جان سے ہوتی ہے۔ اس طرح دونوں کا خمیر ایک ہے۔

(3) وحدت تخلیق اور وحدت خلق کی وجہ سے سارے انسان بھائی بھائی ہیں اس طرح برابر ہیں۔اخوت، مساوات کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

(4) قومیں اور برادریاں تفاوت کے لیے نہیں بلکہ تعارف کے لیے ہیں۔

(5) علاقے اور رنگ میں فرق سے کسی پر کوئی برتری ثابت نہیں ہوتی ہے۔لہٰذا قومی، نسلی اور علاقائی برتری اور اس بنیاد پر کسی امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس طرح ایک آئیڈیل اسلامی معاشرہ میں کوئی نہ پیدائشی شریف ہوتا ہے نہ رذیل ایک آدمی اپنے اعمال اور اخلاق کے سبب شریف یا رذیل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسلام میں نسل، ذات، برادری، قبیلہ، رنگ اور علاقے کی بنیاد پر نہ کوئی اعلیٰ ہے اور نہ ادنیٰ، نہ کوئی پاک ہے اور نہ ناپاک۔ بلکہ انسانی شرف کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔چھوت اور اچھوت کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔اس طرح اسلام کا سماجی نظریہ بھارت کے قدیم سماجی نظام سے بالکل مختلف اور انقلابی نوعیت کی چیز ہے جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو اسلام میں کشش نظر آئی اور انھوں نے اس کو راہِ نجات پا کر اس کی طرف مراجعت کی۔

یہ تو اسلام کا موقف ہے۔مگر بھارت کا مسلم معاشرہ اسلام سے کتنا دور ہے، وہ مسلمان سماج کی موجودہ بناوٹ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے انسانی حقوق کی جو حق تلفی ہوتی ہے اس کی نوعیت اور سنگینی کو سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں میں کوئی اچھوت طبقہ نہیں ہے لیکن اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز بہت گہرائی تک پیوست ہے جس کی وجہ سے ذات برادریاں بن گئی ہیں جن کے درمیان باہمی ارتباط نہ کے برابر ہے۔مسلمان سماج نارنگی کی طرح نہیں ہے جس کو ایک خول نے پوری طرح ڈھانپ رکھا

ہے اور اندر کی ہر قاش ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ جب تک آپ اس خول کو توڑیں گے نہیں اندر کی قاش کو الگ نہیں کر سکتے ہیں۔ مسلمان سماج اینٹ کی اس دیوار کی طرح ہے جو ایک دوسرے پر رکھ دی گئی ہے اور ان اینٹوں کو باہم جوڑے رکھنے کے لیے کوئی چونا گاڑا، نہیں لگایا گیا ہے، جس کو ایک دھکے میں بآسانی ڈھایا جاسکتا ہے اور جو چاہے اس میں سے چند اینٹ اٹھا کر لے جاسکتا ہے۔ مسلمان سماج کی اس اندرونی کمزوری نے اس سماج کی ہوا اکھاڑ دی ہے۔ نہ یہ اسلامی آئیڈیل پر قائم سماج ہے اور نہ وہ جدید انسانی قدروں کی امین ہے۔ دراصل مسلمان سماج میں غربت اور جہالت عام ہے اور مسلمانوں میں ایسی تمدنی لیڈرشپ مفقود ہے جو اس کو بدلتے ہوئے تہذیبی روایات کے مطابق اپنے اقدار کے ساتھ اس کی تشکیل نو کر سکے۔ بہرحال انسانی شرف و مساوات نہ صرف اسلام کا بلکہ دستور ہند کا بھی آئیڈیل ہے۔ لہٰذا ماضی میں بھارت کا سیاسی اور سماجی ڈھانچہ جو بھی رہا ہو، بھارت کی نئی سماجی اور سیاسی ڈھانچے کی تشکیل دستور ہند کے دائرے میں ہوگی۔ دستور ہند نے اپنے ابتدائیہ میں بھارت کو ایک خود مختار سوشلسٹ سیکولر عوامی جمہوریہ قرار دیتے ہوئے تمام شہریوں کو انصاف، سماجی، معاشی اور سیاسی طور پر متحقق کرنے کا وعدہ کیا ہے، اسی کے ساتھ تمام شہریوں کو فکر، خیال، عقیدے، یقین اور عبادت کی آزادی کا وعدہ کیا ہے تمام شہریوں کو مقام و مرتبہ اور مواقع میں برابری کی بات کی ہے اور تمام شہریوں کے درمیان احترام اور بھائی چارہ کو یقینی بنانے کی بات کی گئی ہے۔

دستور کے ان آئیڈیل کو بروئے کار لانے کے لیے بنیادی حقوق کے باب میں جو دستور کے پارٹ -III میں درج ہے دفعہ 14 میں تمام شہری قانون کے سامنے برابر ہیں۔ دفعہ 15 میں کہا گیا ہے کہ مذہب، نسل، برادری، جنس اور جائے پیدائش کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ دفعہ 16 میں سرکاری نوکری میں سب کو برابری کا موقع دیا جائے گا۔ دفعہ 17 میں چھوا چھوت کی ممانعت، دفعہ 18 میں خطابات کی منسوخی، دفعہ 19 میں بولنے کی اجازت، دفعہ 21 میں زندگی اور انفرادی آزادی، دفعہ 25 میں ضمیر اور پیشے کی آزادی نیز تبلیغ

دین کی آزادی، دفعہ 26 میں مذہبی امور کو منظّم کرنے کی آزادی اور اس کے ساتھ جو لوگ اقلیت میں ہیں ان کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے، اپنی زبان، رسم الخط اور تہذیب کی حفاظت کرنے اور اپنے تعلیمی ادارے کھولنے اور چلانے کی آزادی دی گئی ہے۔

اس طرح بھارت کا دستور مساوات پر مبنی (Egiliterian Society) سماج اور سیاست کی تشکیل کا ایک ایسا دستاویز ہے جو بھارت میں سماجی تبدیلی کا ایک انقلاب انگیز خاکہ پیش کرتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ آزادی کی سات دہائیوں کے بعد بھی بھارت کی سماجی زندگی میں بہت تبدیلی نظر نہیں آئی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ چھوا چھوت میں کمی آئی ہے، پسماندہ طبقات کو تعلیم، روزگار اور سیاست میں رزرویشن کی وجہ سے اوپر آنے کا موقع ملا ہے۔ مگر سماج میں ذات، برادری، علاقے اور زبان کی بنیاد پر تفریق بڑھی ہے جس نے سیاسی رنگ لے لیا ہے اور ہر طبقہ اپنی نمائندگی اور حصہ داری کے لیے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہے۔ مگر اس کشمکش کا فائدہ یہ ہو رہا ہے کہ سماج مساوات کی طرف گامزن ہے اور ہر طبقہ کو اوپر اٹھنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس وقت ہندو سماج میں برتری حاصل کرنے کے لیے جو اندرونی کشمکش چل رہی ہے وہ ورن سنگھرش کا روپ نہ دھار لیے اس لیے اس سے اس سماج کو بچانے کے لیے اکثریت (Majoritarnism) اور اقلیت (Minoritrism) کی نئی جنگ چھیڑی جارہی ہے۔ یہ سلسلہ آزادی کے قبل سے جاری تھا، آزادی کے بعد اس کی دھار اور تیز ہوگئی۔ 1990 کی دہائی میں رام مندر آندولن کے سبب اس کو عوامی قبولیت حاصل ہونے لگی جس کے نتیجے میں بی جے پی اور سنگھ پریوار کو زبردست اچھال حاصل ہوا اب جبکہ بیشتر ریاستوں میں اور مرکز میں بی جے پی اور اس کی حلیف پارٹیوں کی سرکار قائم ہوچکی ہے تو اکثریت نوازی کی سیاست نازیت اور فاشیت کی طرف گامزن ہے جس نے مسلمانانِ ہند کے سامنے وجودی بحران (Existential Crisis) کھڑا کردیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مسلمان اس صورتحال سے کیسے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ بہرحال ہندوستانی مسلمان اپنی ملی تاریخ کے انتہائی نازک اور بحرانی دور سے گزر رہے ہیں۔ ان حالات میں مسلمان سماج کا

اندرونی مطالعہ اس سماج کو سمجھنے اور ان کے حالات اور مسائل سے آگاہ ہونے میں مددگار ہوگا اور شاید یہیں سے فلاح و بقا کی کوئی راہ نکلے گی۔

ماہرین سماجیات جنھوں نے بھارت کے مسلم سماج کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے ان کی رائے میں گرچہ اسلام مساوات پر مبنی دین ہے جہاں ذات برادری کی تفریق نہیں ہے لیکن بھارت کے مسلم سماج میں ہندو سماج کی طرح ہی ذات برادری کی تفریق پائی جاتی ہے۔ لہٰذا موجودہ مسلم سماج کو تین بڑی سماجی اکائیوں میں بانٹا جاسکتا ہے:

(1) اشراف: ان میں وہ لوگ آتے ہیں جو خود کو عرب، فارس، ترکستان اور افغانستان سے آنے والے مسلمانوں کی نسل سے بتاتے ہیں یا ہندوؤں کی اعلیٰ ذات جنھوں نے اسلام قبول کرلیا ان کی اولادیں ہیں۔ سید، شیخ، پٹھان وغیرہ اشراف میں شمار کیے جاتے ہیں۔

(2) اجلاف: ان میں وہ لوگ آتے ہیں جو پیشہ ور ہیں اور مختلف قسم کی خدمات انجام دیتے ہیں اور ہندوؤں کے پچھڑے طبقے سے تبدیل دین کرکے اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ ان میں جولاہے، دھوبی، تیلی، کنجڑا وغیرہ آتے ہیں۔

(3) ارذال: یہ وہ طبقہ ہے جو ہندوؤں کے سب سے نچلی ذات سے اسلام میں آیا ہے اور وہاں اچھوت سمجھے جاتے رہے ہیں۔ جیسے حلال خور، لال بیگی، ابدال، بیدیا وغیرہ جوگندہ پیشہ کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جو سماج کی گندگی صاف کرنے پر مامور ہیں۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد 1955 میں کاکا کالیکر کی صدارت میں پہلی بیک وارڈ کلاسز کمیشن تشکیل دی گئی جس نے اپنی رپورٹ میں 2399 ذاتوں کو پچھڑا قرار دیا اور اس میں 837 کو حد درجہ پچھڑا بتایا جس میں ہندوؤں کے علاوہ کچھ مسلم ذاتیں بھی تھیں۔ لیکن چونکہ اسلام میں ذات پات کا تصور نہیں ہے اس لیے چیئرمین کاکا کالیکر نے کہا کہ چونکہ مسلم اور کرسچین سماج میں ذات پات کا تصور نہیں ہے اس لیے اگر ذات کی بنیاد پر کچھ

سفارشیں کی جاتیں ہیں تو ان سماجوں پر غیر صحت مندانہ اثر پڑے گا۔ اس طرح مسلمانوں کے بعض طبقات کو سماجی اور معاشی طور پر پچھڑا مانتے ہوئے انھوں نے اس کی بہتری کی کوئی تجویز نہیں پیش کی۔

1980 میں بی پی منڈل کی صدارت میں دوسری بیک وارڈ کمیشن تشکیل دی گئی جس نے 11 اشاریوں کی بنیاد پر جس میں کاسٹ اور کلاس کے صفات شامل تھے سماجی اور تعلیمی پسماندگی جاننے کی کوشش کی۔ کمیشن کی رائے میں گرچہ دستور مساوات پر مبنی سماج بنانا چاہتا ہے مگر ہندو سماج کی بناوٹ ذات کی بنیاد پر ہی ہے اور اس نے 3743 ذاتوں کو پچھڑی ذات بتایا اور کمیشن نے بتایا کہ غیر ہندو قومیں مثلاً مسلمان اور عیسائیوں کے یہاں جہاں ذات پات کا باضابطہ نظام نہیں ہے وہاں بھی ذات یا ذات جیسی صفات پائی جاتی ہیں اور 1931 کی مردم شماری کی بنیاد پر 82 مسلم ذاتوں کو او بی سی درجے میں رکھا۔ چونکہ اسلام تصور مساوات کا علم بردار ہے لہٰذا پیدائش یا پیشہ کو پچھڑا پن کی بنیاد پر ماننے کے بجائے جہالت اور غربت کی بنیاد پر ان افراد کو پچھڑی ذات کی کیٹگری میں شامل کیا گیا۔ اس طرح یہ سارے افراد اجلاف قرار دیے گئے اور جو اچھوت دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے انھیں ارذال قرار دیا گیا۔ اس طرح بھارت کا مسلم سماج اشراف، اجلاف اور ارذال تین خانوں میں بٹا ہوا ہے جو ہندوؤں کی طرح الگ الگ سلسلہ نسب رکھتے ہیں، الگ الگ پیشوں میں لگے ہوئے ہیں اور جن کے درمیان شادی بیاہ کے رشتے نہیں ہوتے۔ اس طرح یہ تینوں گروہ اپنی مختلف شناخت رکھتے ہیں اور ان کے درمیان خاص قسم کی عصبیتیں پائی جاتی ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ منڈل کمیشن کے مطابق 82 مسلم ذاتوں کو او بی سی خانے میں رکھا گیا ہے۔ اسی طرح 35 مسلمان ذاتوں کو شیڈول کاسٹ یعنی ارذال قرار دیا گیا ہے مگر انھیں دلت ہندوؤں کو ملنے والی مراعات اور تحفظات سے محروم رکھا گیا ہے۔

آدی باسیوں میں جن کو شیڈول ٹرائبس کہا جاتا ہے مسلمانوں کی آبادی بہت تھوڑی ہے 1991 کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں میں کل آدی باسی آبادی

1,70,428 ہے جو کل آدی باسی آبادی کا محض 0.25 فیصد ہے۔ لکش دیپ میں مسلمان آدی باسیوں کی آبادی 99.74 فیصد ہے جبکہ ہماچل پردیش میں 7 فیصد اور دوسری ریاستوں میں اور بھی کم ہے۔

ان تمام طبقات کے علاوہ مسلمانوں میں ایک طبقہ اور ہے جو کسی سماجی مطالعہ میں نہیں آتا۔ وہ خود کو کلچرل مسلمان کہتا ہے۔ یہ عقیدہ اور ذہنیت کے اعتبار سے مسلمان سماج کا حصہ نہیں ہے لیکن ایک Parasite کی طرح مسلم سماج سے چمٹا رہتا ہے اور وقت کے حکمرانوں سے اپنی وفاداری کے عوض مسلم سماج کو ملنے والے فوائد و مراعات کا بڑا حصہ اپنے نام کر لینے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ یہ طبقہ مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتا لیکن خود کو مسلمانوں کا نمائندہ اور ترجمان بنا کر پیش کرتا ہے۔ لوگ اس کی غیر نمائندہ حیثیت جاننے کے باوجود اس کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ پڑھا لکھا ہونے کے نتیجہ میں حکومت کے لیے کئی معنوں میں مفید ہوگیا ہے۔ یہ طبقہ حکومت کو بھی خوب بھاتا ہے۔ اولاً اس کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے اس لیے ان کو خوش کرنے کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوم یہ کم قیمت پر اپنا دین وضمیر بیچنے اور ملی و اجتماعی مفاد کا سودا کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ یہ حکومت کے لیے بادشاہ سے زیادہ وفادار ہوتے ہیں اور اس کی وفاداری میں کسی حد تک جاسکتے ہیں۔ سوم ملک کی حقیقی صورتحال پر پردہ ڈالنے میں یہ بہت مفید ثابت ہوتے ہیں اور ساری دنیا میں سب کچھ ٹھیک کا ڈھنڈورہ پیٹنے کے کام آتے ہیں۔ چہارم یہ جڑ کٹے لوگ ہوتے ہیں لہٰذا ان کو ڈیل کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ یہ اپنے ذاتی اور خاندانی مفاد سے آگے کچھ نہیں دیکھتے اور اس کی خاطر پوری قوم کو داؤ پر لگانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ہندوستان میں ملک و ملت کو جتنا اس طبقے نے نقصان پہنچایا ہے اتنا اس کے دشمنوں نے بھی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ یہ سرکاری اور درباری مسلمان ہیں۔ یہ اس وقت بھی تھے جب مغلوں اور پٹھانوں کی حکومت تھی، اس وقت بھی تھے جب انگریز حکمراں تھے، اس وقت بھی جب کانگریس کی حکومت تھی اور آج بھی ہیں جب ہندتو کے علمبرداروں

کی حکومت ہے۔ اس طبقے میں سیاست داں بھی ہیں، بیوروکریٹس بھی ہیں، دانشور اور صحافی بھی ہیں اور علماء کا ایک طبقہ بھی ہے۔ مسلمانوں میں ذات پات کے نظام کو قائم رکھنے اور ان کے اندر اندرونی کشمکش کا ماحول پیدا کرکے یہ طبقہ اپنی روٹی سینکنے میں مصروف ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس طبقے میں کم وبیش مذکورہ بالا تمام طبقات کے لوگ شریک ہیں۔ لہٰذا ہمیں مسلمانوں میں ذات پات کے نظام پر غور کرتے وقت اس طبقے کے رول اور کردار پر بھی غور کرنا ضروری ہوگا۔

کل ملا کر جو صورتحال بنتی ہے وہ یہ ہے کہ بھارت کا مسلم سماج بھی ہندوسماج کا چربہ ہے۔ مسلم عہد سے لے کر اب تک مسلمان سماج کو باہم مربوط کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی ہے۔ تمام مصلحین، علماء اور دانشوروں نے گروہی اور طبقاتی مفاد کو زیادہ ترجیح دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ مسلمان ٹوٹتے اور بکھرتے چلے گئے اب صورتحال یہ ہے کہ عمل جراحی کے تحت ان کو اس طرح Clinically Divide کردیا گیا کہ ان کا باہم مربوط ہونا قریب قریب ناممکن ہوگیا ہے۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد سے ہی حالات سنگین ہوگئے تھے۔ تمام تر دستوری ضمانتوں کے باوجود مسلمان ہر طرح کے تحفظات سے محروم کردیے گئے۔ ہندتو کے فروغ کے بعد ان کی حیثیت عملاً دوسرے درجے کے شہری کی ہوگئی ہے۔ جان ومال پر حملہ کے ساتھ ساتھ ہر روز ان کے شہری اور انسانی حقوق پر شب خون مارا جارہا ہے۔ لیکن اب بھی ہماری قیادت، علماء، دانشور، سماجی و سیاسی کارکنان اور صحافی خواب خرگوش میں مبتلا ہیں۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کے شہری اور انسانی حقوق کی حفاظت کیسے ہوگی؟ یہ ملین ڈالر کا سوال ہے جو مثبت جواب کا منتظر ہے۔

ہم نے اوپر مسلمان معاشرے کی نظریاتی بنیاد، اور بھارت کے مسلمان معاشرے کی بناوٹ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس تفاوت کے نتیجے میں اس معاشرے کے شہری اور بنیادی حقوق پر جو خطرات منڈلا رہے ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہمیں اس بات کا کھلے

دل سے اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم مجموعی طور پر خدا اور خلق دونوں کے مجرم ہیں اور تاریخی طور پر ہم اپنی دینی اور سماجی ذمہ داری ادا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ہم نے نہ صرف اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ انصاف، مساوات اور رواداری کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ عام انسانوں کے سامنے اپنے دین اور سماج کی اچھی نمائندگی نہیں کی۔ آج بھارت کے مسلم سماج کو جن حالات اور چیلنجز کا سامنا ہے اس میں ہماری ان مجرمانہ کوتاہیوں کا بڑا دخل ہے۔ ماضی کی ناکامیوں پر مرثیہ یا تبرّا پڑھنے کے بجائے ہمیں حالت کی صورت گری پر توجہ دینی چاہیے۔

اب نہ مسلمانوں کو حکومت ہے اور نہ انگریزی حکومت ہے۔ ملک تقسیم ہو چکا ہے۔ نہ جاگیرداری ہے نہ زمینداری۔ ملک میں جمہوریت ہے، قانون کی حکمرانی ہے اور دستور اور قانون کی نظر میں ہر فرد برابر ہے۔ مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی طرح طرح کے تعصّبات اور امتیازات کا سامنا ہے۔ جان، مال، عزت، آبرو، حقوق و اختیار ہر چیز پر خطرات منڈلا رہے ہیں اور مسلمان سماج کا جو طبقہ جتنا کمزور ہے اور اتنا ہی اس کی زد پر ہے۔ انصاف کی دیوی اندھی ہے، انصاف کے ادارے دوہرا معیار رکھتے ہیں، انصاف بہت مہنگا، اور بہت دیر طلب ہے تاتریاق از عراق آوردہ شود مارگذیدہ مردہ شود۔ ایک عام آدمی ایک غریب آدمی اتنا خرچیلا اور دیر طلب انصاف کے نظام سے انصاف حاصل ہی نہیں کرسکتا ہے۔ عدالت کے دروازے دولت مند اور با اثر لوگوں کے لیے کھلے ہیں۔ پسماندہ، غریب عوام اور کمزور اقلیتوں اور دلتوں کو تو یہاں تو نہیں قیامت میں ہی انصاف ملے گا۔ اس لیے حق اور انصاف کی جدوجہد پہاڑ کی لمبی چڑھائی ہے جہاں بہت سی کھائی ہے اور جوکھم اٹھا کر ہی اس راہ میں قدم رکھا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے حق اور اختیار کی لڑائی دو سطحوں پر لڑنی ہوگی:

(1) ملت کے اندر اور دوسرے

(2) ملت کے باہر جس میں ہماری لارجر سوسائٹی اور حکومت دونوں آتے ہیں اور یہ

لڑائی جمہوری طور پر قانون اور دستور کے دائرے میں لڑنی ہوگی۔

(1) پہلا محاذ تو ہمارا ملی محاذ ہی ہے۔ ملی محاذ میں سب سے اہم سماجی محاذ ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں نے جب اپنی حکومت قائم کرلی اسی وقت سے انھوں نے ملک کے نظام کو چلانے کے لیے اپنا تعلیمی نظام قائم کیا اور ساتھ ہی اپنی انتظامی مشنری کی تزئین نو کی جس کے لیے انہیں مقامی کارندوں کی ضرورت تھی۔ ہندوؤں کے بڑے طبقے نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور جدید علوم وفنون سے وابستہ ہوکر نہ صرف وہ انگریزوں کے عہدے دار ہوگئے بلکہ نئی تعلیم کی وجہ سے ہندوسماج میں جو خرابیاں تھیں اس کے اصلاح کا دروازہ بھی کھلا۔ عورتوں کے حقوق، ہندو پسماندہ ذاتوں کے حقوق، چھوا چھوت اور اس طرح کے کئی معاملوں میں زبردست اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں اور اس سلسلے میں قوانین بھی بنائے گئے، اس طرح ہندوؤں کے تمام طبقات میں اصلاح وبیداری کی مہم شروع ہوئی اور ہندوسماج اپنی بہت سی سماجی خامیوں کی طرف متوجہ بھی ہوا۔ چونکہ ہندوؤں میں ذات پات کا نظام بہت سخت تھا، اس لیے اس کی مخالفت بھی بہت ہوئی۔ ہندوستان کی جنگ آزادی سماجی اصلاح کا ہراول دستہ بن گئی اور بعد میں یہ عوامی تحریک کی شکل اختیار کرگئی جس کی وجہ سے ہندوسماج کی اصلاح میں مدد ملی اور اس نے اپنے بہت سے اندرونی تضادات پر قابو پالیا اور ایک قوم ہونے کا احساس وقت کے ساتھ مضبوط ہوتا چلا گیا۔ اس وقت برہمن اور دلت دونوں خود کو ہندوقوم کا حصہ مانتے ہیں اور اس اعتبار سے اپنے حقوق اور مراعات کا مطالبہ کررہے ہیں۔ سیاسی طور پر ان کو متعین حقوق دیے گئے ہیں اور تعلیمی اور معاشی حقوق بھی بحال کردیے گئے ہیں۔ لہٰذا اس وقت دلت ہندوسماج کا تیزی سے ترقی کرنے والا طبقہ ہے اور دھیرے دھیرے ان کی محرومیاں کم ہورہی ہیں۔ اب دلت قیادت میں ریاست میں حکومتیں بھی نہیں رہی ہیں اور وہ اب صرف لینے والے نہیں دینے والے ہاتھ بھی بنتے جارہے ہیں۔ چھوا چھوت قانوناً جرم ہے۔ پوری حکومتی مشنری اس کی روک تھام میں چاق و چوبند ہے۔ اگر کہیں ذاتی دنگے ہوتے ہیں تو فوراً اس پر قابو پالیا

جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاہے کانگریس ہو، یا سنگھ پریوار یا علاقائی پارٹیاں سبھی دلتوں کی سیاست کرتی ہیں اور ان کو آگے بڑھانے، امپاور کرنے اور سماج میں جو ان کا حق ہے ان کو دلانے میں تمام سماجی، سیاسی، قانونی اور اخلاقی مدد کرتی ہیں۔ یہ طبقہ تاریخ کے لمبے دور میں جتنا محروم اور نظر انداز رہا تھا آج اتنا ہی مراعات یافتہ اور لائم لائٹ میں ہے جس نے اس کی سماجی، سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی حیثیت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ یہ تفصیل میں نے اس لیے لکھی ہے کہ مسلم سماج میں اپنے کمزور اور حاشیہ پر رہنے والے گروہوں کو اوپر اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ جو لوگ اوپر اٹھنے اور اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے ان کو دبانے کی کوشش کی گئی۔

ایسا نہیں ہے کہ مسلمانوں میں دینی سماجی اور تعلیمی اصلاح کی کوششیں نہیں کی گئیں۔ مگر یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ہمارا اجلاف اور ارذال کا طبقہ ان تمام اصلاحی کوششوں سے دور رکھا گیا۔ مسلمانوں میں جو بھی سیاسی دھرے بندی تھی وہ ان کے اعلیٰ طبقات تک محدود تھی اور انہی کے مفادات کی بات کرتی تھی۔ مسلمان عوام اس پورے عمل سے دور رکھے گئے۔ مسلم لیگ نوابوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کی پارٹی تھی۔ یہی حال احرارسٹ، یونین پارٹی اور دیگر دھروں کا تھا۔ مسلمانوں میں جو مذہبی اصلاحی تحریکیں اٹھیں ان کی یہی چلت پھرت اعلیٰ اور درمیانی طبقے تک محدود تھی۔ ادنیٰ درجہ کی طرف کسی نے مراجعت نہیں کی۔ تعلیمی بیداری کی تحریک کا مقصد مسلمانوں کے اعلیٰ خاندانوں میں جدید تعلیم کا فروغ تھا۔ مذہبی اور سماجی اصلاح میں جہاں ایک طرف اصلاح عقائد پر زور تھا شرک و توحید، بدعت و سنت، علم غیب، میلاد کی مجلسوں میں قیام، عرس و قوالی، فاتحہ نیاز وغیرہ امور پر تو بہت بحثیں ہوتیں اور اس بنیاد پر کفر و اسلام کے معرکے سر ہوتے، مگر چاہے دیوبند ہو، بریلی ہو، اہل حدیث کی تحریک ہو کہیں بھی اس بات کا اتا پتا نہیں ملتا کہ کسی نے یہ تحریک کی ہو کہ شہروں اور دیہاتوں میں جو ہماری غریب پسماندہ برادریاں ہیں جو اپنی غربت اور جہالت کی وجہ سے مسلم مین اسٹریم سے کٹی ہوئی ہیں جس کے سبب وہ کفر و

اسلام کی سرحد پر کھڑی ہیں ان کو اوپر اٹھایا جائے۔ ان کے اندر اخوت اور مساوات کا سبق عام کیا جائے اور ان کی علمی اور اخلاقی تربیت کر کے سماج میں ان کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی جائے۔ نوابوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کے ذہن و خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی۔ اس کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے، مگر علماء اور دانشوروں نے بھی اس جانب دھیان نہیں دیا یہ بات بہت ہی افسوسناک ہے۔

1932 میں جب کانگریس نے ماس کنٹیکٹ کی مہم شروع کی اور مسلمانوں کے اعلیٰ طبقات کے علاوہ ادنیٰ طبقات میں نفوذ پیدا کرنے کی مہم چلائی تو اعلیٰ طبقات بشمول علماء کی پیشانی پر بل آنے لگے۔ اس وقت بھی وہ اس مہم کا استقبال کرنے کے بجائے اس کی مخالفت پر آمادہ ہوگئے۔ ملک میں جمہوریت اور جمہوری قدریں جس طرح دستک دے رہی تھیں ان کی کھٹکھٹاہٹ انہیں بالکل سنائی نہیں دی اور وہ ازمنہ وسطیٰ کے معاشرتی نظام و روایات سے بندھے رہے۔

وقت کے ساتھ جب تعلیمی اداروں کے دروازے نچلی اور پس ماندہ ذاتوں کے لیے بھی کھلنے لگے اور ان طبقات میں کچھ لوگ پڑھ لکھ کر سامنے آئے تو ان کو کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیوں نے آگے بڑھایا اور کچھ کو قیادت کے منصب پر فائز کیا تاکہ اپنی ذات اور طبقات میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس وقت بھی ان کے ساتھ دست تعاون دراز کرنے کے بجائے ان سے مسابقت اور مخالفت کا رشتہ رکھا گیا جس کی وجہ سے ان نووارد لیڈران میں تلخی اور بدمزگی پیدا ہوئی۔ گویا پسماندہ طبقات میں بیداری کی مہم ملت میں ایک نئے انتشار کا شاہ دروازہ بننے لگی اور یہ لوگ مجموعی طور پر دو دھڑوں میں بٹ گئے۔ ایک دھڑے کی پشت پناہی کانگریس کر رہی تھی تو دوسرا دھڑا مسلم لیگ کے ساتھ تھا۔ اس دور میں مسلمانوں کی سیاست کس انداز کی تھی اس کا نقشہ اکبرالہ آبادی نے اس طرح کھینچا ہے۔

پہلا سین:

کاؤنسل میں سبھی سید، مسجد میں فقط جمن

دوسرا سین:

جمن میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گوگرد راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

بیسویں صدی کے اوائل سے لے کر جنگ آزادی تک مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی اتحاد کی باتیں بہت ہوئیں مگر یہ پوری تحریک صرف 20 فیصد مسلمانوں تک محدود تھی۔

منٹو مورلے ریفارم کے تحت انڈین کونسل ایکٹ 1909 میں علیحدہ انتخاب کی جو اسکیم جاری کی گئی اس میں ہندو، سکھ اور مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب کا موقع دیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہندو ہندو کو، مسلمان مسلمان کو اور سکھ سکھ کو چنیں گے۔ لیکن یہ چناؤ صرف اعلیٰ طبقات کے درمیان ہی ہوتا تھا کیونکہ ووٹ کی اہلیت کے لیے جو شرائط رکھے گئے تھے وہ نچلے طبقے کے لوگوں کے لیے پورا کرنا ناممکن تھا۔ لہٰذا ان کے حصہ میں سیاسی حصہ داری ایک سراب سے کم نہ تھی۔

آزادی کی تحریک جیسے جیسے آگے بڑھی اور کانگریس نے شہروں اور دیہاتوں میں اپنی جدوجہد کا پھیلاؤ شروع کیا اس وقت بہت سی پسماندہ ذات برادریاں بھی اس جدوجہد میں حصہ لینے لگیں۔ 1917 میں روس میں بولشیوک انقلاب کے بعد کمیونسٹ پارٹیوں نے مزدوروں اور کسانوں کو منظّم کرنا شروع کیا اس کے نتیجے میں کمزور اور پسماندہ طبقات کے لوگ اوپر اٹھ کر آئے۔ لیڈر شپ کی سطح پر تو چاہے کانگریس ہو یا کمیونسٹ یا شوسلسٹ پارٹیاں اس میں بڑی ذات کے لوگوں کا ہی دبدبہ رہا لیکن ان کے کیڈر میں بیک وارڈ اور پسماندہ ذاتوں کے لوگ بھی آئے جنھوں نے ان تحریکات کو گاؤں دیہات کے دور دراز علاقوں میں پھیلانے اور پہنچانے میں مدد کی۔ مسلمانوں نے چونکہ اس میدان کو خالی چھوڑ دیا تھا اس لیے مسلمان اس جانب آئے تو مگر ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لیے عام مسلمانوں کا سماجی اور سیاسی شعور عام ہندوؤں کے سماجی اور سیاسی شعور سے کم تر رہا اور ہے۔

مسلمانوں کے اعلیٰ طبقات نے زور مار کر پاکستان تو بنوالیا لیکن جب پاکستان بن گیا تو پاؤں تلے سے زمین کھسکتی نظر آئی۔ نتیجتاً انہیں اس ملک کو چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ ملک میں بچ گئے مسجدوں کی مینار یں اور چند ٹوٹے پھوٹے لوٹے۔ آزادی اپنے ساتھ آگ اور خون کی ہولی لے کر آئی۔ جو لوگ بٹوارے کے مجرم تھے وہ تو پاکستان چلے گئے اور جو لوگ اس جنگ میں شامل نہیں تھے انھیں ہی غنیم کی فوج کا سپاہی مان کر یرغمال بنالیا گیا اور ان کی رہائی کے لیے تاوان طلب کیا جارہا ہے۔

ایک طبقہ رواداری کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے تو دوسرا یہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہے کہ مسلمان بھارت کا وفادار بھی ہوسکتا ہے۔ وہ یا تو ان کا شدھی کرن کرنا چاہتا ہے یا پھر ان کو شہری حقوق سے محروم کر کے دوسرے درجے کا شہری بنا کر غلاموں کی طرح رکھنا چاہتا ہے۔ مسلمان ہیں کہ ابھی تک جوتیوں میں دال بانٹنے سے باز نہیں آرہے ہیں۔ اس حبس بھرے ماحول میں بھی ذات برادری اور مسلکی عصبیت میں گلے گلے ڈوبے ہوئے ہیں اور کوئی کسی کا ہاتھ تھام کر چلنے کو تیار نہیں ہے۔

ہم لوگ اس وقت اکیسویں صدی کی تیسری دہائی کا آغاز کررہے ہیں۔ آنے والے دن خطرات اور آزمائشوں سے پر ہیں۔ ایک فسطائی حکومت پوری قوت سے برسراقتدار ہے اور کافی طویل عرصے تک حکمرانی کے منصوبے بنارہی ہے۔ ملک کا دستور یا تو معطل کردیا جائے گا یا اس کو بدل دیا جائے گا۔ لہٰذا ہم جن موہوم سہاروں پر ٹیک لگا کر کھڑے ہیں وہ سہارا ہی ٹوٹ سکتا ہے یا بدل سکتا ہے۔ اس لیے ماضی کی تمام جاہلانہ عصبیتوں سے بیک جنبش باہر آنے کا وقت آگیا ہے اور ایک زبردست سماجی اصلاح کی مہم شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ اہل قبلہ جو خود کو مسلمان کہتا ہے وہ مسلمان ہے۔ وہ شہری ہو دیہاتی ہو، پڑھا لکھا ہو، بے پڑھا ہو، امیر ہو غریب ہو، اونچی ذات سے تعلق رکھتا ہو یا نیچی ذات سے تعلق رکھتا ہو، مہذب ہو یا غیر مہذب ہو، عورت ہو مرد ہو، کوئی کام اور کوئی پیشہ کرتا ہو، وہ مسلمان ہے، ہمارا بھائی ہے۔ برابر کا فرد ہے۔ اس کی عزت، اس کی

ضرورت، اس کی خدمت ہم سب پر فرض ہے۔ اشراف، اجلاف اور ارذال کے درمیان ایک دینی انسانی رشتہ بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ اس وقت ملت کے تحفظ و بقا کی پہلی سیڑھی ہے۔ لہٰذا اوپر والے کو نیچے آکر، نیچے والے کو اوپر لانا ہوگا۔ جب نچلی سطح اوپر اٹھے گی تو اوپری سطح خود بخود اور اوپر اٹھ جائے گی۔ اس وقت ملت کی بقا جمن میاں کی اصلاح و تربیت میں ہے۔ جمن میاں محفوظ ہوں گے، ان کی تعلیم ہوگی، ان کا امپاورمنٹ ہوگا، ان کی ترقی ہوگی، ان کے اندر اتحاد و جمعیت پیدا ہوگی تو اس سے پوری ملت کو طاقت وقوت ملے گی اور ملت مضبوط بنیادوں پر آگے بڑھنے کے لائق ہوگی۔

اس لیے سب سے پہلی ضرورت ملت کی اندرونی اصلاح ہے۔ پوری ملت کو تعلیمی تہذیبی، سماجی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے اوپر اٹھانے کی ضرورت ہے۔ ملت میں مذہب، سماج اور ثقافت کے راستے جتنی خرابیاں در آئی ہیں ان کی نشاندہی کر کے آئندہ دس سالوں تک ایک مضبوط سماجی تحریک کے ذریعہ ان تمام ایشوز کو ایڈریس کرنے کی ضرورت ہے جس سے لوگوں نے کوتاہی برتی ہے۔ اب ایک لمحہ کی غفلت ملت کے لیے ہلاکت خیز ہوسکتی ہے۔

وقت آگیا ہے کہ پسماندہ ذاتوں اوراس کی قیادت سے مسابقت کرنے کے بجائے ان سے معاونت کیا جائے اور ان کو ساتھ لے کر ایک مشترکہ لائحہ عمل طے کیا جائے۔ ظاہری بات ہے یہ آسان عمل نہیں ہوگا کیونکہ پسماندہ ذاتوں اور ان کی قیادت کے اندر جو ماضی کی تلخی ہے اس کو آسانی سے دور نہیں کیا جاسکتا ہے اس کے لیے صبر اور حکمت کے ساتھ ایماندارانہ انسانی ہمدردی(Genuine Human Empathy) کا مظاہرہ کرنا ہوگا جس کے لیے اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی اصلاح ضروری ہے۔ میری رائے میں اگر مندرجہ ذیل امور کو اجتماعی طور پر ملی اصلاح کا ایجنڈا بنایا جائے تو ایک طرف انسانی حقوق کی بحالی اور حفاظت کو مہمیز ملے گی اور دوسری طرف ملی بقا کی راہ ہموار ہوگی۔ اس وقت ہمارے سامنے جو وجودی مسائل درپیش ہیں اس کو ہم افراد اور طبقات کی سطح پر الگ الگ

گروہوں میں بٹ کر حل نہیں کر سکتے ہیں۔ لہٰذا سماجی اصلاح کے مندرجہ ذیل ایجنڈے پر نہ صرف ہمدردانہ اور مثبت انداز سے غور کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ایک زبردست سماجی اصلاحی تحریک وقت کی ضرورت ہے۔

■❖■

تعلیم کا پھیلاؤ

تعلیم اصلاح، تربیت، اختیار اور قوت کا شاہ دروازہ ہے۔ لہٰذا تعلیم کو ایک مشن بنا کر مسلمانوں کے ہر طبقے اور ہر گروہ میں عام کرنے کی اجتماعی اور شعوری جدوجہد کی ضرورت ہے تاکہ مسلم سماج کا کوئی بچہ خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی تعلیم سے بے بہرہ نہ رہے۔ اس کے لیے ملت کے پاس جو بھی سرمایہ، وسائل اور صلاحیت ہے اس کو پورے کا پورا لگانے اور کھپانے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی حکومت نے تعلیم کے پھیلاؤ کے لیے جو ادارے اور اسکیمیں قائم کر رکھے ہیں اور چلا رہی ہے اس سے بھرپور استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ حکومت ایک خاص ایجنڈے کے تحت کام کر رہی ہے جس کی جھلک اس کے تعلیمی منصوبے میں بھی ملتی ہے۔ مگر جہالت اور موجودہ تعلیمی نظام کی خامیوں اور مسائل کا موازنہ کیا جائے گا تو جاہل رہنا گویا اپنی آنکھ پھوڑ لینے جیسا عمل ہوگا جس کا نقصان ظاہر و باہر ہے۔ اس لیے چاہے جو بھی مسائل ہوں اور جتنی بھی دقتیں پیش آئیں، ہمیں تعلیم کو عام کرنا ہے اور اپنی آبادی میں صد فیصد تعلیم حاصل کرنے کی جدوجہد کرنی ہے۔ اصلاح، تربیت، طاقت وقوت کے تمام سرچشمے یہیں سے پھوٹتے ہیں اور یہیں سے پھوٹیں گے۔ اس لیے یہ ہماری اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ مسلمانوں کی جو برادریاں حاشیہ پر ہیں اور ملت کی مین اسٹریم سے کٹی ہوئی ہیں ان کی سماجی، تہذیبی، دینی اور معاشی

پسماندگی کی بنیادی وجہ تعلیم سے دوری ہے۔ اگر تعلیم آئے گی تو دھیرے دھیرے ان تمام خرابیوں پر قابو پانا آسان ہوگا۔ لہٰذا تعلیم کے پھیلاؤ سے ہی ملی یکجہتی اور مساویانہ سماج کی طرف پیش قدمی ممکن ہو سکے گی۔ جہالت نے ملت کے چہرے پر جو کالک پوت دی ہے اور اس کو پوری طرح بدصورت اور قابل نفریں بنادیا ہے، تعلیم کے ذریعہ ہی ہم اس میں وہ جوہر بھر سکتے ہیں جس سے یہ ملت اپنی جوہری خصوصیات سے متصف ہوکر اپنے لیے اور پوری انسانیت کے لیے خیر کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ملت میں تعلیم عام کی جائے اور ملت کا کوئی فرد کوئی طبقہ اس سے محروم نہ رہے تو سارے امتیازات مٹ جائیں اور ملت میں اخوت و مساوات کا وہ ماحول بنے گا جو اسلام کا مطلوب ومقصود ہے اور یہ ہندوستان میں ملی بقا کی لازمی شرط ہے۔

■❖■

اکرام مسلم کی شعوری تحریک

قرآن کے بقول تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اور قرآن نے کہا کہ ہم نے آدم کی اولاد کو صاحبِ عزت بنایا ہے۔ یعنی ایک انسان ہونے کے ناطے ہر فرد عزت وتکریم کا مستحق ہے۔ قرآن کے بقول کسی کو برے القاب سے پکارنا اور کسی کا مذاق اڑانا ناپسندیدہ فعل ہے۔ حدیث میں آتا ہے ایک شخص کے برا ہونے کے لیے بس یہی کافی ہے کہ وہ اپنے بھائی کو اپنے سے حقیر سمجھے۔ کسی طرح کی قومی، خاندانی یا برادری کی بنیاد پر ایک دوسرے سے عصبیت رکھنا اور کسی کو محض عصبیت کی بنیاد پر حقیر اور چھوٹا سمجھنا یہ اخوت اسلامی کی روح کے منافی ہے اور اس طرح کی عصبیت پر اصرار حد درجہ جہالت ہے جو ایک شخص کو اسلام کے دائرے سے باہر لے جاسکتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا جو شخص عصبیت کی دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں ہے، جو عصبیت کے جذبے سے جنگ کرے، جو عصبیت پر مرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ آپ کسی ذات، برادری، خاندان اور طبقہ سے وابستہ ہیں۔ آپ خود کو کسی وجہ سے بڑا اور عزت دار مانتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر اگر آپ کسی کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں یا حقیر قرار دیتے ہیں اور اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچاتے ہیں تو یہ ایک جرم ہے، ظلم ہے، گناہ ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا ہے۔ لہٰذا پہلی صورت میں اس جاہلی تصور سے باہر آنے کی ضرورت ہے۔

اگر ہم ہندوستان کے موجودہ مسلم سماج کی کمزوریوں کا جائزہ لیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ہم اندر سے کتنے ٹوٹے اور بٹے ہوئے ہیں جس نے اس ملک میں ہماری ہوا اکھاڑ دی ہے۔ ہماری الگ الگ برادریاں ہوسکتی ہیں، ہمارے الگ الگ مسالک ہوسکتے ہیں، ان تمام اختلافات کے باوجود ہم عظیم تر مسلمان ملت کے فرد ہیں اور ہماری اجتماعی قوت اسی احساس میں پنہاں ہے، ورنہ ایک برادری یا ایک مسلک کے لوگ پوری ملت کا دسواں اور بیسواں حصہ ہوں گے۔ ظاہر سی بات ہے اتنے بڑے ملک میں اور اتنی بڑی آبادی والے ملک میں ایک چھوٹی برادری، یا ایک چھوٹے سے مسلکی دھڑے کی کیا اہمیت ہوگی اور اس کا کیا وزن ہوگا؟ لہٰذا ہماری اجتماعیت ہی ہماری اصل قوت ہے اور اس کی بنانے اور بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہر مسلمان کی عزت کریں۔ یہ اس کا دینی اور انسانی حق اور اختیار ہے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم مسلمان آبادیوں میں اکرام مسلم کی ایک شعوری تحریک برپا کریں اور ایک شخص مسلمان ہے خواہ وہ کسی طبقہ، ذات، برادری، مسلک اور جماعت سے وابستہ ہے، امیر ہے غریب ہے، پڑھا لکھا ہے یا بے پڑھا لکھا ہے، شہری ہے یا دیہاتی ہے، اعلیٰ ذات برادری کا ہے یا ادنیٰ ذات برادری سے تعلق رکھتا ہے، عورت ہے یا مرد ہے سب کے ساتھ عزت سے پیش آنا، محبت سے پیش آنا ہے اور سب کو برابر جاننا بھی ہے اور ماننا بھی ہے۔ یہ مہم جتنی تیز ہوگی ملت میں اتحاد و اتفاق اتنا مضبوط ہوگا اور ملت اندر سے مضبوط ہوکر ابھرے گی یہ انسانی حقوق کی پاسداری کا بھی تقاضہ ہے اور ملی بقا کی لازمی شرط ہے۔

ہم نے ماضی میں جو غلطیاں کیں ہیں اور اجتماعی طور پر ہم سے جو کوتاہیاں ہوئی ہیں وقت آگیا ہے کہ ہم اس کی تلافی کے لیے آگے آئیں اور زمانے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کا جذبہ پیدا کریں۔ آج کے جمہوری اور عوامی دور میں ہم نے دورِ جاہلیت کی عصبیتوں سے خود کو دور نہیں کیا تو ہم جدید جمہوری دور میں بہت پیچھے چھوٹ

جائیں گے جس کا انجام یہ ہوگا کہ اسلام اور مسلمان دشمن قوتیں ہمارے ہی افراد اور وسائل کو ہم سے توڑ کر لے جائیں گی اور انہیں ہمارے خلاف استعمال کریں گے جیسا کہ سامراجی قوتیں ماضی میں کرتی رہی تھیں۔ تو کیا ہم اپنی دین و تاریخ سے کوئی سبق سیکھنے کو تیار نہیں ہیں؟

بڑے دکھ کی بات ہے کہ نہ تو ہمارے نام نہاد اشراف نے نہ ہی علماء اور دینی اور ملی تنظیموں نے اور نہ کسی سیاسی لیڈر نے اپنی پسماندہ اور محروم آبادیوں کی شد بدھ لی اور ان کے احوال سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر سی بات ہے جب ان سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھا تو ان کے حالات کو بہتر بنانے کی طرف توجہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

یہ ایک ایسی تاریخی غلطی اور مجرمانہ حرکت ہے جس کا جتنا ماتم کیا جائے وہ کم ہے۔ مگر ماضی میں جو غلطیاں ہوگئیں اس پر کف افسوس ملنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اور نہ اسلاف پر تبرہ پڑھنے سے اس کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔ اس صورتحال کا ایک ہی جواب ہے کہ اب ہم اپنے ذہن و زبان کو بدلیں اور اپنے محاورات اور اصطلاحات میں تبدیلی لائیں اور اب تک جو کوتاہیاں اور غفلت ہوئی ہیں ان کو دور کرتے ہوئے اپنی ان آبادیوں کے قریب جائیں، ان سے رابطہ پیدا کریں اور ان سے جڑیں اور ان کو جوڑنے کی کوشش کریں۔

اگر ہم نے اپنی پسماندہ اور محروم آبادیوں کی قدر نہیں کی، ان کی ہمت افزائی نہیں کی، ان کو ملی مین اسٹریم سے نہیں جوڑا تو ہم خلق اور خدا دونوں کے مجرم ہوں گے۔ خدا کے حضور ہم بنی آدم کی بے حرمتی کے مجرم ہوں گے جو شرک کے بعد دوسرا بڑا گناہ ہے۔ اور خلق کا معاملہ ہے کہ اس جمہوری دور میں جب ہر فرد برابر ہے ہم نے اپنی عصبیتوں سے پیچھا نہیں چھڑایا تو ہماری جو بیش بہا خوابیدہ انسانی وسائل ہیں ہم ان کا فائدہ اٹھانے سے محروم رہیں گے جو ملت کے اجتماعی محرومی میں اضافہ کا سبب بنے گی۔ اور ہماری قوتیں ٹوٹ ٹوٹ کر غنیم کی فوج میں ہراول دستہ کے طور پر استعمال ہوں گی۔

اس لیے اکرامِ مسلم کی ایک شعوری تحریک وقت کی ایک ایسی ضرورت ہے جس سے کسی طور پر پہلو تہی نہیں کرنی چاہیے۔ پہلی فرصت میں ہماری جو بھی دینی ملی اور سیاسی و تہذیبی تحریکیں ہیں جو ملت میں اس وقت کسی نہ کسی درجہ میں سرگرم کار ہیں ان کو ان بستیوں اور آبادیوں تک پہنچنے کا ایک جامع منصوبہ بنانا چاہیے اور اکرام مسلم کے ذریعے ملت میں نیا شعور، نئی بیداری اور نئی اجتماعیت پیدا کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے اور ان افراد اور آبادیوں میں تعلیم، اصلاح، تربیت اور فلاح کے جامع منصوبے کے ساتھ ربط پیدا کرنا چاہیے۔ اکرامِ مسلم ایک جامع نظریہ ہے جس کو وسعت دینے کی ضرورت ہے تاکہ پوری ملت اور اس کے تمام افراد کے لیے عزت و اکرام کے دروازے کھلیں۔

بڑے دکھ اور شرم کی بات ہے کہ ایک صاحب ایمان قوم جس کو صد فیصد تعلیم یافتہ ہونا چاہیے تھا، جس کے اندر اخوت و مساوات کا عام چلن ہونا چاہیے تھا اور جو باہم سیسہ پلائی دیوار ہوتی وہ جہالت کی اندھی کھائی میں گری ہوئی ہے، اس کے اندر سماجی اونچ نیچ کا تصور پوری گہرائی تک پیوست ہو چکا ہے اور جو مسلکوں اور برادریوں میں بٹ کر بے وزن ہوگئی ہے۔ کوئی پیشہ چھوٹا اور بڑا نہیں ہوتا۔ محنت کرنا اور اپنی محنت اور فنی صلاحیت کے ذریعے اپنی روٹی روزی حاصل کرنا، یہ تو عزت اور شرف کی بات ہے۔ بھیک مانگنا اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا یہ شرم کی بات ہے۔ ہم کو محنت کی عزت کرنی چاہیے اور لوگ محنت کی عزت کریں اس کی تحریک چلانی چاہیے۔ یوروپ اور امریکہ کے لوگ اس لیے آگے ہیں کیونکہ وہ محنت کی عزت کرتے ہیں۔ آپ خود اپنے ملک میں دیکھیں مارواڑی، سندھی، پنجابی، راجستھانی، گجراتی اور مراٹھی لوگ کتنے محنتی ہوتے ہیں۔ انہیں چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں کوئی عار نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا اس بنیاد پر کسی کو چھوٹا سمجھنا صحیح نہیں ہے بلکہ یہ ذہنی دیوالیہ پن کی دلیل ہے۔

پرانے زمانے میں لوگوں کے اندر موبی لیٹی کم تھی، روزگار کے مواقع محدود تھے، لوگ مقامی آبادی میں رہتے تھے اور کسی مخصوص پیشہ اور کام سے وابستہ ہوتے تھے۔ انہیں

مزدوری کم ملتی تھی، کم آمدنی کی وجہ سے ان کے اندر غربت پائی جاتی تھی اور اس سے نکلنے کا راستہ بھی نہیں ملتا تھا۔ اس طرح پیشہ نے ذات برادری کی شکل اختیار کر لی جو نسل در نسل چلتا رہتا تھا۔ مگر جدید دور میں ہمارا پورا سماجی اور معاشی چوکھٹا تبدیل ہو چکا ہے۔ تعلیم اور نئی صنعت وحرفت نے ساری بیڑیاں توڑ دی ہیں۔ اب ایک شخص اپنے آبائی پیشے سے وابستہ رہے ضروری نہیں ہے۔ اس کے لیے زمین اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے اور آسمان اپنی بے کرانی کے ساتھ کھلا ہوا ہے۔ نہ اس کی چلت پھرت پر کوئی پابندی ہے اور نہ اس کی قوت پرواز پر کوئی قدغن۔

اس ماحول اور معاشرے میں عہد قدیم کی جاہلی تصورات کے ساتھ جینا کتنی بڑی حماقت ہے۔ اس لیے وقت آ گیا ہے کہ ماضی کے تمام تعصّبات کو طلاق مغلظہ دے کر ایک نئی سماجی تشکیل کی طرف جرأت مندانہ قدم اٹھایا جائے اور ماضی کے تمام غلط روایات اور تصورات کو بالائے طاق رکھ کر ایک نئی شروعات کی جائے۔ اس کے لیے ہمارے سماج کے نام نہاد اشراف کو بھی اپنے ذہن اور نظریات میں تبدیلی لانی ہوگی اور جو اجلاف اور ارذال ہیں ان کو بھی اپنی بند خول سے باہر آنے کی شعوری جدوجہد کرنی ہوگی۔ اکرامِ مسلم ہر دو جانب شروع کی جانے والی تحریک ہے۔

غیر مسلم معاشرہ اور مسلم معاشرے میں ایک بنیادی نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ غیر مسلم معاشرہ جتنا اپنی تہذیب و روایات سے دور ہوگا وہ اتنا ہی صلاح یافتہ اور جدید ہوتا جائے گا جبکہ مسلم معاشرہ اپنی اصل سے جتنا قریب ہوگا اتنا ہی وہ صالح، صحیح، جدید اور ترقی یافتہ ہوتا جائے گا۔ ایک شخص مسجد نبوی کے سامنے سے گزرا حضورﷺ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تشریف فرما تھے، آپ نے پوچھا یہ کون شخص ہے؟ لوگوں نے بتایا یہ اپنے قبیلے کا نہایت مال دار اور عزت دار شخص ہے، لوگ جس پر اعتبار اور اعتماد کرتے ہیں۔ وہ کسی کی ضمانت لے تو وہ قبول کی جاتی ہے۔ کہیں شادی کا پیغام دے تو اس کو مانا جائے گا۔ غرض وہ ایک معتبر اور عزت دار شخص مانا جاتا ہے۔ حضورؐ نے پوری بات سنی اور خاموش رہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک

اور شخص گزرا۔ آپ نے پوچھا یہ کون شخص ہے؟ لوگوں نے بتایا یہ ایک نہایت معمولی آدمی ہے جس کی کوئی خاص وقعت نہیں ہے۔ یہ مالی اعتبار سے بھی کمزور ہے اور سماج میں اس کا کوئی وزن نہیں ہے۔ اس کی ضمانت تسلیم نہیں کی جائے گی اور یہ اگر نکاح کا پیغام دے تو اسے بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ تب حضورؐ نے فرمایا: یہ وہ شخص ہے جب اللہ سے دعا کرے تو اللہ کو اس کی دعا رد کرنے میں شرم آئے گی۔

ہم کسی شخص کی ظاہری صورت و کیفیت دیکھ کر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے ہیں اور اس کی عزت و ذلت کا فیصلہ کردیتے ہیں جبکہ باطنی طور پر اس کا مقام بہت بلند ہوسکتا ہے۔ ہمارے لیے بہتر یہ ہے کہ ہم کسی شخص کی ظاہری صورت و کیفیت، عرفیت اور مقام دیکھے بغیر ایک انسان اور ایک مسلمان ہونے کے ناطے عزت کریں، اس سے نہ صرف ہم بہت سے گناہوں سے بچ جائیں گے بلکہ دنیوی طور پر ہماری عزت و بقا کی راہ بھی کھلے گی جو قوم خود کی عزت نہیں کرسکتی اور اپنے نہ ابنائے قوم کی عزت کا اہتمام کرسکتی ہے دنیا کی قوموں میں وہ کیسے عزت حاصل کرسکتی ہے۔ لہٰذا اکرام مسلم کی تحریک عزت دینے اور عزت لینے کی تحریک ہے۔ جس کا پہلی فرصت میں اہتمام کرنا چاہیے۔ اگر ہم شعوری طور پر اکرامِ مسلم کی تحریک برپا کریں گے تو ملت میں بہت سارے انسانی حقوق کی پامالی کا راستہ بند ہوگا اور اس تحریک کے نتیجے میں ملت اندر سے مضبوط ہوکر ابھرے گی۔ اس لیے ہماری تمام دانشوروں، علماء اور بالخصوص نوجوانوں سے اپیل ہے کہ اپنے محلّہ میں اور اپنی آبادیوں میں اکرامِ ملت کی تحریک کا جھنڈا لے کر نکلیں اور ملت کے تمام طبقات میں باہمی احترام اور محبت کی فضا بنانے کا اہتمام کریں، یہ اس وقت کی ایسی ضرورت ہے جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

بدلتے وقت کے ساتھ نوشتہ دیوار پڑھنا اور اپنے اندر ضروری تبدیلی پیدا کرنا کسی بھی زندہ اور سمجھ دار قوم کا وطیرہ ہوتا ہے۔ بھارت کی جو اکثریتی آبادی ہے وہ پچھلے ہزاروں سال سے سورن اور اورن، چھوت اور اچھوت میں بٹی ہوئی تھی، مگر انھوں نے اپنی

کمزوریوں کو پہچانا اور اپنی صفوں میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کی مہم چلائی اور سوشل انجینئرنگ کے ذریعہ اپنے اتحاد و جمعیت کو مستحکم کرنے کا اہتمام کیا۔ اس وقت ہندوؤں میں سنگھ پریوار کے ذریعہ نشاۃ ثانیہ کی جو تحریک چلائی جارہی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ فورورڈ، بیک وارڈ، پچھڑا، دلت، آدی باسی سب ایک پلیٹ فارم پر آگئے ہیں اور انھوں نے اس کے بل پر متعدد ریاستوں میں اور مرکز میں پوری اکثریت کی مضبوط سرکار بنانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے اور وہ اس اتحاد و جمعیت کو مسلسل استحکام دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ سنگھ پریوار کا یہ تجربہ ہمارے لیے چشم کشا ہے جس نے ہمارے سامنے ایک بڑا چیلنج لاکھڑا کیا ہے۔ اس صورتحال کے تدارک کے لیے کوئی بھی منفی اقدامات دوہرے نقصان کا باعث ہوگی۔ اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم اپنی صفوں میں بھی ایسی سوشل انجینئرنگ کریں کہ تمام ذاتوں اور برادریوں کے درمیان ایک ایسا پل تعمیر کیا جاسکے جس کے ذریعہ دونوں طرف باہمی تعلقات کی استواری کی راہ ہموار ہو۔ میرے خیال میں اکرام مسلم ایک نظری رویہ ہی نہیں ہے بلکہ فکر ونظر اور اپنے رویہ اور عمل میں مثبت تبدیلی کا مظہر ہے جس پر فی الفور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

■❖■

پسماندہ طبقات کی دلجوئی اور ہمت افزائی

اور ان کے حقیقی مسائل کو حل کرنے کی ایماندارانہ کوشش

یہ ایک فطری اور قدرتی بات ہے کہ جو لوگ باشعور اور صاحب وسائل ہیں ان کی ذمہ داری زیادہ ہے۔ لہٰذا انھیں ہی آگے بڑھ کر اپنی اجتماعی اور ملی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہوگی۔ ملت کا وہ طبقہ جو ملی سواد اعظم سے الگ ہے اور جو ملی مین اسٹریم سے کٹا ہوا ہے، اس کو پوری ملت سے جوڑنا اور اس کے مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ دینا اسی طبقہ کی ذمہ داری ہوگی۔

ملت کے پسماندہ طبقات میں عمومی طور پر ملت کے باشعور طبقات سے جو جھجھک اور شکایت ہے اس کی وجہ سے دونوں جانب ربط وتعلق میں کمی پائی جاتی ہے اگر ہم پہل کریں اور ان طبقات تک پہنچنے کی کوشش کریں تو جو اجنبیت اور شکایت ہے اس کو دور کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ وقت مسابقت کا نہیں معاونت کا ہے۔ اپنے حصہ کی روٹی اپنے بھائیوں میں تقسیم کرکے نہ صرف ہم ان کا گڈول حاصل کرسکتے ہیں بلکہ اتحاد ومعاونت کی نئی راہ بھی ہموار کرسکتے ہیں۔

موجودہ وقت میں تعلیم کے پھیلاؤ کی وجہ سے ہر طبقے اور برادری میں کچھ لوگ پڑھے لکھے مل جائیں گے۔ ان افراد سے روابط پیدا کرکے ان کی مدد سے ملت کی مختلف

برادریوں اور طبقات کے درمیان پل تعمیر کیا جاسکتا ہے اور اس طرح اصلاح و بیداری کے ایک نئے دور کی شروعات ہوسکتی ہے۔

پسماندہ برادریوں کے باب میں کئی مصلحین اور جماعتوں نے قابل ذکر کام کیا ہے ان تجربات کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو کئی طرح کی عملی راہوں کی نشاندہی ہوسکتی ہے، جس کو اپنا کر ہم ایک نئے سلسلے کا آغاز کر سکتے ہیں۔ پہلی ضرورت اس بات کا صحیح احساس و ادراک ہے اور دوسری ملی اور انسانی ہمدردی کا سچا جذبہ۔ اگر یہ دونوں چیزیں موجود ہوں تو یہ کام مشکل نہیں ہوگا۔

یہ ایک اچھی بات ہے کہ پسماندہ برادریوں میں کچھ بیداری نظر آرہی ہے اور ان کے اندر برادری کی سطح پر کئی تنظیمیں ابھر کر سامنے آرہی ہیں اور نئی نئی قیادت پیدا ہورہی ہے۔ ہمیں ذات برادری کی بنیاد پر بنی تنظیموں اور جماعتوں پر بے جا تنقید وتبصرہ کرنے کی بجائے ان کی ہمت افزائی کرنی چاہیے اور ان کے ساتھ معاونت کرنا چاہیے نیز ان کو اپنے نیک مشورے سے نوازنا چاہیے۔ اگر ہم ان کو الگ تھلگ چھوڑ دیں گے یا ان کو لعنت ملامت کریں گے تو ان کی جمعیت اور جماعت غلط رخ پر مڑسکتی ہے جس کا ملت کو نقصان ہوگا۔ لہٰذا ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہم اپنا دست تعاون دراز کریں اور علمی اور عملی طور پر ان کے ساتھ تعاون کریں۔

ہم نے لمبے عرصے تک اس طبقے کو نظر انداز کیا ہے، اور ہمارے لوگوں نے ان کا استحصال بھی کیا ہے۔ اس طبقہ میں جو تلخی اور شکایت پائی جاتی ہے اس کے ازالہ کی یہی صورت ہے کہ ان کے پاس جایا جائے، ان سے ہمدردی کی جائے، ان کی مدد کی جائے اور ان کو اوپر اٹھانے کا اہتمام کیا جائے۔ یہ وقت سیاست اور مفاد کی عینک سے چیزوں کو دیکھنے کا نہیں ہے بلکہ ملت اور انسانیت کے نقطۂ نظر سے اس کو ملت کا اجتماعی مسئلہ مانتے ہوئے اس پر توجہ دینے کا ہے۔

ہماری پسماندہ برادریاں جہالت، غربت اور تہذیبی پسماندگی کی وجہ سے جس

دینی ثقافتی پسماندگی میں پڑی ہوئی ہیں اور جس طرح کفر واسلام کی سرحد پر کھڑی ہیں اگر ان کو وقت رہتے وہاں سے نہیں نکالا گیا تو یہ ہمارے لیے بڑے نقصان کا سودا ہوگا۔ اس وقت اسلام دشمن اور مسلمان دشمن قوتیں جس طرح للچائی نظر سے ان طبقات کو دیکھ رہی ہیں وہ ہم سبھوں کے لیے لمحہ فکریہ ہونا چاہیے۔ اس لیے اپنی پسماندہ برادریوں کو نظر انداز کرنا جان بوجھ کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے جیسا عمل ہوگا۔ میں نہیں سمجھتا کوئی آدمی بقید ہوش وحواس ایسی حرکت کرسکتا ہے۔ یہ ہمارے لیے تاریخی اور فیصلہ کن لمحہ ہے کہ کب ہم اپنی ماضی کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ کرتے ہوئے ایک نئی پہل کا آغاز کرتے ہیں۔

حتمی نہیں آخری بات یہ ہے کہ ہماری جامعات بالخصوص علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد اور مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کو اور ان جامعات میں جو شعبہ سماجیات اور شعبہ دینیات ہے اس کو خصوصی طور پر مسلمانوں کے پسماندہ طبقات میں خاص طور سے جن برادریوں کا شمار طبقۂ ارذال میں ہوتا ہے ان کے احوال وکوائف کے مطالعے کے لیے ٹاسک فورس بنانا چاہیے اور پروجیکٹ بنا کر ان کے بارے میں زمینی اور حقیقی واقفیت حاصل کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ان طبقات سے کیسے رابطہ پیدا کیا جاسکتا ہے اور کیسے ان کو ملی مین اسٹریم میں لایا جاسکتا ہے اس کے سلسلے میں واضح نقشہ کار بنا کر جدوجہد کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے طبقہ ارذال ہماری ملت کا 20% ہے۔ اگر ہم ان کو نظر انداز کرکے آگے بڑھنے کی کوئی بات کریں گے تو ہم کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں۔ اس لیے پوری ملت کو ساتھ لے کر چلنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔ طبقۂ اجلاف اور طبقۂ ارذال ملا کر ہماری اکثریت بناتی ہیں۔ اس لیے ان سے ناواقف ہونا اور ان کو ناواقف رکھنا خودکشی ہوگی۔ لہٰذا وقت آ گیا ہے کہ تمام تعصّبات کو بالائے طاق رکھ کر ہم ان کے قریب جائیں، ان کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کریں، ان کو جوڑنے کا جامع منصوبہ بنائیں اور ان کی فلاح کے لیے سنجیدگی سے کوشش کریں۔ یہ وہ تاریخ ساز قدم ہوگا جس سے ملی بقا کی راہ ہموار ہوگی۔ اس لیے وقت ضائع کیے بغیر علمی اور عملی ہر دو طریقے

سے کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ترجیحی بنیاد پر جدوجہد وقت اور حالات کی ایسی مانگ ہے جس کو کسی طرح نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اجلاف اور ارذال کا طبقہ اتنا بڑا ہے اور اس کے مسائل اتنے پیچیدہ، ہمہ گیر اور مستقل نوعیت کے ہیں کہ ان کے مطالعے کے لیے ہماری جامعات کو مستقل شعبہ جامعات اور چیپٹر قائم کرنا چاہیے تاکہ ان کے ہر پہلو کا مطالعہ کیا جاسکے اور ان کے سلسلے میں جامع منصوبہ تشکیل دیا جائے۔ پسماندہ برادریوں کے مطالعے پر اس وقت خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ لہٰذا یو جی سی اور دیگر اعلیٰ تعلیم کے اداروں کے اشتراک سے ایسے مطالعات کا اہتمام وقت کی ضرورت ہے۔

ہمارے یہاں جو بھی دینی ملی تنظیمیں اور جماعتیں ہیں انہیں بھی اس جانب توجہ دینی چاہیے اور اپنے بجٹ کا ایک حصہ لازمی طور پر ان طبقات کے مطالعہ اور فلاح پر خرچ کرنا چاہیے۔ اس طرح کی پہل سے ان طبقات میں بھی بیداری آئے گی اور وہ بھی ملت سے جڑنے کی کوشش کریں گے جو ان کی صلاح و فلاح میں بہتری کا ذریعہ بنے گی۔ اس وقت پوری ملت کو جوڑنا اور پوری ملت سے جڑ کر رہنا ایک ایسی ملی اور انسانی ضرورت ہے جس سے کوئی سمجھ دار آدمی انکار نہیں کرسکتا ہے۔

■❖■

اپنے اداروں کو جمہوری بناتے ہوئے

تمام طبقات کی نمائندگی کو مستلزم کرنا وقت کی ضرورت ہے

ہم لوگ ایک جمہوری ملک میں اور ایک جمہور شناس دور میں رہ رہے ہیں جہاں ہر فرد گروہ اور طبقہ تمام ملکی، ملی اداروں میں نمائندگی چاہتا ہے تاکہ اس کی بھی آواز سنی جائے اور اس کے مسائل پر بھی توجہ دیا جائے۔

ہمارے پسماندہ طبقات بالخصوص اجلاف اور ارذال میں اس وقت جو لوگ ابھر کر آرہے ہیں اور انھوں نے اپنی ذات برادری کی تنظیمیں بنا رکھی ہیں۔ ان کو یہ شکایت ہے کہ ملت کے جو ادارے ہیں، تنظیمیں اور جماعتیں ہیں ان میں ان کی نمائندگی نہیں ہوتی ہے اور انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بعض تاریخی اسباب کی وجہ سے ماضی میں ان کی شمولیت کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔ مگر اب بھی اس غلطی کو دہرایا جائے اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے وقت آگیا ہے کہ ملت کے جو بھی اجتماعی ادارے ہیں چاہے وہ مقامی سطح پر ہوں، یا ریاستی سطح پر یا پھر مرکزی سطح پر، ان کو شعوری طور پر اپنے اداروں میں ملت کے تمام گروہوں اور طبقات کی خصوصی نمائندگی کا اہتمام کرنا چاہیے اور خواتین سمیت اجلاف اور ارذال کو نمائندگی دینا چاہیے۔ اس کے لیے اپنے تنظیمی ڈھانچے میں ضروری تبدیلی لاکر اور اپنے دستور میں ضروری ترمیم کرکے اس بات کو یقینی بنانا وقت کی ایسی مانگ ہے جس کو کسی طرح

نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا یہ وہ ضروری اصلاح ہے جس پر ہماری تمام تنظیموں، جماعتوں اور اداروں کو فی الفور توجہ دینی چاہیے۔ اس طرح ملت میں اندرونی طور پر جمہوری عمل کی شروعات ہوگی اور وقت کے ساتھ تمام طبقات کی شراکت بڑھے گی جو ملت کو اندر سے جوڑنے اور مضبوط کرنے میں مددگار ہوگی۔

■❖■

سیاسی شعور کی بیداری

ہمارے خارجی اور داخلی مسائل ایک جیسے ہیں۔ اس وقت پوری ملت وجودی بحران سے دوچار ہے۔ ہمارا اجلاف اور ارذال طبقہ اس وقت اسلام دشمن قوتوں کے نشانے پر ہے۔ لہٰذا ملت میں تعلیم کا پھیلاؤ، شعور کی بیداری، سماجی اصلاح، اتحاد و یگانگت کی کوشش یہ کچھ ایسی چیزیں ہیں جن کو ترجیحی بنیاد پر کرنے کی ضرورت ہے۔

اس وقت ہمارا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سیاسی شعور کی بڑی کمی ہے اور وہ دانائی اور حکمت سے بہت دور ہیں۔ کوئی بات بولنے اور کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ سوچنا ضروری ہے کہ اس کا کیا ردِعمل ہوگا اور ملت کو دیر یا سویر کیا فائدہ یا نقصان ہوسکتا ہے۔ ہمیں جذباتیت اور ردِعمل کی سیاست سے بچتے ہوئے زمینی مسائل میں ان کو سامنے رکھ کر سیاسی جدوجہد کرنی ہوگی۔

سیاست ایسی چیز ہے جس سے الگ تھلگ رہنا نقصاندہ ہوگا۔ مگر بے شعوری کے ساتھ سیاست کرنا فائدہ مند نہیں ہوگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ سیاست کی سمجھ پیدا کی جائے اور لوگوں میں یہ سمجھ پیدا کرائی جائے تو حالات کو سمجھنے اور اس کے مطابق اقدام کرنے میں مدد ملے گی۔ اس لیے سیاست کا پہلا سبق یہ ہے کہ ملت کے تمام طبقات میں ربط و تعلق استوار کیا جائے اور دھیرے دھیرے ان کی ایسی تربیت کی جائے تاکہ وہ حالات اور

زمانے کو سمجھ کر اقدام کرنے کی اہلیت پیدا کرسکیں۔ اس کے لیے ملت کے ہر گروہ سے قریبی رابطہ استوار کرکے ان کے اندر جو پڑھے لکھے اور باشعور لوگ ہیں ان کو جوڑا جائے، ان کو اوپر لایا جائے اور ان کی ہمت افزائی کی جائے۔ اس طرح یہ چھوٹی چھوٹی قیادت ایک دن بڑی قیادت میں تبدیل ہوگی اور ملت کے ترقی اور استحکام کی راہ ہموار ہوگی۔ اگر ملت کے تمام طبقات اور افراد کو شامل کرکے سیاسی شعور کی بیداری کی کوشش کی جائے گی تو اس طرح سیاسی سمجھ زمینی حقیقتوں کے زیادہ قریب ہوگی، زیادہ ایشو بیسڈ ہوگی اور ریکشنری ہونے سے بچے گی۔

ہم نے اوپر اجلاف اور ارذال طبقات کے بارے میں چند امور کی نشاندہی کی ہے، جو ہماری اجتماعی فکر کا حصہ ہے۔اگر ان امور پر سنجیدگی سے کام کیا جائے تو ہمارے محروم طبقات کی ملت کی اشراف سے جو شکایت ہے وہ دور ہوگی۔ ان تمام طبقات میں اصلاح وتعمیر کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا اور ملت میں یکجہتی اور اتحاد کی فضا ہموار ہوگی جس سے مجموعی طور پر ملت مضبوط ہوکر ابھرے گی اور اس کے انسانی حقوق کی پامالی رو کے گی اور ہم ایک نئی نشاۃ ثانیہ سے ہم کنار ہوسکیں گے۔

ہندوستان میں ہم جب کبھی ہندو مسلم تعلقات پر گفتگو کرتے ہیں تو بعض تاریخی وجوہات پر ہم اس کو صرف سیاسی اور مذہبی عینک سے دیکھتے ہیں۔ دونوں قوموں کے درمیان ایسی شدید غلط فہمی اور بدگمانی پائی جاتی ہے کہ بالعموم دونوں ایک دوسرے کو شک اور شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جب کہ ایک دوسری حقیقت یہ ہے کہ مذہبی اور سیاسی رشتہ سے الگ ایک انسانی، سماجی اور ثقافتی رشتہ بھی ہے جس پر توجہ دینے اور جس کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں مسلمان کم و بیش چودہ صدیوں سے رہ رہے ہیں۔ اس درمیان میں مسلمان بادشاہوں اور ہندو راجاؤں کے درمیان بہت سی جنگیں بھی ہوئیں۔ ان جنگوں میں مسلمان سپاہی دونوں طرف سے لڑتے رہے ہیں یہ جنگیں نہ جہاد تھیں اور نہ دھرم

یودھیہ تھیں جبکہ دونوں طرف کے راجاؤں نے اپنی مذہبی اور ثقافتی علامات کا کھل کر استعمال کیا۔ راجہ کی ہار جیت سے پرجا کے سماجی اور ثقافتی ڈھانچہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ ہاں جو لوگ پاور اور پاور سینٹر سے قریب رہتے تھے ان کے حالات پر ضرور اس کا اثر پڑتا تھا اور یہ صورتحال آج بھی ہے۔ جب ایک پارٹی جیتتی ہے یا ہارتی ہے تو اس کے لیڈر، کیڈر اور فولوئر پر اس کا اچھا یا برا اثر پڑتا ہے۔ اگلے زمانے میں اقتدار کی لڑائی چند راج گھرانوں تک محدود ہوتی تھی۔ عوام اس جنگ میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا عوام سیاسی عمل سے الگ تھلگ رہتے تھے۔

جب ملک میں انگریزی اقتدا قائم ہوگیا اور آزادی کی جدوجہد شروع ہوئی، اس وقت عالمی سیاست اور معیشت میں جو تبدیلی رونما ہوئی اس نے عوام کی شرکت اور شمولیت کو اہم بنادیا۔ یوروپ اور امریکہ میں جس نئے جمہوری اور عوامی دور کا آغاز ہوا اس کے اثرات ہندوستان پر بھی پڑے اور یہاں کے جدید تعلیم یافتہ اور روشن دماغ قائدین نے عوامی قوت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں تبدیلیٔ اقتدار کے لیے پرامن عوامی جدوجہد کا حصہ بنانے پر زور دیا۔ یہیں سے گنتی کی سیاست شروع ہوئی۔ جس نے ایک نئی سیاسی اور مذہبی کشمکش کا شاہ دروازہ کھول دیا۔ بھارت کا سماج یوروپ کے سماج سے بالکلیہ مختلف ہے۔ یوروپ کے ملکوں میں عموماً ایک مذہب، ایک نسل، ایک رنگ اور ایک زبان کے لوگ رہتے ہیں جبکہ بھارت کی سماجی بناوٹ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ملک کے ہر خطہ اور صوبے میں بلکہ ہر شہر، گاؤں اور قصبے میں کئی مذاہب اور ذات برادری، نسل اور زبان کے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کے درمیان جب گنتی کی بنیاد پر سیاست ہوگی تو ایمانداری اور انصاف کے ساتھ حقوق و اختیار کی کشمکش لازمی ہے اور وہ ہوئی۔ ملک کی تقسیم ہماری اجتماعی سیاسی ناکامی کا مظہر ہے۔ مگر ملک کی تقسیم سے صرف علاقے بٹے ہیں، سماج نہیں بٹا ہے۔ کیونکہ علاقے بانٹنے سے سماج نہیں بٹے گا۔ بھارت میں ہندو اور مسلمان گوندھے ہوئے آٹے میں نمک کی طرح ہیں جن کو کسی سیاسی تدبیر سے الگ نہیں کیا جاسکتا

ہے۔ اس لیے مذہب اور عقیدہ الگ ہونے کے باوجود دونوں قوموں کی اصل اور نسل ایک ہے۔ اس لیے ان کو الگ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی اور اکیسویں صدی کے آغاز سے ملک میں جارح ہندو قوم پرستی نے ایک نئی اور خطرناک سیاسی اور مذہبی کشمکش شروع کردی ہے جس نے بھارتی سماج کو بانٹ کر پرولائز کردیا ہے اور مسلمانوں سے نفرت اور دشمنی کا ایک نیا ماحول بن گیا ہے۔ یہ صورتحال ملک کی سیکولر اور لبرل لابی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لیے بھی ایک بڑا چیلنج ہے۔ ظاہر ہے فرقہ پرستی کا جواب فرقہ پرستی نہیں ہے۔ اس سے فائدہ نہیں نقصان ہوگا۔ فرقہ پرستی کا مقابلہ گرچہ یہ دیرطلب صبر آزما اور مشکل ہے، انسانیت نوازی سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ ہم کو سیاسی اور محدود مذہبی حد بندیوں سے اوپر اٹھ کر عام انسانی رشتے اور رابطے کو مضبوط کرنا ہوگا اور اس کے لیے ایک نئے انداز سے پہل کرنی ہوگی۔

پچھلے ایک سو سال سے جارح ہندو فرقہ پرست طاقتوں نے جس منظّم انداز میں ملک میں فرقہ پرستی کے زہر کو پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ اب اس کے اثرات پوری طرح نمایاں دیکھنے کو مل رہے ہیں، اور کم وبیش پچیس سے تیس فیصد لوگ پوری طرح اس رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔ متعدد ریاستوں اور مرکز میں اس گروہ کی واضح اکثریت کی سرکار بن چکی ہے اور وہ پوری ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ اپنے تمام کھلے اور چھپے ایجنڈے کو نافذ کرنے میں لگے ہیں جس نے ملک کی ہوا فضا کو پوری طرح مسموم بنادیا ہے اور یہاں کی اقلیتیں بالخصوص مسلمان خاصے پریشان ہیں اور اندیشوں میں مبتلا ہیں۔ اس صورت میں ہندوستانی سماج سے الگ تھلگ ہوکر اپنے معاملات کو طے کرنا میری رائے میں نہ صرف مسئلہ کا حل نہیں ہے بلکہ یہ خطرناک بھی ہے۔ ہمیں اس معاملے میں صبر وحکمت کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا ہوگا جس سے ایک طرف ہماری شناخت بھی باقی رہے اور دوسری طرف ملک میں خیرسگالی، رواداری اور بھائی چارہ کا ماحول بھی بنا رہے۔

اگر قرآن و سنت سے رجوع کیا جائے تو موجودہ حالات میں اپنا طرز عمل متعین کرنے میں کئی رہنما اصول سامنے آتے ہیں مثلاً حلف الفضول، صلح حدیبیہ، میثاق مدینہ اور برادرانِ یوسف کے ساتھ حضرت یوسف کا برتاؤ وغیرہ سے واضح رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔نفرت کا جواب نفرت، تشدد کا جواب تشدد اس مسئلہ کا قطعی حل نہیں ہے، لامحالہ ہمیں صلح جوئی اور پرامن بقائے باہم کا راستہ ہی تلاش کرنا ہوگا اور اپنے جذبات نفس اور زبان پر قابو رکھتے ہوئے وہ طرزِ عمل اختیار کرنا ہوگا جس سے موجودہ دوری اور بدگمانی کم ہو اور خیرسگالی کا ایک ماحول بنے تا کہ تمام لوگوں کے انسانی اور بنیادی حقوق کا تحفظ ہوسکے اور کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔موجودہ حالات میں یہ ایک مشکل کام نظر آتا ہے۔مگر اس جانب جدوجہد کرتا ہمارا انسانی اور ایمانی فرض ہے جس سے ہم گریز نہیں کرسکتے۔ہمیں اپنے حقوق کی پروا کیے بغیر دوسروں کے حقوق کی پاسداری کرنی ہوگی۔ اس باب میں حضورﷺ کے دو فرمان ہمارا رہنما اصول ہونے چاہئیں:

(1) جو ہم سے کٹے ہم اس سے جڑیں۔

(2) جو ہمارا حق نہ دے ہم اس کو اس کا حق دیں۔

حضورﷺ نے فرمایا دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے ہمیشہ اوپر ہوتا ہے اور آپ نے ہدایت کی کہ تم دینے والے ہاتھ بنو۔قرآن کہتا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو خواہ کم ہو یا زیادہ۔ اس صورت میں ہمیں ایک بار اپنے اندرونی حالات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور پھر ایک واضح نقشہ کار کے ساتھ اپنے وسیع تر سماج سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں سخت مراحل سے گزرنا ہوگا اور اپنے اور غیروں کی بہت سی سخت اور ناگوار باتوں کو سننا اور برداشت کرنا ہوگا۔ اس ماحول میں انسانیت نوازی کی باتیں کرنا ایک دیوانگی سے کم نہیں ہے مگر یہ دیوانگی ہی فرزانگی ہے جس سے کوئی مفر نہیں ہے۔

بھارت کا غیر مسلم سماج بالخصوص ہندو سماج اونچ نیچ اور ذات پات کی جکڑ بندیوں

میں گرفتار ہے۔ بعض لوگ سیاسی مقاصد کے تحت بیک وارڈ، فوروارڈ، ہریجن اور برہمن میں امتیاز پیدا کر کے ایک الگ سیاسی دھڑے بندی کی بات کرتے ہیں۔ اس طرح کا اتحاد کتنا ممکن اور مفید ہوگا میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میری رائے میں ذات پات اور اونچ نیچ کا مسئلہ ہندو سماج کا اندرونی مسئلہ ہے، اس تضاد و تفاوت سے ہم کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ جب پچھلے ہزار سال میں ایسی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی ہے تو اب جبکہ ہندو سماج کا پوری طرح سنسکرتائزیشن ہو چکا ہے بالخصوص بیک وارڈ اور دلت ہندو رنگ میں جس طرح رنگ گئے ہیں، اس طرح کی کوشش کا کامیاب ہونا قریب قریب ناممکن ہے۔ اس لیے ہمیں سیاسی مصلحتوں سے اوپر اٹھ کر انسانیت نوازی کے نقطہ نظر سے اس پورے مسئلے پر غور کرنا چاہیے اور اپنے قلب و ذہن اور دست و بازو کو وسیع کر کے پورے ملکی سماج کی بہتری اور خیرخواہی کی کوشش کرنی چاہیے اور ان کے انسان حقوق کی پاسداری اور تحفظ کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اس کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہندوستان کا مسلم سماج خود کو مائنوریٹی سینڈروم سے باہر نکالے اور اپنے خیر امت ہونے کی حیثیت کا ادراک کرے۔ مسلمان By Definition دنیا والوں کی بھلائی کے لیے اٹھائے گئے ہیں۔ پرواپکار ان کی اصلی پہچان ہے۔ یہ اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کی بھلائی کے لیے جیتے ہیں۔ مسلمان چونکہ اپنی اصل حیثیت اور پہچان سے ناواقف ہیں اس لیے تعداد کی کمی بیشی کے ترازو پر تول کر خود کو چھوٹا اور کمزور سمجھ بیٹھے ہیں اور دوسروں کے رحم و کرم پر جینے کو مجبور ہیں۔ ہم ملک کی جو سیاسی سچائیاں ہیں اس سے پہلو تہی نہیں کر رہے ہیں اور جو واقعی خطرات میں اس سے آنکھیں نہیں چرا رہے ہیں، لیکن ان تمام خطرانگیزیوں کے باوجود جو ہماری حیثیت ہے اس سے متعارف کرا رہے ہیں اور اس حیثیت کے نقطۂ نظر سے وسیع تر انسانیت کے لیے جو ہمارا طرز فکر اور طرزِ عمل ہونا چاہیے اس جانب توجہ دلا رہے ہیں۔

میری رائے میں وسیع تر انسانیت اور وسیع تر سماج سے ربط و تعلق کے باب میں

مندرجہ ذیل رہنما اصول کے تحت انسانی حقوق کی پاسداری اور حفاظت کی جدوجہد کرنی چاہیے۔

(i)احترامِ آدمیت

اس سلسلے میں پہلا رہنما اصول یہ ہے کہ اللہ نے تمام ابنائے آدم کو تکریم بخشی ہے۔ لہٰذا ہر انسان چاہے وہ برہمن ہو یا ہریجن انسان ہونے کے ناطے یکساں احترام اور تکریم کا مستحق ہے۔ ہم کسی نسلی اور لونی تفاخر کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہر انسان کی حیثیت عرفی کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو محترم تصور کرتے ہیں۔ اس اصول کے تحت نہ تو کسی کی حیثیت گھٹانا مقصود ہے اور نہ کسی کی تحقیر کرنی ہے بلکہ سبھوں کو مساوات کے مسطح میدان میں کھڑا کرنا ہے، جہاں ساری اونچ نیچ ختم ہوجاتی ہے۔ اس اصول سے بنیادی انسانی حقوق کی بحالی کی پہلی شرط پوری ہوجاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی جانب سے ہر انسان چاہے وہ فورورڈ ہو یا بیک وارڈ، یا پھر دلت ہو یا آدی باسی تکریم آدمیت کے اصول کے تحت عزت و احترام سے پیش آنا ہے۔ اس کے قریب جانا ہے، اس کو قریب لانا ہے۔ اس کی بعض باتیں، بعض عادتیں اور بعض رویہ ناگوار خاطر ہوسکتی ہیں، غربت، جہالت اور بعض غلط سماجی رسوم اور رواج کی وجہ سے طبیعت میں بدمزگی کا پیدا ہونا فطری ہے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس کے آدمی ہونے کی حیثیت قابل احترام ہے۔ ہمیں ان کے انسانی حقوق کی پامالی کو روکنا ہے اور دوسرے ان کے انسانی حقوق کی بحالی کی جدوجہد کرنی ہے۔ ہمیں صرف اپنی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی فکر کرنی ہے اور سب کے لیے سرگرم عمل ہونا ہے اس کا طریقہ کیا ہوگا یہ سوچنے اور غور کرنے کی چیز ہے جس کی پہلی شرط دل سے اس طرح کے کام کی آمادگی ہے۔

(ii) انصاف کی علم برداری

اس سلسلے کا دوسرا رہنما اصول انصاف کی علم برداری ہے اپنے دل کو ہر طرح کے قومی اور نسلی تعصب سے پاک کرکے انصاف کا علم بردار بننا ہے اس معاملے میں کسی قوم کی

دشمنی اور دوستی مانع نہیں ہونی چاہیے۔ظلم جہاں بھی ہو، جس شکل میں ہو اور جس کے ساتھ ہو ہم کو مظلوم کی حمایت میں کھڑا ہونا ہے اور اس کے خلاف آواز بلند کرنی ہے۔ ہماری جتنی قوت و طاقت ہے اس کے بقدر مزاحمت کرنی ہے تا کہ ظلم کا استیصال ہو سکے اور مظلوم کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ یہ کام فرد کی حیثیت پر بھی کیا جانا چاہیے اور گروہی سطح پر بھی ہونا چاہیے۔ مقامی سطح پر بھی ہونا چاہیے اور ملکی سطح پر بھی ہونا چاہیے۔ ہماری یہ پہچان ہونی چاہیے کہ یہ انصاف پرور لوگ ہیں اور ایسی قوتو ں کے معاون ہیں جو انصاف کے لیے کوشاں ہیں اور ان قوتوں کے مخالف ہیں جو ظلم پر آمادہ ہیں۔ اس کے لیے لازم ہے کہ ہماری شبیہ و شناخت درست ہونی چاہیے۔ حدیث کی رو سے مومن و مسلم وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے سب محفوظ رہیں۔ ہماری پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی ہیئت اس حدیث کے مطابق بنی چاہیے اور جہاں ہم اچھی تعداد میں ہیں وہاں سماجی طور پر ہر طبقہ کے لوگوں کے ساتھ ہمارے تعلقات شرافت، انسانیت اور انصاف کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے۔ جب تک ہماری شبیہ اور شناخت درست نہیں ہوتی ہم وسیع تر معاشرے میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکتے ہیں لہٰذا ہمیں اس پہلو پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

(iii) بے لوث خدمت

اس سلسلے کا تیسرا رہنما اصول بے لوث خدمت ہے۔ بے لوث خدمت کا مطلب بغیر کسی اجر و امید کے محض رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کے حصول کی نیت سے خدمت کرنا۔ قرآن پاک میں نبیوں کی زبانی مخاطب قوم سے کہا گیا کہ ہم تم سے کسی اجر کے خواہاں نہیں ہیں، ہمارا اجر ہمارے رب کے پاس ہے۔ لہٰذا بے لوث اور بے غرض مقصد کے پیچھے ہمارا کوئی سیاسی اور قومی مفاد نہیں ہے بلکہ اپنی خدمت کے ذریعہ لوگوں کے انسانی حقوق کی پامالی کو دور کرنا اور اس کی بحالی میں مدد کرنا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا **خیر الناس من ینفع الناس** یعنی انسانوں میں بہتر وہ ہے جو انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کرتا ہے۔ انسانی حقوق کی پامالی دو طرح سے ہوتی ہے۔ ایک لوگوں سے بے اعتنائی برتنا اور دوسرے

ان کی مدد کے لیے آگے نہ آنا۔ اگر ہم بلا لحاظ مذہب وملت ایک دوسرے کے مددگار ہوں تو اس سے انسانی حقوق کی بحالی میں مدد ملے گی۔

(iv) عام انسانی سماج سے وسیع تر رابطہ

ہندوستان ایک کثیر نسلی، لسانی، تہذیبی اور مذہبی ملک ہے جہاں مختلف مذاہب اور نسل کے لوگ ایک مشترک سماج میں رہتے ہیں۔ جن کے درمیان مختلف امور میں باہم ربط وتعلق بھی ہے۔ اس کے باوجود مختلف مذہبی اور سماجی گروہ جذباتی طور پر ایک دوسرے سے جدا الگ الگ جزیروں میں رہتے ہیں جن کے درمیان رابطے کا فقدان ہے۔ لہٰذا جب کسی سماجی گروہ کے ساتھ کوئی زیادتی ہوتی ہے تو ہم اسے اس سماج کا اندرونی معاملہ مان کر نظر انداز کردیتے ہیں اور اسی طرح ہر کوئی صرف اپنا درد محسوس کرتا ہے دوسروں کے درد و رنج سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی جبکہ ایک ملک اور ایک سماج میں رہنے کی وجہ سے ان کے دکھ درد کو بھی اسی شدت سے محسوس کرنا چاہیے جس شدت سے ہم اپنا درد محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح اگر ہم اپنے وسیع تر سماج سے جڑنے کی شعوری کوشش کریں تو نہ صرف ہمارے آپسی رشتے بہتر ہوں گے بلکہ انسانی حقوق کی بحالی میں بھی مدد ملے گی۔

میرے خیال میں یہ چند رہنما اصول ہیں جن کو اگر ہم اپنے قومی اور ملی ایجنڈے کا حصہ بنائیں تو اس سے ملک میں انسانی حقوق کی بحالی میں مثبت اثرات پڑیں گے اور ملک کی ہوا فضا بہتر ہوگی اس کے لیے ہمیں بندخول سے باہر نکلنا ہوگا اور اسلام کے آفاقی تصور کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر ملک میں اپنا مثبت کردار ادا کرنے کے لیے آگے آنا ہوگا۔ موجودہ حالات میں اس طرح کا نقطۂ نظر اختیار کرنا بڑے دل گردے اور اولوالعزمی کا کام ہے جس کے لیے ہمیں خود کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک میں غریب اور پسماندہ عوام بالخصوص دلت اور آدی باسی، خواتین اور بچوں کے بے شمار انسانی حقوق پامال کیے جارہے ہیں۔ ملک کی اقلیتیں بالخصوص مسلمان اقلیت طرح طرح کے مظالم کا شکار بنائے جارہے ہیں۔ لہٰذا ان سب کے خلاف صف آرا

ہونے اور مشترکہ جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔اس کی ابتدا ہم خود بھی کر سکتے ہیں اور جو معروف افراد اور ادارے انسانی حقوق کی بحالی کی جدوجہد کررہے ہیں ان کے ساتھ مل کر اور ان کو بھرپور جانی اور مالی امداد دے کر اس جدوجہد میں شامل کر سکتے ہیں۔ ظالم کا ہاتھ تھامنا اور مظلوم کی مدد کرنا یہ ہمارا قومی شعار ہونا چاہیے اور ایسی ہر جدوجہد کو ہمارا اخلاقی اور عملی تعاون ملنا چاہیے۔ اس طرح ہم ایک بہتر سماج کی تعمیر میں مددگار ہوسکتے ہیں جہاں لوگوں کے انسانی حقوق کا صحیح ڈھنگ سے تحفظ ہوسکے۔ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہونی چاہیے کہ ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ لہٰذا یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ جو کوئی بھی اس کشتی میں سوراخ کرنے کی کوشش کررہا ہے اس کو روکیں ورنہ یہ کشتی ڈوبے گی تو ہم سب ڈوبیں گے۔ ہماری بقا اسی میں ہے کہ ہم کشتی کو سلامت رکھیں اور ایسے لوگوں سے اس کشتی کو بچائیں جو اس کو نقصان پہنچانے کے در پے ہیں۔

■❖■

انسانی حقوق کی صحیح تفہیم کی ضرورت

کسی بھی جدید اور مہذب فرد اور معاشرے کے لیے انسانی حقوق کا صحیح فہم وشعور ضروری ہے، اس کے بغیر انسانی حقوق کی تلفی اور پامالی کو روکنا اور پُرحساس طریقے سے اس کے حصول کی جدوجہد کرنا ممکن نہیں ہے۔ مشہور قول ہے کہ چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے سابق جنرل سکریٹری کوفی عنان نے ایک خوبصورت بات کہی ہے کہ اگر ہم انسان کے ذریعہ کی گئی حق تلفیوں (Human Wrongs) کو سمجھ لیں تو انسانی حقوق (Human Rights) کو سمجھنا آسان ہوجائے گا۔ دراصل انسانی حقوق کا تصور ایک تعلیم یافتہ، باشعور اور مہذب معاشرے میں ہی پروان چڑھ سکتا ہے۔ انسانی حقوق کا سیدھا مطلب ہے کہ ہم ایک شخص کی حیثیت عرفی کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی عزت و آزادی کا احترام کریں گے اور اپنی طرف سے اس کی حق تلفی نہیں کریں گے۔ انسانی سماج میں ہر فرد اور گروہ یکساں حیثیت، قوت اور وسائل نہیں رکھتا ہے، کچھ لوگ زیادہ قوت اور وسائل رکھتے ہیں اور کچھ لوگ کم قوت و وسائل رکھتے ہیں۔ عام طور پر جو لوگ زیادہ قوت و وسائل رکھتے ہیں وہ ان کا استحصال کرتے ہیں جو کمزور ہیں اور یہیں سے انسانی حقوق کی پامالی کا آغاز ہوتا ہے۔ جس ملک اور معاشرے میں قانون کی حکمرانی کے بجائے فرد اور گروہ کی حکمرانی ہوتی ہے، وہاں انسانی حقوق کی پامالی ایک عام بات ہے۔ کچھ لوگ خود کو قانون سے بالاتر

سمجھتے ہیں، اس طرح دوسروں پر زیادتی کرنا اپنا حق اور اختیار مانتے ہیں۔ اس اعتبار سے جمہوریت اپنی تمام تر اندرونی خامیوں کے باوجود ہر طرح کی آمریت اور ڈکٹیٹرشپ سے بہتر ہے۔ حکومت خواہ کوئی ہو اور کہیں کی ہو اس میں یک گونہ جبر کا تصور پایا جاتا ہے۔ لہٰذا جہاں جمہوری قدریں اور ادارے مضبوط ہیں وہاں لوگوں کی عزت و آزادی زیادہ محفوظ ہوتی ہے اور جس جگہ جمہوری قدریں اور ادارے مضبوط نہیں ہیں اور وہاں کی سول سوسائٹی اسٹرونگ نہیں ہے وہاں انسانی حقوق کی پامالی عام بات ہے اور اس کی روک تھام کی کوئی مضبوط میکنزم نہیں ہوتی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ مسلم ممالک میں اس کا شدید فقدان نظر آتا ہے جس کی وجہ سے عالمی برادری میں ان ملکوں کی شبیہ اچھی نہیں ہے۔ ہندوستان کا مسلم معاشرہ بھی جن دقیانوسی روایتوں میں جکڑا ہوا ہے، وہاں بھی انسانی حقوق کی پامالی عام ہے۔ ہم نے عورتوں، بچوں، پسماندہ برادریوں اور غریب اور کمزور لوگوں کے بارے میں جو موقف اپنا رکھا ہے وہ ہمارے جسد اجتماعی پر ایک بدنما داغ ہے، جس کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ ہماری دقت یہ ہے کہ نہ ہم جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو پا رہے ہیں اور نہ صحیح اسلامی اسپرٹ کے ساتھ زندگی گزارنے کے اہل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم خلق اور خدا دونوں کی نظر میں معتوب ہیں۔ جب تک ہم اپنی اور اپنے معاشرے کی اصلاح نہیں کرتے عام انسانی آبادی میں عزت و احترام کے ساتھ زندگی گزارنا دشوار ہوگا۔

اسلام دو چیزوں سے عبارت ہے۔ ایک حقوق اللہ اور دوسرے حقوق العباد۔ حقوق اللہ دین کا دس فیصد اور حقوق العباد دین کا نوے فیصد ہے۔ عباد میں صرف انسان ہی نہیں آتے ہیں بلکہ اس میں پوری کائنات جاندار اور غیر جاندار سب شامل ہیں جو بلا واسطہ اور بالواسطہ انسانی بقا اور ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ لہٰذا ہمیں صرف انسانی حقوق کے بارے میں نہیں بلکہ تمام جاندار فلورا اور فونا کے بارے میں حساس ہونے کی ضرورت ہے اور ان کے تحفظ کی فکر کرنی ہے۔

اسلام چند عقائد اور مراسم عبودیت کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک جامع تصور حیات

ہے جس میں حیات و کائنات کی کوئی چیز ہدایت و رہنمائی سے باہر نہیں ہے۔ لہٰذا جب تک ہم اس کا پورا شعور حاصل نہیں کرتے ہمارے لیے حقوق العباد کی اپنے وسیع تر مفہوم میں حصولیابی ممکن نہیں ہوگی۔ انسانی وجود کے تحفظ اور بقا کے لیے ماحولیات کا تحفظ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی انسانی جان کا۔ کسی انسانی جان کو ناحق نقصان پہنچانا جتنا بڑا ظلم ہے اسی طرح کسی جاندار یا پیڑ پودے کو نقصان پہنچانا غلط ہوگا۔

میں نے اس کتاب میں انسانی حقوق کے تصور کو پوری جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ہندوستان کے مسلم معاشرے میں انسانی حقوق کی جو حق تلفیاں اور پامالیاں ہورہی ہیں اُن پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا ہے نیز مسلمانوں سے یہ توقع کی گئی ہے کہ وہ خیر کو اپنے تک محدود نہ رہنے دیں بلکہ پورے انسانی معاشرے میں اس کو عام کریں۔ ہمارے لیے دنیا میں کوئی غیر نہیں ہے بلکہ سب اپنے ہیں اور سب کی بھلائی ہمارا اجتماعی نصب العین ہے۔

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے

■❖■

مصنف کے بارے میں

ڈاکٹر ابوذر کمال الدین بہار انٹرمیڈیٹ کونسل کے سابق وائس چیئرمین، معاشیات کے اچھے استاد اور بی.آر.اے. بہار یونیورسٹی مظفر پور کے سینئر پرنسپل ہیں، وہ ایک مختلف الجہات شخصیت کے مالک، ایک اسکالر، ایک معروف عوامی شخصیت، ایک اچھے مصنف، اچھے خطیب، ڈبیٹر، مقرر، ایجوکیشنسٹ، انسانیت نواز، سماجی کارکن، سیکولر،ڈیموکریٹ اور قانون کی حکمرانی میں یقین رکھنے والے شخص ہیں۔ بہت ساری تنظیموں، اداروں اورتحریکات سے وابستہ ہیں اور وسیع میدانی تجربات رکھتے ہیں۔

مصنف کی دیگر کتابوں کا تعارف

(1) ''اکیسویں صدی کا چیلنج اور ہندوستانی مسلمان- بند گلی سے آگے کی راہ''

یہ مصنف کی وہ معرکتہ الآراء کتاب ہے جس نے قارئین اور مبصرین سے نہ صرف داد و تحسین حاصل کی ہے بلکہ اسے موجودہ دور میں اس موضوع پر لکھی گئی اردو کی بہترین کتاب تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر آپ گوگل پر اس کتاب پر کمنٹ پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ لوگوں نے اس کی کس قدر پذیرائی کی ہے۔ لہٰذا اگر آپ موجودہ عہد، ہندوستان کے سماجی اور سیاسی حالات، ملت اسلامیہ ہند کے داخلی اور خارجی معاملات و مسائل کو جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں، اس سے نبرد آزما ہونے اور باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈھنا چاہتے ہیں جو اسے ترقی و استحکام کی شاہ راہ پر لانے میں مددگار ہو تو آپ کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

کتاب Amazon یا Flipkart پر آن لائین آرڈر کر کے حاصل کی جاسکتی ہے۔ یا ڈاک سے بھی منگوائی جاسکتی ہے۔ صفحات 517، قیمت: -/500 روپئے۔

(2) زندگی ریٹائرمنٹ کے بعد

(3) سیکولرزم بھارت اور مسلمان

(4) تعمیر ملت کی راہیں

(5) مسلمانوں کی معاشی بہتری کی راہیں

(6) حضرت محمدؐ اور بھارتیہ سماج (ہندی)

(7) اپرادھ کی بڑھتی پرورتی، کارن اورنوارن (ہندی)

(8) ایجوکیشن ویوز اینڈ ویژن (انگریزی)

(9) مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب اوراس کا حل

ان کے علاوہ درج ذیل کتابیں جلد ہی منظر عام پر آرہی ہیں:

(10) اسلام کا پیغام بھارت کے نام (زیرِطبع)
(عصری تناظر میں ایک نظری اور اطلاقی مطالعہ)

(11) ہندوستانی مسلمان عہد بہ عہد- ایک تاریخی مطالعہ (زیرِطبع)

(12) عصرِ حاضر میں انسانی حقوق کا مسئلہ-اسلام اور ہندوستان کا مسلم سماج (زیرِطبع)

(13) Divine Verses (زیرِطبع)

(An easy Introduction of Quran for Young & Common Readers)

All these books will hit the stand very soon. Insha Allah